دِل ٹوٹ کے ہارا تھا



نایاب جیلانی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

نایاب جیلانی

دل ٹوٹ کے ہار اٹھا

بیک گراؤنڈ میں میوزک تیز آواز میں بج رہا تھا۔

بجتے میوزک کے ساتھ اس کی تھرکتی انگلیاں آئی پیڈ پر مسلسل حرکت میں تھی۔ کانوں میں ہیڈ فون لگا تھا اور وہ اپنی بیسٹ فرینڈ ماہم سے باتوں میں مصروف تھی۔ جو پچھلے بہت سارے دنوں سے غائب تھی اور ابراڈ منگنیاں اٹینڈ کرتی پھر رہی تھی۔ فیشن شوز انجوائے کرتی فی الحال واپس نہ آنے کا پتا کرا سے شدید بوریت اور جھلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔ ماہم سے لمبی بات کے دوران بار بار اس کا سیل بلنک کر رہا تھا۔

وہ اچٹتی سی نگاہ موبائل اسکرین پہ ڈالتی اور پھر مزے سے ماہم کو کوئی اور قصہ سنانے لگتی۔

قریب آٹھویں بیل پہ اس نے شدید جھلا کر ماہم سے رابطہ منقطع کیا تھا اور پھر اپنا بجتا سیل اٹھالیا۔ اسکرین پہ فریحہ کالنگ لکھا آرہا تھا۔ اس کی پیشانی پہ سوچ کی لکیر ابھری۔

فریحہ اس کی کلاس فیلو تھی۔ گو کہ فریحہ اور اس کے مزاج میں زمین آسمان جتنا فرق تھا۔ اور یہی فرق اسٹیٹس میں بھی تھا۔ پھر بھی ان کی دوستی ابھی تک چل رہی تھی۔

یونی ورسٹی میں بھی فریحہ ہمیشہ اس پر انحصار کرتی تھی۔ اپنی ہر پرابلم اس کے پاس اٹھا کر لے آتی۔ اور وہ چٹکی بجاتے اس کی پرابلمز سولو کر دیا کرتی تھی۔

یونی ورسٹی کے بعد بھی فریحہ کو جب جب اس کی ضرورت پڑتی۔ وہ اسے ضرور کال کرتی۔ اور اس میں لاکھ نخرہ سہی 'پراوڈی' موڈی سہی لیکن ایک بات طے تھی کہ اس میں "مروت" کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ انکار تو کر ہی نہیں سکتی تھی کچھ بھی ہو جاتا۔ موڈ ہوتا نہ ہوتا۔ ٹائم ہوتا نہ ہوتا۔ وہ مروت ضرور نبھادیتی تھی۔ اور اب بھی فریحہ کو اس سے کچھ ضروری کام تھا۔ جس کی تفصیل بتا رہی تھی۔

"ہما' سمیرا' سعدیہ کو کچھ شاپنگ کرنا ہے۔ اور میں نے بھی جاب کی ٹریٹ دینی تھی۔ وہ کہتی ہیں ٹریٹ نہ دو۔ ایک ایک سوٹ لے دو۔ ذرا بازار تک جانا تھا۔ تم تو جانتی ہو گھر سے خاص پرمیشن نہیں ملتی۔ اور مل بھی جائے تو کنوینس پرابلم اپنی جگہ موجود ہے۔ گاڑیاں دو تو ہیں لیکن وہ باقی لوگوں کے تصرف میں ہیں۔ تم اگر پک کرلو تو۔۔۔ میں کالج میں ہوں۔" فریحہ نے اس قدر لجاجت سے کہا تھا کہ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی اقرار کرنا پڑا تھا۔ گو کہ فریحہ وغیرہ کے ساتھ شاپنگ کا خیال ہی سوہان روح تھا۔ کہاں چھوٹے چھوٹے بازاروں میں دھکے کھاتا۔ خوار ہوتا۔ اور گرمی بھی ایسی قیامت کے حد نہیں۔

لیکن وہی اس کی ازلی مروت۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اپنی شاندار سوک میں فریحہ وغیرہ کو پک کر رہی تھی۔ اور جب جگہ جگہ دھکے کھا کے وہ لوگ رحمان پلازہ پہنچیں تب اسے شدت سے خیال گزرا تھا کہ زندگی میں پہلے کیوں نہیں وہ اس جگہ پہ آسکی۔ اس دن کے بعد کئی لوگوں نے اسے رحمان پلازہ کے آس پاس دیکھا تھا۔ اور وہ چشم دید گواہ بھی تھے۔



یہ ایک خوب صورت سہ پہر کا منظر تھا۔

سفید بادلوں کے ننھے گولے گول گول چکر لگا رہے تھے۔ درختوں کی اونچی شاخوں سے کچھ اوپر ابابیلوں کا پورا غول پھدکتا اور اڑ اڑ کر کرتب دکھا رہا تھا۔

ایک قطار میں رکھے سرخ گملوں میں گیندے کے پیلے پھول اتنے حسین لگ رہے تھے کہ دل چاہتا سارے توڑ کر جھولی میں بھر لے۔

لیکن فریحہ کی امی سے خائف وہ پھولوں کو نگاہ بھر کے بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔

یہ ایک نگاہوں کو تراوٹ دیتا انتہائی دلنشین منظر تھا۔ اور اس گھر میں پورے استحقاق سے چلنا پھرنا ایک خوب صورت اور خواب آگیں سپنے کا آدھا حصہ۔

یوں لگتا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی سہانے سپنوں کی مالا ٹوٹ کر بکھر جائے گی۔ اسی خوف کے زیر اثر وہ پلکوں کو پورا کھولتی ہی نہیں تھی۔

کیا یہ خواب تھا؟ خیال تھا؟ یا گمان تھا؟

اسے یقین نہیں آتا تھا۔ اور اسے یقین آتا ہی



نہیں تھا۔ اس گھر میں قدم رکھنے تک وہ ایک خواب کے سفر میں رہی تھی۔ ایک لمبا حسین اور پر لطف خواب کا سفر۔

ایک تازہ پھولوں سے بھرا بھرا سجا سجا سارا راستہ اور من پسند ہم سفر۔ جی چاہتا آنکھیں بند کر کے چلتی رہے۔ چلتی رہے۔ کہیں رکے نہیں۔

لیکن ہوا کیا؟ خواب کا وہ لمبا سفر اک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔

گیندے کے پھولوں کی مالا ایسی بکھری کہ ریزہ ریزہ ہوتی چلی گئی۔

بہت اچھا' بہت حسین سفر کا گمان کرنے والی کو اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ پیروں تلے پھولوں کی پتیاں نہیں نوکیلے کانچ کے ٹکڑوں کی روا بچھی ہے۔ وہ تو جانتی ہی نہیں تھی۔



فون کب کا بند ہو چکا تھا۔ اسے بند ہونا ہی تھا۔ اور جس تواتر سے فون آرہے تھے۔ کوئی چونکتا یا نہ چونکتا وہ خود چوکنا ہو گئی تھی۔

پہلے تو اس رفتار سے کبھی اس نے کالز نہیں کی تھیں۔ نہ وہ ایسی گہری محبت میں مبتلا تھی جو دن میں کئی کئی بار کال کر کے اس کا احوال پوچھتی۔

اور اس کا غائبانہ سا انداز وہ کہتی کچھ تھی۔ اور جواب کوئی اور سمجھتی۔

وہ اتنی غائب دماغ کبھی بھی نہیں تھی۔ کبھی بھی نہیں۔

اور آج کی کال میں اس نے ایک بڑی حیران کن بات کی تھی۔ اتنی حیران کن کہ اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔ اس کے اعصاب مفلوج ہو گئے تھے۔ پھر اس کا اصرار۔ ضد' اور آخر میں التجائیں۔

"پلیز مان جاؤ نا۔ مجھے نیا موبائل لینا ہے تم ساتھ ہو گی۔ تو اچھا تاثر رہے گا۔ مجھے بھی تسلی ہو گی۔ پلیز مان جاؤ فریحہ!" اس کی منتوں میں ایسی عاجزی تو کبھی نہیں رہی تھی۔ بس ہاتھ جوڑنے کی کسر باقی رہ گئی

تھی۔ اور فریحہ کا دماغ تو سنگ سنگ کر سن ہو رہا تھا۔ سوچ سوچ کر تھک رہا تھا۔

"تم وہاں سے موبائل لینا چاہتی ہو؟ کیوں؟ پہلے تو تمہاری شاپنگ دبئی سے ہوتی ہے۔ تم نے تو یہاں کی کبھی لپ اسٹک استعمال نہیں کی۔ کجا کہ موبائل۔"

فریحہ کو نجانے اور بھی کیا کچھ یاد آگیا تھا۔ اور اس نے بے ساختہ بیچ میں اس کا فقرہ کاٹ دیا۔

"مجھے وہیں سے لینا ہے پلیز! تمہارے تایا کی شاپ ہے۔ تم ساتھ چلو گی' بس ڈن ہوا۔ میرے لیے اتنا سا کام نہیں کر سکتیں؟" اب وہ جذباتی حربوں سے اسے زیر کر رہی تھی۔ مرتا کیا نہ کرتا' اس نے جانے کس دل سے حامی بھری تھی۔ اسے حامی بھرنی ہی تھی۔ کیونکہ تقدیر یہی چاہتی تھی۔ جو اچانک آسمان سے اترتے اور نصیب کے فاصلوں کا سبب بن جاتے۔ اس نے فون رکھا اور بے دم ہو گئی۔ جو اس کا دل اشارے دے رہا تھا۔ جن وسوسوں کو اس کی سانسیں محسوس کر رہی تھیں۔ کیا وہ سب درست تھا؟

اس نے دل کی آواز پہ کان لگائے اور ساکت ہو گئی۔ اس کا کوئی بھی خدشہ بے بنیاد نہیں تھا۔



فائیو اسٹار ہوٹل کا اندرونی ماحول خاصا سحر انگیز اور پرسکون تھا۔ بیک گراؤنڈ میں کہیں۔ دھیما میوزک اس سحر طرازی میں اضافہ کر رہا تھا۔

ہوٹل کے اندر باہر کی نسبت خاصی چہل پہل تھی۔

اس وقت یقیناً" رحمان پلازہ میں انتہا کا رش تھا۔

اس کے باوجود ماہ رو کی فرینڈز بھری دوپہر میں اسے گھسیٹ کر رحمان پلازہ کی طرف لے جانا چاہتی تھیں۔ اور وہ۔ جو انہیں اپنی ذاتی کار میں برج اور جزیشن زدن لے کر آئی تھی۔ اس وقت سخت پچھتا رہی تھی۔

کیونکہ برج میں فکس ریٹس اور ایک ہی دام واحد کلام کی صورت حال نے اس کی تمام فرینڈز کو سانپ سونگھا دیا تھا۔ وہ کچھری بازار اور اچھرے سے شاپنگ

کرنے والیاں کہاں ''برج'' کی چمک دمک کو جھیل سکی تھیں۔ ان چاروں کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ اور چہرے حواس باختہ ہو چکے تھے۔ اور جیسے ہی وہ ایئر کنڈیشنڈ ہال سے باہر نکلیں ماہ رو ان سب پر برس پڑی تھی۔

''کوئی ایسے بھی شرمندہ کرواتا ہے؟ ایک ایک چیز کو چھو کر' ٹیگ دیکھ کر' چھان پھٹک کے خالی ہاتھ واپس چلے آنا۔'' ماہ رو کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ تب اس کی دوست فریحہ نے دبے دبے الفاظ میں سمجھایا۔

''یار! ان سب کی جیب اتنی لمبی چوڑی قیمتوں تک رسائی نہیں کر سکتی۔'' فریحہ نے اسے کول ڈاؤن کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ وہ ڈیزائنر گلاسز آنکھوں پہ چڑھاتی آگے بڑھ گئی تھی۔ اور اسے اب کی دفعہ فائیو اسٹار کی بلڈنگ کے قریب جاتے دیکھ کر وہ ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے کا منہ دیکھتی رہ گئی تھیں۔

پھر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق انہیں ماہ رو کے پیچھے آنا ہی پڑا۔ گو کہ وہ سب پہلی مرتبہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں آئی تھیں تاہم خوامخواہ کنفیوز ہو کر ماہ رو کا غصہ بڑھانا نہیں چاہتی تھیں۔

اور دوسری جانب ماہ رو دل ہی دل میں خوب پیچ و تاب کھا رہی تھی۔

''ان بونگی پینڈوؤں کے ساتھ آنے کی ضرورت کیا تھی؟ سارا امیج خراب کر کے رکھ دیا ہے۔ ایک تو اتنی بڑی بڑی چادروں کی بکل مار رکھی ہے۔ اوپر سے شکل بھی یتیموں جیسی۔'' ماہ رو دل ہی دل میں انہیں برا بھلا کہتی مینو کارڈ اٹھا کر آرڈر سوچ رہی تھی۔ جبکہ مودب سا ویٹر گاہے بگاہے چور نگاہوں سے ماہ رو کے حسین دلنشین چہرے کو ضرور دیکھ لیتا تھا۔ اور یہ کوئی نئی بات تو نہیں تھی۔ ماہ رو کے ساتھ جب جب اور جہاں جہاں جانے کا اتفاق ہوا تھا وہاں کم و بیش ایسی ہی صورت حال دکھائی دی تھی۔

جہاں ماہ رو ہوتی تھی وہاں کوئی بھی دوسرا پس منظر میں چلا جاتا تھا۔

فریحہ کو ماہ رو کے ساتھ قریب دس سال ہو چکے تھے۔

انہوں نے ایک اسکول اور ایک کالج میں پڑھا تھا۔ یونیورسٹی سے ایم۔ ایس۔ سی کی ڈگری لے کر ماہ رو تو کچھ عرصہ ابراڈ بھی رہ آئی تھی تاہم فریحہ نے ایک مقامی پرائیویٹ کالج میں جاب کر لی۔

یہ اس مہینے کی پہلی تاریخ تھی اور فریحہ کو پہلی پہلی تنخواہ مل رہی تھی۔ سو وہ اپنی یونیورسٹی فیلوز کو ٹریٹ کے بہانے باہر لے آئی۔ ارادہ تھا کہ سب کو لان کا ایک ایک سوٹ لے دے گی۔ اور باقی سعدیہ' ہما اور سمیرا نے گرما کی شاپنگ بھی کرنی تھی۔

چونکہ ماہ رو کا فریحہ سے یونیورسٹی کے بعد زیادہ رابطہ رہا تھا سو جب بھی موقع ملتا وہ خود فریحہ سے ملنے آجاتی تھی۔ فریحہ کے علاوہ ان کی ایک اور دوست ماہم بھی تھی۔ ماہم بھی ماہ رو کی طرح اپر کلاس سے تھی لیکن ماہم کو یونی فیلوز سے میل جول پسند نہیں تھا۔ ویسے بھی آج کل وہ دبئی کی فیشن شو کی تقریب میں گئی ہوئی تھی۔ ماہم کے بعد ماہ رو پہ بوریت سوار ہوئی تو اسے فریحہ سے ملنے کا خیال آگیا تھا۔ گو کہ فریحہ اور ماہ رو کا مزاج قطعاً'' میل نہیں کھاتا تھا پھر بھی یہ دوستی کی گاڑی چل ہی رہی تھی۔ اس میں کچھ کمال ماہ رو کا بھی تھا۔ اپنے ہزار نخرے' حسن اور دولت پہ ناز ہونے کے باوجود ماہم کے ہزار مرتبہ کہنے' بھڑکانے اور ضد کرنے پر بھی فریحہ سے تعلق نہیں توڑ سکتی تھی۔

شاید اس لیے بھی کہ فریحہ کے ساتھ چلنے میں ماہ رو کے کسی جذبے کی تسکین ہوتی تھی اور اس وقت ویٹر کی نگاہوں میں ایک ستائش بڑھتی دیکھ کر فریحہ کو اسے ٹھوکا دینا ہی پڑا تھا۔ اور وہ جو دل ہی دل میں ماہم کو یاد کر رہی تھی۔ لحہ بھر کے لیے چونک گئی۔

''ماہ رو! جلدی کرو۔ ہمیں گھر بھی جانا ہے۔'' فریحہ نے باقی تینوں کے دل کی آواز بھی اس کے کانوں تک پہنچائی تھی۔ ماہ رو کو سنبھلنا ہی پڑا۔ پھر اس نے کڑی نگاہ سے ویٹر کو گھور کر آرڈر دیا تو سب کی جان میں جیسے جان آگئی تھی۔ اور ادھر فریحہ کو ایسے ہی ہول نہیں پڑ رہے تھے۔

فائیو اسٹار کی پچھلی جانب مشہور معروف رحمان پلازہ اس کے تایا اور ابا کی ذاتی ملکیت میں تھا۔ وہ خود تو ابا کی اکلوتی اولاد تھی تاہم تایا کے چھ کڑیل جوان بیٹے اسے ابا سے زیادہ اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے اور اس طرح تن تنہا اس کے خاندان کی کسی لڑکی کو بازار جانے کی اجازت تک نہیں تھی کجا کے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں بیٹھ کر لنچ کرنا۔ فریحہ کو ایئر کنڈیشنڈ ماحول میں پسینے آرہے تھے اور وہ دعا کر رہی تھی کہ کسی تایا زاد کی نگاہ کے "گھیر" میں نہ آجائے۔ کیونکہ کبھی کبھار گھر سے لنچ منگوانے کی بجائے وہ لوگ اسی ہوٹل سے کھانا منگوا کر کھالیا کرتے تھے۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو قیامت آجانے کا خطرہ تھا۔

ویسے بھی فریحہ خاندان کی پہلی لڑکی تھی جس نے مخلوط تعلیمی ادارے میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ورنہ تو باقی سب ڈگری کالج برائے خواتین سے ہی پڑھ لکھ کر شادی شدہ ہو جاتیں۔ سوائے فریحہ کے کوئی جاب بھی نہیں کرتی تھی۔ کیونکہ تایا اور ابا کو پسند نہیں تھا۔ ویسے بھی گھر میں خوش حالی تھی۔ تایا اور ابا کا کلاتھ ڈپو تھا۔ گارمنٹس کی دکان تھی۔ ہوزری کا ہول سیل کا کاروبار تھا۔ کاسمیٹکس' الیکٹرونکس اور کراکری میں ہر قسم کی ورائٹی رحمان پلازہ میں موجود تھی۔

سارا کاروبار تایا' ابا اور تایا کے چھ بیٹے سنبھال رہے تھے۔ عورتیں گھروں تک محدود تھیں اور خوش و خرم زندگی گزار رہی تھیں۔ بظاہر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ پھر بھی فریحہ کو اپنی حدود و قیود کا بڑا خیال رہتا تھا۔

اور وہ جانتی تھی کہ کون سی بات اس کے خاندان میں مردوں کو بری لگتی ہے۔ اس کا دل بھی سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ جبکہ فریحہ کے خوف سے انجان اس کی باقی دوستیں کھانے پہ اس طرح سے ٹوٹ رہی تھیں۔ جیسے زندگی میں پہلی مرتبہ اچھا کھانا دیکھنا نصیب ہوا تھا۔

اور شاید ماہ رو کے تاثرات بھی کچھ ایسے تھے۔ اسی لیے ماہ رو نے کھانے سے جلدی ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ پھر اپنی باقی دوستوں کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

"کھانے کے بعد ایک چکر رحمان پلازہ کا لگالیں گے۔ دیکھو' بار بار بازار آنا ممکن نہیں۔ پھر ماہ رو بھی کبھی کبھار ملتی ہے۔ آج تو ماہ رو کی کار میں سامان رکھ کر با آسانی گھر چلے جائیں گے پھر تو رکشوں میں خوار ہونا پڑے گا۔" سمیرا نے اپنے تئیں بڑی فائدہ مند بات کی تھی۔ باقیوں نے بھی اتفاق کر لیا تھا۔ ماہ رو گو کہ شکل سے اب بے زار لگ رہی تھی پھر بھی کچھ نہ کچھ مروت دکھا دیتی تھی۔ پھر فریحہ تو چاہتی تھی کہ ماہ رو آج تو مروت نہ ہی دکھائے۔ اور انہیں اٹھا کر کار میں ٹھونس دے۔ کیونکہ وہ جلد از جلد گھر جانا چاہتی تھی۔ رہا گفٹس کا سوال تو فریحہ ابا سے کہتی تو وہ اعلا سے اعلا کپڑا گھر میں اٹھا کر لے آتے۔ بازار آنے کی ضرورت کبھی نہ پڑتی۔ لیکن یہ ماہ رو بھی نا۔ اگر وہ زبردستی فریحہ کو نہ گھسیٹتی تو فریحہ ان باقیوں کو آرام سے انکار کر سکتی تھی۔ اور اب ماہ رو کے ساتھ آکر فریحہ سخت پچھتا رہی تھی۔ کیونکہ ماہ رو نے سمیرا اور ہما کی بات نہ صرف مان لی تھی بلکہ بل پے کر کے اٹھ بھی گئی۔ لیکن اٹھتے ہوئے اس نے وارننگ ضرور دی تھی۔

"اب زیادہ دیر کی تو سر پھاڑ دوں گی۔ بارگیننگ مجھے سخت بری لگتی ہے۔ اس لیے تو میں ایسی عام دکانوں پہ جاتی نہیں۔ تم لوگوں کی خاطر اس بھری دوپہر میں دکان داروں اور کسٹمرز کی بک بک سننا پڑے گی۔" اس نے احسان جتاتے ہوئے اپنا قیمتی پرس ہاتھ میں پکڑا اور برائے نام دوپٹے کو گلے میں برابر کرتی اٹھ گئی تھی۔ اس کے خوب صورت دودھیا بازو آنکھوں میں روشنی سے بھر رہے تھے۔ آستینیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ یوں شرٹ کے نیچے ٹائٹس پہن رکھی تھی۔ اور اپنے کھلے حسین لمبے بالوں کو اونچی پونی میں سمیٹ کر وہ رحمان پلازہ میں جانے کے لیے تیار تھی۔

رحمان پلازہ میں ماہ رو جیسی الٹرا ماڈ قسم کی مخلوق کا جانا نہ ہونے کے برابر تھا۔ اور اگر ابا' تایا نے دیکھ لیا۔ دیکھ تو انہوں نے لینا ہی تھا۔ فریحہ کو جیسے پھر سے ہول پڑنے لگے تھے۔

وہ سن ہوتے دماغ کے ساتھ چل رہی تھی۔ ایسے

ہی ہوٹل سے نکلتے ہوئے فریحہ کو لگا تھا کہ کوئی اسے بہت غور سے دیکھ رہا ہے۔ حالانکہ دیکھنے کی چیز تو ماہ رو تھی۔ اور لوگ مڑ مڑ کر ماہ رو کو دیکھ بھی رہے تھے۔ پھر یہ چبتی چبتی سی آنکھیں کسی کی تھیں؟ کون تھا جو غصے بھری آنکھوں سے دیکھ رہا تھا؟ اس کا دل گھبرا گیا وہ دل میں اور بھی خوف بھرے ماہ رو کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

سعدیہ' ہما اور سمیرا تو مناسب قیمتوں پہ کمپرومائز کر کے ایک ایک بیگ' پرس' بچوں کی جوتیاں' اسٹیشنری وغیرہ خرید چکی تھیں۔

اب انہیں اس حصے کی طرف جانا تھا جہاں کلاتھ ڈپو کی پورے شہر سے زیادہ اچھی اور سستی ورائٹی ملتی تھی۔ وہاں ۔ کاؤنٹر پہ ہی تایا دکھائی دے گئے تھے۔ شاید ابھی ابھی نماز ظہر ادا کی تھی۔ ہاتھ میں تسبیح تھی۔ یقیناً" کاروبار میں خیروبرکت کی دعا اور کوئی وظیفہ پڑھ رہے تھے۔

ان سے کچھ فاصلے پر ابا بھی گاہکوں سے نبٹ رہے تھے۔

کلاتھ ڈپو کی طرف تایا زاد کم کم ہی آتے تھے۔ فی الحال تو کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ زیادہ تر اوپر ہوتے۔ جہاں پہ الیکٹرونکس کا انتہائی اعلا سامان' موبائل ایجنسی' اور لیپ ٹاپ کمپیوٹر وغیرہ ملتے تھے۔ فریحہ نے دل ہی دل میں شکریہ ادا کیا۔ اور ایک چور نگاہ ماہ رو پہ ڈالی تھی۔ وہ انتہائی بے زار کھڑی تھی۔ اور سمیرا' ہما کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہی تھی جو سیل بوائز سے بھاؤ تاؤ میں مصروف تھیں۔

معاً" ابا اور تایا نے چہرہ چھپائے کھڑی فریحہ کو دیکھ لیا۔ دونوں پہلے تو بہت حیران ہوئے تھے پھر پہچانتے ہوئے قریب آگئے۔ دونوں کے چہروں کا استعجاب فریحہ کو سخت شرمندہ کر رہا تھا۔

"فریحہ بیٹا! تم یہاں؟ خیریت تو ہے؟ کیوں آئی ہو؟ کچھ چاہیے تھا تو فون کر دیتیں۔" تایا نے ہی گفتگو میں پہل کی تھی۔ ان کا انداز نرم تھا۔ فریحہ کو ڈھارس سی پہنچی تھی۔ دل میں سکون سا اترا تھا۔ تایا اور ابا کے تاثرات نرم تھے۔ اور ابھی وہ اپنے آنے کی تفصیل بتانا چاہتی تھی کہ اچانک سے مردانہ آواز ابھری تھی۔ فریحہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔ سینے میں یوں دھماکا ہوا جیسے کوئی بم پھٹا ہو۔ خوف کے مارے اسے جھرجھری آگئی تھی۔ اس کے پیچھے عباس کھڑا تھا۔ عون عباس۔ فریحہ کا حلق تک سوکھ گیا تھا۔

"فون پہ بتادیتی تو ہوٹلنگ کا لطف کیسے لیا جاتا۔؟"

اس کا انداز بہت سخت اور آواز بے انتہا مدہم تھی۔ یوں کہ تایا اور ابا نے تو سن لیا تاہم فاصلے پر موجود ماہ رو کچھ محروم رہ گئی تھی۔ لیکن اتنا تو وہ جان رہی تھی کہ آنے والے اس نوجوان نے فریحہ پر غصہ کیا ہے۔ اس نے کیا کہا تھا۔ یہ ماہ رو نہیں سن سکتی تھی۔ کیونکہ آنے والے جوان کی پرسنالٹی اور وجاہت دیکھ کر اس کی حسین آنکھوں میں تحیر در آیا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک اور اس نوجوان سے ملتے نقوش والا جوان بھی پہنچ گیا۔ جس نے فریحہ کی وکالت کی تھی۔ اور اسے ڈانٹ سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ ماہ رو کا تو سانس رک گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ الجھن بھی بھری۔ یہ چہرہ کچھ دیکھا بھالا لگتا تھا۔

"کیا دکان دار اتنے خوب صورت ہوتے ہیں؟" ماہ رو کے لب بے آواز پھڑپھڑائے تھے۔ وہ ساکت آنکھوں سے دیکھتی رہی تھی۔ اس کی سماعتیں جیسے بہری ہو رہی تھیں۔ حالانکہ آوازیں اب نسبتاً" بلند تھیں۔ اور فریحہ خفا خفا انداز میں وضاحت دے رہی تھی۔

"میری دوستوں کو ڈسکاؤنٹ پہ کپڑا چاہیے تھا۔ اس لیے ساتھ آئی ہوں۔ مجھے یہاں آنے کا کچھ شوق نہیں تھا۔" فریحہ کی وضاحت پہ تایا اور ابا نے عباس نامی جوان کو ڈپٹ کر چپ کروا دیا تھا۔ جو کہ فریحہ کو کچھ اور سخت سست سنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ باپ اور چچا کے کچھ بولنے پر وہ خاموش ہو کر پلٹ گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی جیسے سارے منظر پھیکے پڑ گئے تھے۔ کچھ دیر پہلے تک ہال میں بھانت بھانت کا شور تھا جو عون عباس کے آتے ہی پس منظر میں چلا گیا تھا۔ یوں لگا' جیسے وقت کی نبض تھم گئی تھی۔ اس کی رنگت غیر معمولی

حد تک سرخ ہو چکی تھی۔ نرم دودھیا رخسار گیلے اور نم تھے۔ قطرہ قطرہ پسینہ جیسے پھسل رہا تھا۔

اس کی طرف دیکھتے ہوئے جیسے ہی فریحہ نے تایا اور ابا کو متوجہ کیا گویا وہ اس کا تعارف کروا رہی تھی۔ معاً وہ کچھ چونک سی گئی۔ ابا اور تایا نے آگے بڑھ کر ماہ رو کو خود سر پیار سے ہاتھ رکھا تھا۔ جبکہ ماہ رو کسی چینی کے بے سانس مجسمے کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ اتنی ساکت کے تایا اور ابا کے پیار کرنے پر بھی چونکی نہیں تھی۔

فریحہ کو اس کا انداز بڑا غیر معمولی اور عجیب لگا تھا۔ جبکہ ابا اور تایا کچھ متفکر ہو گئے تھے۔

"فریحہ بیٹا! تمہاری دوست کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" ان کی پریشانی اور تفکر کو دیکھ کر شاید ماہ رو بھی کچھ سنبھل گئی تھی۔ پھر فریحہ اور سمیرا بھی متوجہ ہو گئی تھیں۔ ماہ رو کی طرف دیکھا اور آرام سے بولیں۔

"انکل! ماہ رو بڑی نازک مزاج ہے۔ اتنی گرمی برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ تو ہمارے لیے خوار ہو رہی ہے۔ ورنہ اب تک جا چکی ہوتی۔"

"ارے یہ تو ہے۔" ابا اور تایا نے ایسے سہلایا گویا واقعی جانتے تھے کہ ماہ رو گرمی کی شدت برداشت نہیں کر پا رہی۔ اور یہ جو اتنا ہجوم تھا؟ عورتیں ' بچے ' خواتین 'لڑکیاں 'بوڑھیاں یہ بھی تو۔؟ لیکن یہ سب ماہ رو جیسی تو نہیں تھیں نا۔ ماہ رو تو ان سب میں الگ اور ممتاز نظر آ رہی تھی۔ بہت مختلف اور بہت منفرد۔ نہایت دلنشین ' خوب صورت اور نازک اندام۔ جو گرمی جیسی تکلیف کو بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اور ماہ رو کی کیفیات یکسر الگ تھیں۔ وہ اختیار رکھتی تو عمر بھر یہیں کھڑی رہتی۔ کبھی پلٹتی نا۔ عمر بھر کے لیے اسی موڑ پر کھڑی رہتی۔

ادھر فریحہ کے تایا اور ابا ان کے لیے جوس وغیرہ منگوا رہے تھے۔ اور ماہ رو کی خرابی طبیعت کو دیکھ کر چاہ رہے تھے کہ وہ اوپر آفس میں چلی جائیں۔ وہاں اے سی لگا ہوا تھا۔ اور آرام سے وہاں بیٹھ کر جوس پی لیں۔

لیکن یہاں سعدیہ اور ہما نے ٹانگ اڑا لی تھی۔ انہیں گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ چونکہ بارعایت شاپنگ تمام ہو چکی تھی۔ سو انہیں گھر میں موجود اپنے بچوں کا خیال ستا رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ماہ رو کو ان سب کی پیروی کرنا پڑی تھی۔

پھر پورا راستہ وہ ایسے ہی گم صم اور خاموش رہی۔ گو کہ وہ اپنے دل کے خالی پن کو اور اپنی اندرونی طور پر ہونے والی تمام تبدیلیوں کو سمجھ رہی تھی۔ پھر بھی دل پہ ہونے والی یہ اچانک واردات ایسی معمولی نہیں تھی جو وہ اپنے تاثرات باقی سب سے چھپا سکتی۔

سعدیہ ' ہما وغیرہ کو ان کے اسٹاپ اور گھروں کے قریب ڈراپ کرنے کے بعد جب فریحہ کی باری آئی تو فریحہ نے خود ہی شائستگی سے ماہ رو کو مخاطب کر لیا۔

"مجھے بھی اسٹاپ پر اتار دو۔ میرا گھر قریب ہے۔ پیدل ہی چلی جاؤں گی۔" فریحہ کے الفاظ پہ ماہ رو ذرا چونک گئی تھی۔ پھر اس نے جیسے خود کو سنبھال کر نرمی سے کہا۔

"میں تمہیں گھر تک ڈراپ کروں گی۔ اس اسٹاپ تک تو تمہیں کئی مرتبہ چھوڑ چکی ہوں۔ ویسے اتنی پرانی دوستی کے باوجود ہم لوگ کبھی ایک دوسرے کے گھر نہیں آئی ہیں۔ کتنی حیران کن بات ہے۔ تم نے بھی مجھے کبھی بلایا نہیں۔" ماہ رو نے بلاارادہ ہی شکوہ کر دیا تھا۔ اس کے شکوے پہ فریحہ چونک گئی تھی۔ پھر جیسے جتلا کر بولی۔

"کیوں نہیں بلایا۔ میں نے قاسم اور عاصم بھائی کی شادی پہ بھی تمہیں انوائٹ کیا تھا۔ کائنات کی سالگرہ پہ بھی۔ عاصم بھائی کے بیٹے کا عقیقہ کیا تب بھی تمہیں انوائٹ کیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ تم اسٹاپ تک اکثر ڈراپ کر دیتی تھیں مگر گھر پہ کبھی نہیں آئی۔" فریحہ کے صاف الفاظ میں جتلانے پہ ماہ رو کچھ جزبز ضرور ہو گئی تھی۔ اسے واقعی وہ تمام مواقع یاد آ چکے تھے جب فریحہ نے اسے اپنے گھر میں آنے کی دعوت دی تھی۔ تاہم ہر دفعہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ماہ رو دوسرے سے غائب ہو جاتی تھی۔ کیونکہ بقول ماہم کے وہ ایسے بے

کار اور پینڈو فنکشن میں شریک ہو کر اپنا وقت ضائع نہ ہی کرے تو بہتر تھا۔ اور آج ماہ رو کو وہ سارے اچھے مواقع کھو دینے پہ دکھ اور افسوس ہو رہا تھا۔ ماہ رو کے اندر ڈھیر سارا زیاں اتر آیا تھا۔ رہ رہ کر وہی دلنشین منظر نگاہوں کے پار اتر جاتا۔

وہی خوب صورت آواز اور مغرور نقوش والا شاندار ساعون عباس۔ ایک معمولی ساہو کار 'دکان دار' جس کی ایک جھلک نے ماہ رو کو زمان و مکان بھلا دیئے تھے۔ اور آج وہ زبردستی فریحہ کو اس کے گھر ڈراپ کرنے جارہی تھی۔ اور شاید فریحہ اس کی تمام اندرونی کیفیات سے یکسر انجان تھی۔ تب ہی وہ ماہ رو کو گھر لے جانے پہ بے ساختہ خوش ہو گئی۔

"دیکھنا کائنات ثنا اور مریم بھابھی تمہیں دیکھ کر مسحور ہو جائیں گی۔ تمہارے حسن کی میں نے بہت تعریفیں کر رکھی ہیں۔" فریحہ کے سادگی بھرے الفاظ نے ماہ رو کو ہفت اقلیم جیسی دولت سے نواز دیا تھا۔ تو گویا فریحہ کے گھر میں اس کا غائبانہ تعارف ہو چکا تھا۔ وہاں ماہ رو اجنبی یا انجان خود کو نہیں سمجھے گی۔ اور فریحہ کے سفید ماربل سے سجے بڑے سے گھر کی بے انتہا راہداریوں میں چلتے ہوئے ماہ رو کو اندازہ ہو گیا تھا کہ فریحہ نے جو کہا تھا بالکل درست کہا تھا۔

ماہ رو کا وہاں غائبانہ ذکر ایک ہزار مرتبہ ہو چکا تھا۔ فریحہ کی بھابھیاں اور کائنات (تایا کی اکلوتی بیٹی) تو ماہ رو سے ایسے چپک کر بیٹھ گئی تھی جیسے عمر بھر ساتھ ہی رہنے کا پروگرام بنالیا تھا۔ وہ ماہ رو کو چھو چھو کر دیکھتی اور حیران ہوتی۔

"اللہ' ماہ رو آپی آپ کس قدر حسین ہیں۔ فریحہ آپی بالکل جھوٹ نہیں کہتی تھیں۔ آپ اپنی تصویروں سے زیادہ حسین ہیں۔" کائنات کے یہ الفاظ ماہ رو کو ہواؤں میں اڑا رہے تھے۔ وہ کسی شہزادی کی طرح ان سب کے درمیان بیٹھی تھی۔ فریحہ کی امی اور تائی بھی بہت مہربان خواتین تھیں۔ انہوں نے بھی ماہ رو کو ملکاؤں جیسا پروٹوکول دیا تھا۔ اور جاتے سمے فریحہ کی تائی نے اسے بہت نفیس جوڑا دیا۔ یہ جوڑا ماہ رو کو کسی ڈیزائنر کے جوڑے سے بھی زیادہ قیمتی اور نفیس لگا تھا۔ پھر ان سب کے پیار نے ماہ رو کے اندر کڑی تنہائی اور اکیلے پن کو اکھاڑ پھینکا تھا۔ وہ اپنا دل تو فریحہ کی تائی کے لخت جگر کو دے آئی تھی۔ اپنی روح بھی "رحمان منزل" کی راہداریوں میں ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئی۔ کیونکہ ماہ رو سرفراز کو ایک معمولی دکان دار کے بیٹے سے محبت ہو گئی تھی۔



فریحہ کا تعلق گو کہ ایک خوش حال گھرانے سے تھا۔ جہاں تنگی یا رزق کی کمی کبھی دکھائی نہیں دی تھی۔ تایا رحمان اور اس کے ابا کا اکٹھا کاروبار تھا۔ جو اب تایا کے بیٹوں نے سنبھال رکھا تھا۔ ابا اور تایا بھی برابر ان کا ساتھ دیتے تھے۔

رحمان پلازہ میں ان کی چلتی دکان داری سے کبھی تنگی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ پھر ان کا خاندان مشترکہ نظام کے تحت چل رہا تھا۔ جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت وہ بخوشی ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ ایسا گھرانہ تھا جہاں روایات 'اقدار اور جذبات کی قدر کرنے والے بہت تھے۔ سو اسی پیمانے پر ان سب کی تربیت کی گئی تھی۔

تایا رحمان کے چھ بیٹے تھے۔ عاصم 'قاسم کی دو سال پہلے شادیاں ہو چکی تھیں۔ خوش قسمتی سے دونوں کی بیویاں بھی بہت اچھی تھیں۔ سو گھر کا ماحول ہمیشہ سازگار رہتا تھا۔

عاصم اور قاسم کے بعد عون اور عاشر تھے۔ پھر عامر اور یاسر تھے۔ جو کالج میں زیر تعلیم تھے۔ کائنات سب سے چھوٹی تھی اور حال ہی میں اس کا بھی سپیریئر کالج میں داخلہ ہوا تھا۔

فریحہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اور بچپن سے ہی تایا رحمان نے اسے اپنی بیٹی بنالیا تھا۔ چونکہ ابا کی کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی اس لیے فریحہ کو ہمیشہ اس گھر میں رہنا تھا۔ سو' فریحہ کے والدین اپنی اکلوتی بیٹی کے مستقبل کے لیے قطعاً" پریشان نہیں تھے۔

ایک ماہ پہلے اس نے گھر میں اپنی جاب کا شوشا چھوڑا تب کوئی بھی اس کی نوکری کے حق میں نہیں تھا۔ لیکن تایا اس کی خواہش جان کر محض اس شرط پہ راضی ہوئے تھے کہ شادی سے پہلے وہ اپنا شوق پورا کر سکتی ہے۔ کیونکہ دو تین مہینے کے اندر اندر فریحہ کی شادی بھی متوقع تھی۔

اس کی جاب پہ سب سے زیادہ مخالفت عون عباس نے کی تھی۔ بلکہ وہ تو پورا ہفتہ اس بات پہ ناراض بھی رہا تھا۔ اپنے تمام تر اکھڑ مزاج' رویے اور غصہ ور ہونے کے باوجود اس گھر میں اگر فریحہ کی کسی کے ساتھ دوستی تھی تو وہ صرف اور صرف عون عباس ہی تھا۔ دوستانہ بے تکلفی کے باوجود فریحہ عون سے کچھ کچھ ڈرتی بھی تھی۔ جیسے ہی وہ کسی بات پہ اڑ جاتا فریحہ خود بخود ہتھیار پھینک دیتی تھی۔

گھر میں فریحہ پہ سب سے زیادہ روک ٹوک بھی عون ہی کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ماہ رو سے بہت پرانی دوستی کے باوجود فریحہ کبھی اس کے گھر نہیں گئی تھی۔ ایک تو ماہ رو کا اسٹیٹس میچ نہیں کرتا تھا پھر وہ آزاد ماحول کی باسی تھی۔ شاید کوئی بھی فریحہ کو ماہ رو کے گھر جانے کی اجازت نہ دیتا۔ لیکن ایسی نوبت آئی بھی کبھی نہیں تھی۔ ماہ رو نے کبھی بھی فریحہ کو اپنے گھر انوائٹ نہیں کیا تھا۔ نہ کسی سالگرہ پہ نہ کسی فنکشن میں۔

ماہم کے توسط سے فریحہ تک ماہ رو کی ہر پارٹی کی اطلاع تو ضرور پہنچ جاتی تھی۔ اور وہ جانتی بھی تھی کہ ماہ رو اسے جان بوجھ کر نہیں بلاتی۔ لیکن فریحہ نے کبھی شکوہ بھی نہیں کیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی اسے ماہ رو کے گھر جانے کی کبھی اجازت نہ ملتی۔

اس دن اتوار تھا۔ کالج اور اسکولز کے ساتھ 'ابا تایا' دکانیں بھی بند کرتے تھے۔ اتوار کے اتوار حساب بھی کرنا ہوتا تھا اور نیا مال بھی خریدنا ہوتا۔ اس لیے اتوار کو چھٹی ہوتی تھی اور خواتین کی مصروفیت بھی بڑھ جاتی تھی۔ سب مرد اتوار کو گھر پر ہوتے تھے۔ سارا دن کچن میں ہی گزر جاتا تھا۔ اور آج فریحہ 'ابا اور عون کی پسند کا کھانا بنا رہی تھی۔ اچاری بریانی کے ساتھ بالٹی گنا تمہاری جیسی محنت طلب ڈشز بناتے ہوئے فریحہ کو دانتوں پسینہ آگیا تھا۔ چونکہ موسم بھی گرم تھا اس لیے آج کچھ زیادہ ہی گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی وہ اچاری بریانی کو دم دے ہی رہی تھی جب کائنات نے اونچی آواز میں اسے اطلاع دی تھی۔

"فری آپی! آپ کی فرینڈ کا فون ہے۔"

"کس کا فون ہے کائنات؟" فریحہ کا انداز مصروف سا تھا۔ کیونکہ عموماً" اس کی فرینڈز گھر میں کالز وغیرہ نہیں کرتی تھیں۔ وہ اندازہ لگاتی ہوئی کچن سے باہر آئی تھی۔ "کس کا فون ہو سکتا ہے؟ ہما' سعدیہ' سمیرا!۔

"ماہ رو آپی کا۔ جو اس دن آپ کو چھوڑنے ہمارے گھر آئی تھیں۔" اپنی حیرت کا گلا دبا کر اس نے فون اٹھالیا۔ دوسری طرف واقعی ہی ماہ رو کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ ماہ رو نے اسے کال کی تھی۔ از خود؟ فریحہ کو یقین ہی نہیں آیا تھا۔ اتنی لمبی دوستی میں ماہ رو نے دوسری یا تیسری مرتبہ بغیر کسی کام کے کال کی تھی ورنہ جب یونی ورسٹی میں تھیں تب اکثر نوٹس وغیرہ کے لیے وہ گھر میں کال کر لیا کرتی تھی۔ کبھی "دوستانے" کی خاطر اس نے کال نہیں کی تھی۔

"فریحہ! کیسی ہو تم؟" ماہ رو سے بات نہ بن پڑی تو بے تکا سا سوال کر دیا۔ فریحہ جو پہلے سے ماہ رو کے فون پہ حیران تھی کچھ اور بھی حیران رہ گئی۔

"ایک رات میں کیسی ہو سکتی ہوں؟ ابھی کل تو ہماری دوبارہ ملاقات ہوئی تھی۔" فریحہ نے اسے یاد دلانا چاہا تھا جب وہ ہفتے میں تیسری مرتبہ اس کے کالج ملنے چلی آئی تھی۔ اور یہ ملنا بے سبب ہی تھا۔ ماہ رو دس پندرہ منٹ کے لیے آئی اور چلی بھی گئی تھی۔ فریحہ کو وہ خاصی مضطرب لگی تھی نجانے کیا معاملہ تھا۔ ماہ رو کا چہرہ پہلے سا فریش بھی نہیں تھا۔ بجھا بجھا سا اداس تھا۔ جیسے وہ کسی الجھن میں تھی۔ فریحہ تب پوچھتی رہ گئی تھی تاہم ماہ رو نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ ماہ رو اب بھی کچھ نہیں بتا رہی تھی۔ نجانے معاملہ کیا تھا؟ اس نے خود ہی کال بھی ڈسکنکٹ کر دی تھی۔ فریحہ جیسے حیران رہ گئی۔ ابھی وہ اس حیرت سے سنبھلی نہیں تھی جب

لاؤنج میں چھڑے موضوع کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ وہاں تو ایک اور ہی بحث کا سماں تھا۔ فریحہ کو فون بند کرتے دیکھ کر عامر اور یاسر نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔

"فریحہ آپی! آپ کی اتنی حسین دوست ہے۔ اور آپ کے بھائی کسی لیالو سے کم نہیں۔ ہمارا "چانس" بنوادو۔ ماہ رو کو اپنی بھابھی بنالو۔ میں آج ہی دولہا بننے کو تیار ہوں۔" یاسر نے اس قدر اتاؤلے پن سے کہا تھا کہ پاس بیٹھی تائی نے جوتا اتار کر اس کی کمر کا خوب نشانہ لیا۔

"ابھی سیکنڈ ایئر میں پاس ہو کر تو دکھاؤ۔ پھر کسی کے سر تاج بھی بن جانا۔" یہ کھرکتا جواب عون کی طرف سے آیا تھا۔ یاسر ڈھٹائی سے ہنستا رہا۔

"پڑھی لکھی بیوی لاؤں گا تو خود پڑھادے گی۔ ٹیوشن کی بچت کے ساتھ مفت میں فری اکیڈمی کا مزہ بھی لوں گا۔"

"اور وہ کما کر لائے گی تم آرام سے بیٹھ کر کھانا۔" عامر نے بھی لقمہ دینا ضروری سمجھا تھا۔ یاسر کو اس کے لبوں سے نکلی بات دل کو لگی تھی۔

"میرا فیوچر میں یہی پلان ہے۔" اس نے شان بے نیازی سے کہا۔

"مجھ سے بھائیوں کی طرح دکان داری نہیں ہوتی۔ اور نہ میں بھانت بھانت کی خرانٹ عورتوں کے ساتھ مغزماری کر سکتا ہوں۔ میں اپنے خاندانی بزنس کو اپنے لیے قطعاً "غیر مناسب سمجھتا ہوں۔" موضوع گفتگو کسی اور سمت کو جا نکلا تھا۔ عون حساب کرتے ہوئے بار بار ڈسٹرب ہو رہا تھا اس وقت بھائیوں کی "چونچالی" خاصی گڑبڑ مچا رہی تھی۔

اوپر سے کائنات کا ماہ رو نامہ۔ وہ فریحہ کی اس ماڈرن کسی حد تک بے باک دوست سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو چکی تھی۔ وہی ماہ رو جسے فریحہ کے ساتھ دیکھ کر عون کو خاصا اچنبھا ہوا تھا۔ کہاں فریحہ اور کہاں ماہ رو۔ فریحہ ڈھکی چھپی کم گو، سنجیدہ اور باوقار سی لڑکی۔ ماہ رو انتہائی لبرل 'ماڈ' بے باک اور شوخ طبیعت کی۔ عون نے ایک اچٹتی نگاہ اس پہ ڈالی تھی۔ اور اس نگاہ میں وہ ماہ رو کا مکمل جائزہ لے چکا تھا۔ وہ کسی بھی لحاظ سے فریحہ کی دوست کے پیمانے پہ پوری نہیں اتر سکتی تھی۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ فریحہ کو اس لڑکی سے میل ملاپ رکھنے دوستی بڑھانے سے منع کردے گا۔ کیونکہ اس لڑکی کا اسٹیٹس، رہن سہن، انداز و اطوار ان کے گھرانے کے کسی لڑکی کو متاثر کرنے کے قابل نہیں تھے۔

پہلی نگاہ میں ہی عون کو وہ ناپسندیدہ لگی تھی۔ تب وہ فریحہ کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔ مگر جب اگلے ہی دن پھر ماہ رو کی عین ناشتے کے وقت کال آگئی۔ اور یہ بھی ایک انوکھا سا واقعہ تھا۔ فریحہ ایک مرتبہ پھر شاکڈ رہ گئی تھی۔ کیونکہ اس ہفتے میں ماہ رو کی یہ کوئی اٹھارویں کال تھی۔ وہ شاید اگلے پچھلے ریکارڈ توڑنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ یہ کال پہلی کالز کی طرح بے مقصد نہیں تھی۔ اس دفعہ ماہ رو نے فریحہ کو اپنے گھر انوائٹ کیا تھا۔ بقول ماہ رو کے چھوٹی سی برتھ ڈے پارٹی ارینج کر رہی تھی۔ سو فریحہ کو پہلا دعوت نامہ مل گیا تھا۔ اور فریحہ فون رکھ کر بھی اتنی حیران تھی کہ کچھ دیر تک بول نہیں پائی تھی۔ کیا ماہ رو کی برتھ ڈے سال میں دو دو مرتبہ منائی جاتی تھی۔؟ اور شاید امیر لوگ اپنی سالگرہ سال میں کسی بھی وقت منا سکتے تھے۔

فون بند ہوا۔ تو سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی تھی۔ عامر، یاسر اور کائنات اس کے سر ہو چکے تھے۔

"ماہ رو آپی کیا کہہ رہی تھیں!" کائنات دسترخوان سے اٹھ کر اس کے قریب آگئی تھی۔ عامر اور یاسر کے کان بھی کھڑے تھے۔ وہ بھی ناشتا بھول گئے۔ تائی اور امی بھی فریحہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"اس کی برتھ ڈے ہے امی! سب کو انوائٹ کر رہی تھی۔" فریحہ کا انداز کچھ مدہم تھا۔ پھر بھی تایا، ابا اور عون نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔

"سب کو۔" کائنات کا دل مچل اٹھا۔ "ہم سب کو کیا؟۔ اف مائی گاڈ۔ میں تو ضرور جاؤں گی۔ ہمارے گھر تو سالگرہ کا کوئی رواج نہیں ہے۔ ایک اچھی سی پارٹی اٹینڈ کرنے کا میرا دیرینہ شوق ہے۔" کائنات نے فرط

اشتیاق میں اتنی بلند آواز میں سب کو ڈھول پیٹ کر بتادیا تھا۔ یوں کہ ابا اور تایا بھی چونک گئے تھے۔ عون نے بھی چائے کا کپ ساسر میں رکھ دیا تھا۔ پھر وہ دسترخوان سے اٹھ گیا۔ شاید وہ ماہ رو نامے سے چڑ گیا تھا۔

امی اور تائی سوچ میں پڑ گئی تھیں۔ گو کہ فریحہ کی دوست انہیں دل سے پسند آئی تھی۔ پھر بھی اس کے گھر جانے میں وہ تذبذب کا شکار تھیں۔ تایا اور ابا یقیناً" رکاوٹ نہ ڈالتے۔ لیکن دونوں خواتین از خود ساری حدود و قیود کی پاسداری کیا کرتی تھیں۔

"فریحہ آپی! آپ ماہ رو آپی کو بتادیتی نا۔ ہم آج شام کو ان کے گھر جائیں گے۔ آخر وہ آپ کی اتنی پرانی فرینڈ ہیں۔" کائنات نے ایک مرتبہ پھر مچل کر کہا تھا۔ فریحہ امی اور تائی کی طرف دیکھنے لگی تھی جیسے جاننا چاہتی تھی کہ ان کی رائے کیا ہے؟ لیکن ان دونوں سے پہلے ہی عون بولتا ہوا دوبارہ اندر آگیا تھا۔

"کوئی ضرورت نہیں جانے کی۔ تم معذرت کرلو' اس کی پارٹیاں بھی اس کی طرح ہوں گی۔" اس نے بمشکل "اوور" اور "بے ہودہ" کہنے سے خود کو باز رکھا تھا۔ کائنات کا منہ اتر گیا تھا۔ فریحہ تاہم کچھ مطمئن ہوگئی تھی۔ جیسے عون نے اس کے دل کی بات کہہ ڈالی تھی۔

"وہ اتنے پیار سے بلا رہی ہیں۔ اتنی پیاری تو ہیں ماہ رو آپی۔" کائنات منمناتی رہ گئی تھی۔

"ہم نے اس کے "پیار" کا اچار ڈالنا ہے۔" وہ کائنات کا سر سہلاتا ذرا مسکرا کر باہر نکل گیا تھا۔ دوسرے معنوں میں سب کو باور کروادیا تھا کہ ماہ رو کی دعوت پر آرام سے معذرت کرلیں۔ یوں ماہ رو کے انوی ٹیشن پر فریحہ سمیت کوئی بھی نہیں جاسکا تھا لیکن ہوا کچھ یوں کہ ماہ رو خود ہی اتنا بڑا شکوے کا دفتر اٹھا کر دوسرے ہی دن رحمان منزل ایک مرتبہ پھر اس انداز میں آئی کہ فریحہ کو اپنے اندر کچھ کھٹکتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ کھٹکتا ہوا احساس بھلا کیا تھا؟ ایک چٹکیاں بھرتا ہوا خیال' جیسے کچھ ہونے والا تھا۔ کوئی بچھڑنے والا تھا۔ اگلے بہت سارے دنوں میں فریحہ پہ یکے بعد دیگرے کچھ انکشاف ہوئے تھے۔ اور ان انکشافات نے اسے دم بخود کردیا تھا۔



لش گرین گھاس پہ ننگے پاؤں ٹہلتی وہ پچھلے کئی دنوں سے مضطرب تھی۔ اس اضطراب کا کوئی انت نہیں تھا۔ وہ ایسی تکلیف سے گزر رہی تھی جسکی لذت سے اسے پہلی مرتبہ آشنائی ہوئی تھی۔ یہ درد جو لا دوا تھا اور جس کا کوئی علاج بھی نہیں تھا۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے؟ کیا چند لمحوں میں دل کی دنیا تہ و بالا ہو جاتی ہے؟ وہ سرفراز احمد جیسے معروف بزنس مین کی لاڈلی بیٹی نہ سہی اکلوتی ضرور تھی۔ اس کی پرورش ہائی سوسائٹی کے سارے اصولوں کے مطابق شاہانہ انداز میں ہوئی تھی۔ وہ ایک سال کی تھی جب ڈیڈی اور ممی میں علیحدگی ہوگئی تھی۔ پھر ممی نے اور شادی کرلی تھی ڈیڈی بھی اور بیوی لے آئے۔ شازمہ ڈیڈی کی من پسند بیوی ضرور تھی' مگر ماہ رو کی کبھی ماں نہیں بن سکی تھی۔ ماہ رو مختلف آیاؤں کی گود میں پلتی ہوئی بچپن اور لڑکپن تک پہنچی تھی۔ اس دوران ماہ رو کے شعور نے پختگی حاصل کی تھی یا نہیں کی تھی تاہم وہ شازمہ کے ساتھ اپنے رشتے کی "نوعیت" خوب سمجھ گئی تھی۔

گو کہ ان کے تعلقات کبھی روایتی نہیں رہے تھے تاہم شازمہ نے کبھی اسے ایک ماں کا پیار یا توجہ نہیں دی تھی۔ شازمہ کا ایک بیٹا سنی تھا۔ جو شروع سے ہی ابراڈ رہا۔ سو ماہ رو کی اپنے بھائی سے بات چیت بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ڈیڈی بھی اپر کلاس کے ڈیڈیوں جیسے باپ تھے۔ کبھی ہفتوں بعد انہیں بیٹی کا خیال آتا تھا۔ البتہ روپے پیسے کی ماہ رو کو کبھی کمی نہیں رہی تھی۔ ڈیڈی یہ نہیں جانتے تھے کہ روپیہ سب کچھ نہیں ہوتا۔ والدین کی محبت' توجہ' خیال ایک نارمل بچے کی بنیاد بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں' لیکن جہاں دونوں ہی رشتے مفقود ہوں وہاں تربیت' احساس'

خیال' توجہ یا محبت کہاں سے آتی؟ ماہ رو ایک ایسے تنہا پودے کی طرح پروان چڑھی تھی جس کی بروقت کانٹ چھانٹ کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا سو اس پودے میں کئی طرح سے جھاڑیاں کانٹے اور ابھی شاخیں نکل آئی تھیں۔ انکچوئلی ماہ رو کی پوری شخصیت اسی پودے سے امیجن کرتی تھی جس میں کئی طرح سے نوک دار' بے وضع شاخیں اور کانٹے اگ آئے تھے۔

وہ باپ کی بے توجہی' عدم تحفظ اور لاپروائی کے باعث بہت اکیلی' تنہا اور اداس تو تھی ہی' مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی بے رنگ' ایب نارمل زندگی کی وجہ سے بہت خود سر' نڈر' ضدی اور نک چڑھی بھی ہوتی گئی تھی جیسے جیسے عمر رواں کے سال آگے بڑھتے گئے وہ اپنے باپ اور ماں سے مزید دور ہوتی گئی تھی۔

اس نے روایتی اسٹیپ مدرز کی طرح کبھی ماہ رو پہ بے جا تشدد نہیں کیا تھا تاہم وہ بڑے مہذب طریقے اسے نفسیاتی طور پہ ٹارچر کیا کرتی تھی۔

چونکہ شازمہ اس کی اسٹیپ مدر تھی سو جلد ہی ماہ رو نے اس کے مبہم برے رویوں کو نظر انداز کرنا شروع کردیا تھا۔ وہ ڈیڈی کی لاپروائی پہ کڑھنا بھی چھوڑ چکی تھی۔ شازمہ جو بھی کرتی ماہ رو کی بلا سے۔ کیونکہ جیسے ہی وہ بڑی ہوتی گئی تھی اس نے گھر سے باہر اپنے لیے ایکٹیوٹیز ڈھونڈلی تھیں۔ وہ کلب جاتی تھی' ہوٹلنگ کرتی' شاپنگ کرتی جب دل چاہتا دبئی' کینیڈا یا یوکے چلی جاتی۔ ڈیڈی کی طرف سے اس پہ کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ اسے کھلا جیب خرچ دیتے تھے اور مڑ کر کبھی حساب بھی نہیں لیتے تھے۔ پڑھائی میں بھی وہ خود بخود اچھی ہو گئی تھی۔ پھر ماہ رو نے اپنے سوشل سرکل کو بھی خاصا وسیع کرلیا تھا۔ پہلے پہل اس کی ایک ہی فرینڈ تھی۔ فریحہ' جو تھی تو مڈل کلاس سے تاہم اس کے پیرنٹس اسے اچھے اسکولز میں پڑھا رہے تھے۔ فریحہ اور ماہ رو ایک ساتھ کالج اور یونی ورسٹی تک بھی گئی تھیں۔ فریحہ کی خاطر ماہ رو نے اپنا کالج اور پھر یونی ورسٹی بھی چینج کرلی تھی۔

ان دونوں نے ایک ساتھ طویل دس سال گزارے تھے۔ اس کے باوجود دونوں میں بہت اعلا پائے کی دوستی نہیں ہو سکی تھی۔ اسٹیٹس ان دونوں کے درمیان ایک خلیج کی طرح حائل رہا تھا۔ شاید یہ دوستی بہت آگے تک نہ جاتی' لیکن اس کو کہیں نہ کہیں سے ماہ رو نے خود برقرار رکھا ہوا تھا۔ چونکہ فریحہ بہت ہی کم رو قسم کی سادہ مزاج لڑکی تھی اس لیے بھی ماہ رو کو اس کے ساتھ رہنا پسند تھا کیونکہ جہاں ماہ رو ہوتی تھی وہاں فریحہ پس منظر میں چلی جاتی تھی۔ اسی طرح فریحہ کو بھی ہمیشہ ماہ رو کی موجودگی میں بہت فائدے رہے تھے۔ پوری یونی ورسٹی میں ماہ رو کا طوطی بولتا تھا۔ کوئی اس کے حسن سے متاثر تھا' کوئی دولت سے۔ ماہ رو کی وجہ سے اکثر یونی ورسٹی فیلوز فریحہ کو بھی بہت خاص پروٹوکول دینے لگتی تھیں۔

ماہ رو میں بہت سی فطری اور بشری کمزوریاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اور کچھ حالات نے اسے ذرا خود غرض بنادیا تھا۔

یہ ان ہی دنوں کی بات ہے' جب ماہ رو نے یونی ورسٹی کو خیرباد کیا تھا۔ اور یہ بہت پرانا قصہ بھی نہیں تھا شاید سات یا آٹھ ماہ پہلے کی بات ہے۔ گوکہ ماہ رو کے دھڑا دھڑ پرپوزل آنا کوئی انوکھا واقعہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس کی پرپوزلز کا ایک لمبا سلسلہ کالج لائف میں ہی شروع ہوگیا تھا۔ ہر کلاس سے رشتہ آتا تھا۔ ایلیٹ' اپر' مڈل' یوں تو ایک مرتبہ ڈیڈی تک پہنچ کر دکھلاتے تھے کیونکہ انہوں ماہ رو کے لیے شادی وغیرہ کے جھنجٹ کو نہیں سوچا تھا۔ سو تمام پرپوزلز ریجیکٹ کردیے گئے تھے۔ ڈیڈی نے سب سے مہذب انداز میں معذرت کرلی تھی' لیکن وقاص کا رشتہ ایسا تھا جس پہ پہلی مرتبہ گھر میں سرد جنگ کا آغاز ہو گیا تھا۔

ڈیڈی کسی بھی صورت میں وقاص کے پرپوزل کو ریجیکٹ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وقاص بہت لائق فائق تھا۔ اس نے بائیو ٹیکنالوجی میں امریکا سے پی ایچ ڈی کیا تھا۔ اس کی پوری فیملی گوکہ ڈیڈی کے ٹکر کی

نہیں تھی پھر بھی ذہانت، علم اور وضع داری میں ان کے گھرانے سے اچھا شاید ہی کوئی گھرانہ ہو۔ اور ماہ رو کو یہ بھی بہت بعد میں پتا چلا تھا کہ شازمہ کی بہن بذات خود اپنی بہن کو پسند نہیں کرتیں۔ شاید اس لیے کہ بہت سال پہلے ماہ رو کے ڈیڈی کی معمولی سیکریٹری سے "بیوی" تک کا عہدہ پانے میں شازمہ نے کبھی اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے خوابوں اور ارمانوں کا خون کیا تھا۔ ممی اور ڈیڈی کی علیحدگی کا سبب بھی شازمہ سرفراز ہی تھی۔

شازمہ کے بھانجے کا سن کر ماہ رو نے خود ہی دو ٹوک انکار کر دیا تھا۔ وہ شازمہ سے نفرت تو نہیں کرتی تھی تاہم اس سے اور اس کی فیملی سے بے زار ضرور تھی۔ یہ اور بات تھی کہ ماہ رو کا انکار شازمہ کے لیے بڑا شادمانی کا سبب بنا تھا۔ ماہ رو جو سمجھ رہی تھی اس کے انکار کو شازمہ اپنی توہین سمجھ کر سیخ پا ہو جائے گی اسے مطمئن دیکھ کر اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔ کیونکہ شازمہ نے بخوشی ماہ رو کا انکار اپنی بہن تک پہنچا دیا تھا۔ اور ڈیڈی جو وقاص کو دل و جان سے پسند کر چکے تھے۔ اس کی ذہانت، خوش مزاجی، شرافت، نجابت اور شاندار اکیڈمک ریکارڈ سے متاثر ہو چکے تھے۔ ان کے لیے یہ انکار دھچکے سے کم نہیں تھا۔ ڈیڈی نے پہلی مرتبہ ماہ رو پہ غصے ہونے کی بجائے شازمہ کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

"مجھ سے مشورہ کیے بغیر اپنی بہن تک انکار پہنچا دیا۔ تم نے اچھا نہیں کیا۔" ان کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ شازمہ چونکہ ڈنکے کی چوٹ پہ جھگڑے کرتی آئی تھی۔ اور ڈیڈی کبھی اس کے سامنے بولنے کی جرات نہیں کر سکے تھے۔ اس لیے وہ ایک مرتبہ پھر ڈیڈی پہ چڑھائی کرنے میں لگ گئی تھی۔

"تمہاری بیٹی نے خود انکار کیا ہے۔ وہ میرے رشتہ داروں میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ تم بیٹی کے ساتھ زبردستی کرو گے؟ میرا کیا قصور ہے۔ میں نے تو آپی تک جواب پہنچا دیا۔" شازمہ نے ہار کہاں مانی تھی اور وہ خود پہ آنچ بھی نہیں آنے دے رہی تھی۔

"مگر تمہاری اپنی بیٹی ہوتی تم تب بھی یہی کرتیں؟ اسے سمجھانے یا رام کرنے کی بجائے متوقع سسرالیوں

تک اس کے "عیب" پہنچا ہیں؟ مجھے تو اب پتا چلا ہے۔ تم چاہتی ہی نہیں تھیں کہ وقاص جیسے قابل لڑکے سے ماہ رو کی شادی ہو۔" ڈیڈی کے اگلے الفاظ نے شازمہ کو شرمندہ کردیا۔ وہ ماہ رو کے لیے شازمہ سے اس لہجے میں کلام کررہے تھے؟ سو کچھ دیر کی کوشش کے بعد اس کا لہجہ رواں اور نارمل ہوگیا تھا۔

"ماہ رو کے لیے یہ کوئی آخری پرپوزل نہیں تھا۔ ابھی دنیا بھری پڑی ہے ویسے بھی تمہیں ماہ رو کے لیے اپنے سرکل تک محدود رہنا چاہیے۔ اپنی کلاس میں پرپوزل دیکھو۔۔۔۔" شازمہ نے بڑی حد تک اپنے ابلتے غصے پہ بند باندھنے کے بعد ذرا دھیمی آواز میں کہا تھا۔

"میری کلاس میں کم از کم وقاص جیسے رشتے نہیں ملتے۔" ڈیڈی کا ملال کسی طور کم نہیں ہورہا تھا۔ ان کا لہجہ اور انداز بھی بجھ گئے تھے۔

"تم کیا چاہتی ہو کسی چین ڈرنکر' لوز کریکٹر کے ہاتھ ماہ رو کو تھمادوں؟"

"ہر کوئی برا بھی نہیں ہوتا۔" شازمہ بھی جز بز سی ہوئی۔

"تو پھر کوئی بہت اچھا وقاص جیسا تم ہی دکھادو۔" ڈیڈی کا لہجہ اور بھی ویران ہوگیا۔ رہ رہ کے شازمہ کی بہن کے الفاظ یاد آرہے تھے۔ انہوں نے بہت شائستگی کے ساتھ معذرت کرلی تھی۔ کیونکہ وہ یہ رشتہ اس لیے جوڑنا چاہتی تھیں کہ تعلقات بہتر ہوں جب شازمہ کی خواہش ہی نہیں تھی تو وہ کیوں معاملات کو بگاڑتیں۔ انہوں نے باقی باتیں چھپالی تھیں۔

"اوکے' تم ریلیکس فیل کرو۔ میں ماہ رو کے لیے وقاص سے بہتر لڑکا ڈھونڈوں گی۔ یو ڈونٹ وری' مجھے اس پر افسوس ہے۔ ویسے بھی وقاص پہ دنیا ختم نہیں ہوتی۔ ماہ رو کی خواہش بھی نہیں تھی۔ تم اپنی بیٹی کے ساتھ زبردستی بھی تو نہیں کرسکتے۔ میں نے تو ماہ رو کے لیے بہتر سوچا۔ ماہ رو کا انٹرسٹڈ ہونا میٹر کرتا تھا جب وہ راضی نہیں تھی تو تم بھلا کیا کرلیتے؟ میں نے ماہ رو کے لیے کبھی برا نہیں سوچا۔ شازمہ نے لمحوں میں چکنی باتوں سے ایک مرتبہ پھر ڈیڈی کو اس فیز سے نکال لیا تھا۔

جب ڈیڈی بہت دن تک اسی صدمے کے زیر اثر رہے تب ماہ رو نے پہلی مرتبہ گہرائی میں جاکر سوچا۔

"وقاص میں کچھ تو ایسا تھا جو ڈیڈی اس کے لیے اتنا ٹچی ہورہے تھے۔" وہ چاہ کر بھی اس خیال سے پیچھا نہیں چھڑا سکی تھی۔ پھر یہ خیال اس وقت ملال میں بدلا تھا جب ماہ رو نے وقاص کو ایک نجی پارٹی میں دیکھ لیا۔



وہ شام بھی خاص سہانی اور ستاروں سے سجی تھی۔ شازمہ کے عزیزوں میں شادی کا فنکشن تھا۔ اور ماہ رو تو بہت کم شازمہ کے فیملی فنکشنز کا حصہ بنتی تھی۔ اس کی اپنی مصروفیات ہی لاتعداد تھیں' لیکن اس شام نہ چاہتے ہوئے بھی ماہ رو کو شازمہ کے ساتھ آنا پڑا تھا کیونکہ ڈیڈی نے پہلی مرتبہ اسے بہت فورس کیا تھا کہ وہ سوشل پارٹیز کی بجائے زیادہ سے زیادہ فیملی پارٹیز اٹینڈ کیا کرے۔ اس کے بے انتہا لبرل' ماڈ اور انتہائی سوشل ڈیڈی کی اس نکتے پہ سوچ بہت مڈل کلاس قسم کی تھی۔ وہ چاہتے تھے ماہ رو کی شادی امیر خاندان میں نہیں بلکہ وضع دار' شریف اور خوش حال فیملی ہو۔ جو نہ صرف ایجوکیٹڈ ہوں بلکہ رکھ رکھاؤ والے' شریف اور عزت دار لوگ ہوں۔ خاص طور پہ لڑکے کا شریف' باکردار ہونا بہت ضروری تھی۔ ڈیڈی کے یہ خیال ماہ رو کے لیے انتہائی حیران کن تھے۔ وہ اپنی بیٹی کے لیے پہلی مرتبہ ایک باپ بن کر سوچ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے "سرکل" سے ہٹ کر ماہ رو کے لیے رشتہ تلاش کرنا شروع کیا تھا۔ یہ ہر ایک کے لیے انتہائی تعجب کی بات تھی۔ ڈیڈی کی ڈیمانڈ میں کہیں بھی ایلیٹ کلاس کا داماد نہیں تھا۔ حتیٰ کہ شازمہ تک چیخ پڑی تھی۔

"تم نے اپنی ناک کٹوائی ہے۔ لوگ تو شادیوں کے نام پہ بزنس بڑھاتے ہیں اور ترقی کرتے ہیں اور تم نے بیک گیئر لگا رکھا ہے۔"

"میں نے بیٹی کی شادی کرنی ہے۔ بیوپار نہیں۔"
ڈیڈی کے دو ٹوک الفاظ کو سن کر شازمہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھی۔ پھر اس نے ڈیڈی کی تلاش میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی تھی۔ اور اس کے امیر کبیر باپ کو جس کے لیے بزنس کے داؤ پیچ میں اپنے حریف کو پچھاڑ دینا لمحوں کا کام تھا۔ اپنی ہی بیٹی کے لیے رشتہ تلاش کرنا مسئلہ فلسطین بن گیا تھا۔

آج اس ستاروں بھری شام میں وقاص کو دیکھ کر اسے اپنے ڈیڈی کی ملال پر یچ کا گمان ہوا تھا۔

صدا کی بولڈ' بے باک' حاضر جواب ماہ رو کو وقاص کے مقابل آتے ہی سارے الفاظ بھول سے گئے تھے۔ بھلا اسے کیا تعارف کرواتی؟ کیا یہی کہ تمہارا پرپوزل میرے لیے آیا تھا؟ یا پھر میں نے شازمہ کی چڑ میں بغیر سوچے سمجھے انکار کردیا تھا۔ اور اب ڈیڈی کی خاطر وہ کچھ پچھتا بھی رہی تھی۔ یہ سارے الفاظ اس کے ذہن میں گڈمڈ ضرور ہو رہے تھے' لیکن کہنے کے لیے کچھ مزید انرجی کی ضرورت تھی۔ پھر نہ جانے کیسے اس نے چند الفاظ میں معذرت کے لیے ایک پیراگراف ترتیب دے لیا۔ جس میں اس نے اپنی انا کو ہر صورت سربلند رکھنے کی کوشش کی تھی۔ وقاص جیسے سمجھ گیا تھا۔ وہ واقعی بہت ذہین اور ڈیسنٹ انسان تھا۔ انتہائی خوش خلقی کا مظاہرہ کرتا رہا۔ اور یہ منظر شازمہ کو ایک مرتبہ پھر تیر کی طرح دل میں لگا تھا۔ وہ وقاص اور ماہ رو کو ایک ساتھ دیکھ کر شدید ناگواری محسوس کررہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ان دونوں کو ایک جگہ کھڑا بھی نہ ہونے دے۔ بڑے طریقے سے وقاص تک اپنا مدعا پہنچا دینے کے بعد ماہ رو کو یقین نہیں تھا کہ اس کی امی دوبارہ اس کی طلب گار بن کر آجائیں گی۔ پھر بھی ڈیڈی کے لیے ایک کوشش کرلینے میں حرج کیا تھا؟ ستاروں بھری اس شام کے اختتام پہ ماہ رو کچھ خوش فہمی کا شکار ہوچکی تھی کہ شاید ڈیڈی کی خواہش پوری ہوجاتی۔ کیونکہ وقاص کا انداز حوصلہ افزا تھا۔

لیکن اس کی یہ خوش فہمی اس وقت تمام ہوگئی تھی جس وقت وقاص کی امی ان کے گھر آئی ضرور تھیں مگر وقاص کی منگنی کا کارڈ لے کر۔ تب ماہ رو کو ایسی چبھن تو محسوس نہیں ہوئی تھی جس قدر شازمہ کے رویے نے اسے ہتک کا احساس دلایا تھا۔ وہ بلاوجہ ایک سے زیادہ کئی مرتبہ جتا چکی تھی۔

"وقاص کا رشتہ ہوئے تو ڈیڑھ ماہ ہوچکا۔ تم کس گمان میں تھیں۔ وہ تمہارے حسین سراپے کو دیکھ کر رشتہ توڑ دے گا۔" شازمہ کا استہزائیہ انداز ماہ رو کو پہلی مرتبہ ایک کمپلیکس کا شکار کرگیا تھا۔ وہ اسے محبت نہیں دے سکتی تھی۔ اس کے لیے اچھا نہیں سوچ سکتی تھی تو کم از کم اپنی زبان سے تو محفوظ رکھتی۔ پہلی مرتبہ ماہ رو کو احساس ہوا تھا کہ ڈیڈی اس کے لیے کوئی درمیانہ گھر اور درمیانہ "بر" کیوں تلاش کررہے تھے؟ اس لیے کہ ڈیڈی کو احساس ہوچکا تھا انہوں نے ماہ رو کو ایک "ایب نارمل" زندگی اور "ماحول" دے رکھا ہے۔ شاید وہ اس کی پچھلی زندگی میں در آنے والی محرومیوں کا ازالہ اسی طرح سے کرنا چاہتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ ماہ رو ان ہی کی سوسائٹی کے کسی پروردہ شخص کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکتی تھی۔ سو ماہ رو سرفراز کا اپر کلاس کی ہر اچھائی برائی سے مرقع اور نمائندہ باپ ان دنوں کسی اپر مڈل کلاس فیملی میں ماہ رو کا رشتہ تلاش کررہا تھا۔



عون عباس کے اس کی زندگی میں آنے سے پہلے کوئی زندگی کا مقصد حیات نہیں تھا' لیکن اب جیسے دل کی نگری بدلتے ہی اندر باہر کے موسموں میں رنگینی آگئی تھی۔ یوں لگتا تھا ہر طرف بہار ہی بہار ہے۔ ابھی تو اس یک طرفہ محبت نے ہر احساس کے رنگ کو تبدیل کردیا تھا۔ اگر اسے یقین ہوتا کہ محبت دو طرفہ بھی ہے تو جانے ماہ رو سرفراز کہاں کہاں اور کس کس مقام پہ سرفراز ہوجاتی؟ لیکن محبت دو طرفہ کہاں تھی؟ کبھی ایک وقت تھا وہ فلسفوں کو کان جھاڑ کر گرا دیتی اور نخوت سے سر جھٹک کے آگے بڑھ جاتی تھی' لیکن اب ماہ رو سرفراز پہ کوئی اور ہی وقت آیا ہوا تھا۔ یوں

لگتا ہر کہانی، ہر لفظ، ہر حرف ہر فلسفہ اسی کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ اسی کے لیے لکھا گیا ہے۔ اسی کے لیے محفوظ کیا گیا ہے۔

اور کسی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ مقصدیت انسان کو توانا کردیتی ہے۔ اس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بھی بے دار کردیتی ہے۔ منزل چاہے ان دیکھی ہو، لیکن جب منزل کا تعین کرکے اس کی راہ پر گامزن ہوا جاتا ہے پھر زادِ راہ کی بھی سمجھ آجاتی ہے اور رستوں کی رکاوٹ بھی خود بخود دور کرنا آجاتا ہے۔ مقصد کو پانے کے لیے بس خلوص کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اور ماہ رو اس فلسفے کے لفظ لفظ سے طاقت اور توانائی حاصل کرتی تھی۔ اسے یقین تھا۔ راستوں کی رکاوٹیں خود بخود دور ہوجائیں گی۔ منزل قریب آجائے گی۔ کیونکہ اس کی اچانک سونامی کی طرح بپھری محبت میں جنون بھی تھا اور جذبہ بھی خلوص بھی تھا اور عشق بھی۔ پھر یہ عشق کی تپش کسی اور تک بھلا کیوں نہ پہنچتی؟

یہ آگ، یہ گرمی، یہ جلن، یہ تپش بہت حیران کن انداز میں سب سے پہلے فریحہ تک پہنچ گئی تھی۔ وہ فریحہ جو ماہ رو کے اچانک بدل جانے والے انداز، رویے اور مزاج پہ حیران تھی۔ صرف لمحوں کی دیر میں گم صم اور حواس باختہ ہوگئی تھی۔ ماہ رو کا وہ حسین چہرہ وہ دل نشین آنکھیں جن کے ہر رنگ میں عون عباس کے لیے محبت ڈھلتی اور چھلکتی تھی۔ وہ "چاہ" جو چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ یوں ہی ایک اجلی دوپہر فریحہ کی ماں اس کا بازو دبوچ کر کمرے میں لے آئی تھی۔ فریحہ کی طرح اس کی ماں بھی حواس باختہ تھی۔ ان کا چہرہ سپاٹ نہیں تھا، وہاں بے چینی تھی۔ اضطراب تھا اور وہ ٹٹول ٹٹول کر اپنی بیٹی کا عام سا بہت سادہ چہرہ بغور دیکھتیں۔ وہاں بھی الجھن تھی اور ایک بے نام سی بے چینی تھی۔ ایک جھلک پڑتا خوف تھا۔ کچھ کھودینے کی دہائی تھی۔

ابھی کچھ دیر پہلے اس کی اٹھارویں کال آئی تھی۔ وہ اسی طرح متواتر کال کررہی تھی۔ کبھی کسی بہانے کبھی کس بہانے سے، وہ ہر روز کال کرتی تھی۔

دن میں کئی کئی مرتبہ۔ اور جب زیادہ بے چین ہوتی تو بہ نفس نفیس پہنچ جاتی۔ گوکہ گھر میں کائنات سمیت ہر ایک کو اس کی آمد بھلی معلوم ہوتی تھی۔ ثنا اور مریم بھابھی تو بہت ہی والہانہ خوشی کا اظہار کرتی تھیں۔ کیونکہ ماہ رو جب بھی آتی ان کے گھر میں ایک نیا کپڑوں کا اسٹائل اور فیشن متعارف کروا جاتی تھی۔ اس سہ پہر بھی وہ تین گھنٹے تک اپنے دلفریب وجود کی مہک بکھیر کر گئی تھی۔ اس کی خوش مزاجی نے گھر بھر کو اس کا گرویدہ کردیا تھا۔ کائنات اور ثنا کو تو خاص طور پہ ماہ رو کا انتظار رہا کرتا تھا۔ وہ دوپہر کو آئی تھی اور سہ پہر میں واپس گئی۔ کائنات، ثنا اور مریم بھابھی تو اسے جانے نہیں دے رہی تھیں، لیکن ظاہر سی بات تھی وہ رک نہیں سکتی تھی۔ جب ان تینوں نے اسے زیادہ مجبور کیا تو ماہ رو بہت دلربائی سے مسکرا کر بولی۔

"میرا تو اپنا دل چاہتا ہے میں ہمیشہ آپ لوگوں کے گھر میں رہوں۔" اس کے لہجے کی معنی خیزیت نے کسی اور پر اثر کیا تھا یا نہیں کیا تھا، لیکن فریحہ کو لمحوں میں فریز کردیا تھا۔ اس کا دل لمحہ بھر کے لیے رکا اور پھر چل پڑا۔ ماہ رو کی بات کا بھلا کیا مفہوم تھا؟ وہ اس کے گھر میں ہمیشہ کے لیے کیوں رہنا چاہتی تھی؟ کیا فریحہ کا گھر ماہ رو کے رہنے، قیام کرنے اور ٹھہرنے کے قابل تھا؟ اور پھر وہ اس گھر میں رہے گی کیوں؟ آخر کیوں؟ کس لیے؟ کس کی خاطر؟ کیا فریحہ کے لیے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ تو پھر آخر کون تھا جس کے لیے ماہ رو فریحہ کے اس گھر میں رہنا چاہتی تھی۔ جہاں پرائیویسی نام کی نہیں تھی۔ ہر وقت شور اور ہنگامہ بپا رہتا تھا۔ کھانے کے وقت جب گھر کے سب افراد دسترخوان پہ اکٹھے ہوتے تو میلے کا سا گمان ہوتا۔ یوں لگتا کسی کی بارات آئی ہے۔ جس گھر میں ایک وقت میں دیگ کے برابر کھانا پکتا تھا اور جس گھر کے افراد ایک دوسرے سے ریشوں کی مانند جڑے ہوئے تھے ماہ رو جیسی ہستی اس گھر میں قیام کرنا چاہتی تھی؟ کیوں آخر کیوں؟

فریحہ کا دل رکتا کیوں نا۔ اس کے اندر با ہر وسوسوں کا منہ برس رہا تھا۔ ماہ رو کی بات پہ ثنا نے بھرپور قہقہہ

لگا کر اسے ساتھ لگا لیا۔
"ایسی حسین شہزادی کو اپنے گھر میں ہمیشہ کے لیے رکھنا ہمارے لیے ایک اعزاز ہوگا ماہ رو۔" ثنا نے بھی بڑے معنی خیز انداز میں جواب دیا تھا۔ پھر ماہ رو چلی گئی۔ اپنی خوشبوؤں کی مہکار چھوڑ کر اپنی موجودگی کا روح میں اتر جانے والا احساس چھوڑ کر چلی گئی تھی اور اس کے چلے جانے کے بعد بھی دو تین گھنٹے تک ماہ رو پہ بحث کرنا ان کے گھر والوں کا معمول بنتا جارہا تھا۔ وہ سب ماہ رو پہ تبصرے کررہی تھیں سب کو وہ بہت لونگ، مہربان لگتی تھی اور فریحہ ایسے تبصروں پہ شاکڈ رہ جاتی تھی۔ گو کہ وہ سب ٹھیک ہی تبصرے کرتی تھیں ظاہر ہے وہ لوگ جو دیکھ رہی تھیں اسی تناظر میں کمنٹس دیتیں۔ یہ تو فریحہ جانتی تھی وہ تو مرقع غرور ہوا کرتی تھی۔ یہ تبدیلی تو رحمان منزل میں آنے کے بعد دکھائی دی تھی۔ جو اس کی خوبیوں میں ادغام کرکے منظر عام پر روشن ہوگئی۔ تو پھر یہ اتنی بڑی تبدیلی فریحہ کو کھٹکالی کیوں نا؟ آخر اس "بدلاؤ" کے پیچھے کوئی نہ کوئی سبب تو ضرور تھا؟ اور وہ سبب کیا تھا؟ فریحہ اس کھوج میں نہ پڑتی تو کیا کرتی؟ اور اس نے ثنا کے الفاظ کو ایک مرتبہ پھر ماہ رو کے چلے جانے کے بعد دہرایا بھی تھا۔

"ماہ رو کو تم دیورانی بنانا چاہتی ہو مگر کیسے؟" یہ سوال کرتے ہوئے اس کا دل اتنی شدت سے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی کے ابھی پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ ثنا کچھ حیران ہوئی تھی۔ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"عون عباس کو تم نے پاؤنڈ کر رکھا ہے۔ عاشر تو ہے نا... عون سے ذرا کم، مگر بے حد بجیلا' اتنا خوب صورت۔" ثنا نے ذرا بلند آواز میں اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ یوں کہ اندر آتا عون عباس لمحہ بھر کے لیے ٹھٹک گیا۔ ایک تو پورے کمرے میں ڈنبل ڈائمنڈ کی خوشبو چکرا رہی تھی۔ انتہائی روح پرور' دل میں اتر جانے والی۔ حواسوں پہ چھا جانے والی۔ اتنی مہنگی اور دلفریب خوشبو۔ عون عباس نے اندر آتے ہوئے ثنا کے کچھ الفاظ سن لیے تھے۔ پھر ان ہی کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"یہ عاشر کو کیوں مسکہ لگایا جارہا ہے؟"

"مسکہ تو سامنے لگاتے ہیں پیٹھ پیچھے نہیں' میں تو اپنی دیورانی کی سلیکشن کررہی ہوں۔" ثنا نے ذرا اترا کر بتایا تھا۔ عون عباس بھی ذرا متاثر ہوا۔

"اچھا... تو میں بھی سنوں... عاشر کی قسمت کہاں پھوٹنے کا ارادہ رکھتی ہے؟" اس کا انداز ذرا شرارتی تھا۔

"کرنی تو ہم نے تمہاری تھی... لیکن چونکہ تم پالنے میں فریحہ بنو سے منسوب ہوچکے تھے۔ اس لیے ہم نے عاشر کے لیے ماہ رو کو منتخب کرلیا ہے۔" ثنا نے برجستہ کہا تھا۔ عون عباس بیٹھتے ہوئے اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ چہرے پہ حیرانگی ہی حیرانگی تھی۔

"ماہ رو؟ وہی...؟" اس نے وہی کو اتنا لمبا کھینچا کہ ثنا کو اس کے کندھے پہ دھپ لگانی پڑی تھی۔

"کیا وہی ماہ رو؟ جو مل اونر کی بیٹی ہے۔ فریحہ کی بے ہودہ سہیلی... جینز پہ ٹاپ چڑھا کر فضول پھرتی ہے۔" عون کا موڈ خاصا بگڑ گیا تھا۔ ماہ رو کے بارے میں عون کے جذبات ملاحظہ کرکے اندر کہیں فریحہ کے من میں عجیب سا سکون اتر آیا تھا۔ گھر میں کوئی تو تھا جو ماہ رو کے متاثرین میں شامل نہیں تھا۔ اک گونا اطمینان نے فریحہ کی آنکھوں میں بسیرا کرلیا تھا۔

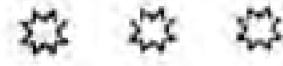
"چھوڑو بھی' اتنی تو حسین ہے... اور خوب صورت لوگوں کو سب کچھ پہننے کا حق ہے۔" مریم نے بے تکی سی بات کی تھی۔ عون عباس کی آنکھوں میں استہزا سا پھیل گیا۔

"خوب صورتی کا مطلب کیا یہ ہے آپ حسن کی تشہیر کے لیے فضول لباس پہن کر آوارہ پھریں۔" اس نے انتہائی تلخ لہجے میں جواب دیا تھا پھر فریحہ سے مخاطب ہوا۔

"تم اس سے میل جول ذرا کم ہی رکھو۔" خاص طور پر فریحہ کو تنبیہہ کرکے وہ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا تھا جبکہ بھابھیوں کے منہ اتر گئے تھے۔

"بڑا ہی زاہد خشک ہے۔ ورنہ ماہ رو کو دیکھ کر تو اچھے اچھے میرڈ حضرات کا بھی ایمان ڈول جائے۔ رات کو قاسم

بھی ماہ رو کی تعریف کر رہے تھے۔" ثنا کو نہ جانے کیا کچھ یاد آگیا تھا اور فریحہ کے دل اور ذہن سے جیسے منوں بوجھ اتر گیا۔ وہ تو یہ تک بھی بھول چکی تھی کہ ماہ رو کو کل صبح گیارہ بجے رحمان پلازہ جانا تھا اپنے لیے سوا لاکھ کا نیا موبائل لینے۔ بلاوجہ اور بے مقصد ہی۔



تایا نے اگلی صبح فریحہ سے بڑے پیار اور محبت سے ناشتا کرتے ہوئے کہا۔

"فریحہ! اب تم کالج مت جایا کرو۔ نوکری کا شوق تو پورا ہوا۔ ہم تمہاری شادی کا ارادہ رکھتے ہیں۔" فریحہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ تایا کا حکم نامہ سنا تھا اور پھر اندر جا کر چادر اور پرس اتار کر رکھ دیا اس کے خاندان میں بے ادبی یا نافرمانی کا کوئی رواج نہیں تھا۔ ایک دفعہ تایا نے اس کی بات مانی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے تایا کی بات مان لی۔ ویسے بھی گھر میں اس کی شادی کے تذکرے چل رہے تھے۔ تائی اور کائنات وغیرہ بہت پرجوش تھے۔ گھر میں پھر سے خوشی کے شادیانے بجنے والے تھے۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اور عون عباس بہت لاڈلا اور فرماں بردار بیٹا۔ دونوں کی شادی بہت دھوم دھام سے کرنے کا ارادہ تھا۔ ابا اور تایا بھی بہت خوش تھے۔ اور فریحہ کی امی تو جیسے شکر کر کے نہیں تھک رہی تھیں۔ اس رات امی نے ایک مرتبہ پھر اپنے خدشے کا اظہار کیا تھا۔

"میں تو ڈر رہی تھی فریحہ! تمہاری تائی' کائنات اور بہویں اس ماہ رو پہ فریفتہ ہو چکی تھیں مجھے خوف تھا شاید وہ لوگ رشتہ ہی نہ توڑ دیں۔ آخر ماہ رو کی چمک دمک کے سامنے تم کہاں ٹھہر سکتی ہو۔ میرا دل تو مانو بڑا بے قابو تھا' لیکن صد شکر کے بھابھی وغیرہ کی نیت نہیں بدلی۔" امی نے اسے سینے سے چمٹا لیا تھا۔ فریحہ نے سکون سے ان کے کندھے پہ سر رکھ لیا۔

"یہ ممکن تھا کیا امی! تایا اور تائی کی محبت اور نیت پہ کیوں شک کر رہی تھیں۔ وہ مجھ پہ کبھی کسی ماہ رو کو فوقیت نہیں دے سکتے۔ آپ فکر مت کریں۔ عون میرا ہے اور میرا ہی رہے گا۔" اس کی آواز مدہم ہو کر بالکل معدوم ہو گئی تھی۔ دل میں سکون ہی سکون تھا۔ وہاں کوئی بھی خدشہ ڈگمگا نہیں رہا تھا۔

"تو اور کیا۔۔۔ میں تو وہم میں پڑ گئی تھی۔ ماں ہوں نا کیا کروں؟ دل سوکھے پتے کی طرح کانپتا تھا۔ تم نے دیکھا نہیں۔۔۔ اس کے یہاں پھیرے اور چکر۔" امی کو اور بھی بہت کچھ یاد آ گیا۔

"وہ ہمیشہ عون کی غیر موجودگی میں آتی تھی۔ اب بھلا کیا خاص بات ہوئی؟" جو بھی تھا۔ ان کا وہم بے جا نہیں رہا تھا۔

"وہ ڈپریسڈ تھی امی! یہاں اس کا ماحول چینج ہو جاتا تھا۔" فریحہ نے اپنے خدشات کا ذکر کر کے ماں کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہا تھا۔

"مگر مجھے عون پہ پورا اعتماد ہے۔" اس کے لہجے میں تفاخر بول رہا تھا۔

"ہاں ماشاءاللہ۔ ہمارا عون ایسے ویسے کسی کو گھاس نہیں ڈالتا۔" امی نے جیسے غائبانہ عون عباس کی بلائیں لی تھیں۔

"ویسے یہ ماہ رو۔۔۔ اس کے انداز' مجھے کچھ کھٹک ضرور رہا تھا۔ جیسے کچھ ہونے والا تھا یا اس کے دل میں کچھ چھپا تھا۔" امی کو پھر تھوڑی دیر بعد خیال آگیا۔

"آپ وہم میں نہ پڑیں۔" فریحہ نے لاپروائی دکھائی۔

"تم بھی باہر نکلنا بند کرو اور ماہ رو سے رابطہ بھی۔" انہوں نے جیسے تنبیہہ کی تھی۔ فریحہ ذرا چونک گئی۔

"اتنا اچانک تو رابطہ ختم نہیں کر سکتی۔ ہاں شادی کے بعد نہیں رکھوں گی۔ امی! اچھا بھی تو نہیں لگتا۔ اتنے سالوں کا ساتھ ہے۔ پھر اس کی ثنا اور مریم سے بہت اٹیچ منٹ ہو چکی ہے۔ وہ لوگ بھی ماہ رو سے کانٹیکٹ میں ہیں۔" فریحہ نے اس نکتے کی طرف امی کی توجہ مبذول کروائی تھی۔

"چلو' اللہ بہتر کرے گا۔ تم پریشان مت ہو۔" انہوں نے فریحہ کی پیشانی چوم لی تھی۔

"آپ بھی عون کے حوالے سے پریشان مت

ہوں۔ وہ تایا کے لبوں سے نکلنے والے فرمان کو حکم کا درجہ سمجھتا ہے۔ تایا جو کہیں اس پہ آنکھ بند کر کے عمل کرتا ہے۔ کبھی اس نے تایا کے سامنے سر نہیں اٹھایا۔ وہ اسے کنویں میں کودنے کے لیے بھی کہیں گے تو وہ انکار نہیں کرے گا۔" فریحہ نے اطمینان سے آنکھیں موندلی تھیں۔ اس کے لہجے میں یقین بول رہا تھا اور اس کا یقین باطل نہیں تھا۔ واقعی ہی عون تایا کے سامنے سر نہیں اٹھاتا تھا۔ وہ اسے کنویں میں کودنے کے لیے کہتے اور وہ کود پڑتا۔ (کیونکہ عون عباس بہت شروع میں بہت سارے معاملات میں ہٹ دھرمیاں دکھانے کے اب اب سدھر چکا تھا) اور پھر وقت اسے اس انتہائی موڑ پر بھی لے آیا تھا جب فریحہ کا یقین باطل نہ ہوسکا اور عون عباس کو تایا کے کہنے پہ کنویں میں کود جانا پڑا۔ زہر سے بھرا جام لبوں سے لگانا پڑا۔



یہ بڑی چمکیلی سی شام تھی۔ کچھ کچھ گلابی اور رنگین بھی۔ ماہ رو آج بڑی ترنگ کے عالم میں تیار ہوئی تھی۔ اس نے سلیولیس شرٹ کے ساتھ بلیک ٹائٹس پہن رکھی تھی۔ لمبے حسین مشک بار بال کمر پہ جھول رہے تھے۔ میک اپ سے مبرا چہرہ دودھ سے دھلا اور گلاب سے تر تر لگتا تھا۔ اس کی بھیگی پلکیں اور لمبی گہری آنکھیں اس کے حسن کا مکمل سنگھار تھیں۔ سفید ملائم پیروں میں ہائی ہیل پھنسا کر جب وہ ایک خاص ترنگ میں نیچے آئی تو شازمہ نے اسے کچھ خاص ادا سے دیکھا تھا۔ آج شازمہ کو ماہ رو میں کچھ تبدیلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ جیسے وہ کسی خاص مقصد کے لیے جارہی تھی یا کسی خاص فرد سے ملنے کو جارہی تھی۔ ماہ رو اس کے قریب سے گزری تو شازمہ نے بے ساختہ اسے روک لیا تھا۔

"ماہ رو جان! کہاں کی تیاری ہے۔ آج کہیں خاص جارہی ہو؟"

"فریحہ کی طرف۔"

"اتنا رومانٹک تیار ہو کر؟" شازمہ کی معنی خیزیت میں دوستانہ قسم کا ایک دلنہ سا تھا۔ جس کی ہڑک میں وہ چکنی ہوئی بڑی آسانی سے پھنس سکتی تھی۔ شازمہ کو اناڑی عاشق کو گھیر لینے کے بڑے داؤ پیچ آتے تھے۔ سو ذرا سا تردد کرنا پڑا تھا۔ ماہ رو خود بخود رام ہوگئی تھی۔ پھر سچ تو یہ تھا ڈیڈی تک اپنی خواہش پہنچانے کے لیے اسے شازمہ کا سہارا تو درکار تھا۔ شازمہ کے بغیر بات آگے بڑھنا ناممکن تھی۔ اسے شازمہ کو اعتماد میں لینا ہی تھا۔ پھر ابھی کیوں نہیں؟ حالانکہ وہ سوچ رہی تھی ایک مرتبہ عون سے بات کرلے گی پھر ڈیڈی اور شازمہ کو بتائے گی۔ اسے امید تھی ڈیڈی ہلکے پھلکے اعتراض کے بعد مان ضرور جائیں گے۔ انہیں صرف عون عباس کے "کاروبار" پہ اعتراض ہوسکتا تھا' مگر عون پہ کبھی نہیں۔ اتنا یقین تو ماہ رو کو بھی تھا ہی۔ پھر تھوڑی سی پس و پیش کے بعد ماہ رو نے شازمہ کو عون عباس کی فیملی کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ یہ بھی کہ وہ فریحہ کا کزن ہے اور اس نے پہلی مرتبہ عون عباس کو رحمان پلازہ میں دیکھا تھا۔ شازمہ تو سن کر بڑی ایکسائٹڈ ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"مائی گاڈ! تمہارے ڈیڈی کو ایسا ہی داماد چاہیے۔ جو اپر مڈل کلاس سے ہو۔ تم سے دب کر رہے۔ اور تمہاری عزت کرے۔ تم نے اچھا ہاتھ مارا ہے ماہ رو۔" شازمہ کے تعریف بھرے انداز بھی اپنے جیسے ہی تھے۔ گو کہ وہ سر دھن رہی تھی اور ماہ رو کی پسند کو سراہ رہی تھی۔ پھر بھی ماہ رو کو بہت عجیب لگا تھا۔

"آپ کا کیا خیال ہے؟ ڈیڈی مان جائیں گے۔" ماہ رو نے کچھ متفکر انداز میں پوچھا تھا۔ اسے ڈیڈی کی طرف سے خاصے خدشات تھے۔

"تمہارے لیے من پسند رشتے کی تلاش میں سرفراز خاصا خوار ہوچکا ہے۔ آئی تھنک وہ مان جائے گا۔" شازمہ کے تسلی دینے والے انداز بھی جداگانہ قسم کے تھے۔ ماہ رو کی تسلی تو ہوگی۔ کیونکہ شازمہ جو کہہ دیتی تھی۔ ویسا ہو کر رہتا تھا۔

"تم عون عباس کی فکر کرو۔ اس سے کہو' اپنا

پرپوزل بھیجے۔ باقی کام میرے سپرد۔ دیکھنا' تمہارے ڈیڈی کو کیسے مناتی ہوں۔" شازمہ نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا تھا۔ گوکہ ان دونوں میں اچھے تعلقات کبھی نہیں رہے تھے پھر بھی ماہ رو کو اپنا رویہ کچھ اور بدل کے تعلقات بہتر بنانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ کیونکہ فیوچر قریب میں اسے شازمہ کی کافی خدمات حاصل کرنا تھیں۔ ماہ رو بہت اطمینان کے ساتھ سارا بوجھ سر سے اتار کر عون عباس سے ملنے جارہی تھی۔

یہ ملنا موبائل خریدنے کے بہانے سے تھا۔ اسے امید تھی' اس ملاقات سے اگلی ملاقات تک وہ اپنا حال دل عون عباس تک پہنچادے گی۔ اس کے بعد فریحہ کو اعتماد میں لے گی۔

اس کے ارادے بہت ٹھوس اور مستحکم تھے۔ اسے اپنی نیت اور محبت پر پورا اعتماد تھا۔ ماہ رو کو یقین تھا اس کی محبت کبھی ٹھکرائی نہیں جائے گی۔

ماہ رو کو بااعتماد قدموں سے باہر جاتا دیکھ کر شازیہ بڑی ادا سے مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ جس کو سمجھنا ماہ رو جیسے اناڑیوں کا کام نہیں تھا۔



رحمان پلازہ کی ٹھنڈی پلاسٹر آف پیرس کی چھت تلے چلنا بڑا دشوار قسم کا کام تھا۔ دل پہ عجیب گھبراہٹ سوار تھی۔ ہتھیلیوں میں بار بار نمی سی اتر آتی۔ چہرہ انتہائی گرم اور سرخ ہو رہا تھا۔ جیسے آگ کی لپیٹیں اٹھ رہی تھیں۔

ماہ رو کا ایک دفعہ تو دل چاہا الٹے قدموں واپس پلٹ جائے لیکن پھر اس کا ازلی اعتماد عود آیا تھا۔ گوکہ اس نے فریحہ کو ساتھ لانے کی بہت کوشش کی تھی لیکن فریحہ فون پہ مل کے نہیں دی رہی تھی۔ گھر پہ جانا اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔

پھر کچھ سوچ کر خود ہی پل صراط تک آگئی۔ جب چلنا خود تھا اور جلنا بھی خود تھا تو پھر کسی سہارے کو کیوں تلاش کرتی؟

آدھا گھنٹا بے مقصد اوپر نیچے گھومنے کے بعد بالآخر اس نے ایک سیل بوائے سے عون عباس کے بارے میں پوچھ ہی لیا تھا۔ اس لڑکے نے اسے سیکنڈ فلور کا بتایا۔ دل کڑا کر کے ماہ رو سیکنڈ فلور پر آگئی تھی۔ یہ بھی جگمگاتا فلور تھا۔ ساری مشینری' الیکٹرونکس کے سامان سے بھرا ہوا۔ یہاں بھی بلا کا رش تھا۔ اور لوگ دھڑا دھڑ جہیز پیکیجز خرید رہے تھے۔ کیونکہ آج کل شادیوں کا سیزن تھا۔

ایک طرف کمپیوٹرز' لیپ ٹاپ' اور موبائل وغیرہ شو ریکس میں سجے تھے۔ وہیں کارنر پہ خوب صورت ریوالونگ چیئر پہ عون عباس بیٹھا دکھائی دے گیا تھا۔

اس کے سامنے لیپ ٹاپ کھلا ہوا تھا۔ نیلگوں روشنی کا عکس اس کے مغرور وجیہہ چہرے کو روشن کر رہا تھا۔ وہ اپنے کام میں بے انتہا منہمک تھا۔ جیسے اسے اردگرد کی پروا نہیں تھی۔

ماہ رو جیسے لمحوں میں تھم گئی تھی۔ پھر بے خودی سی عون عباس کو دیکھے گئی۔

یہ محبت بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ ماہ رو جیسوں کو بے بس کر دیتی تھی۔ بھکاری بنا دیتی ہے۔ آخر یہ محبت کیا بلا ہے؟

اس قدر لاچار کر کے پبلک پلیس پہ ماہ رو جیسی پارہ صفت کو' نہ آگے بڑھنے دے' نہ پیچھے ہٹنے دے۔ یہ محبت آخر کیا ہے؟

یہ دل کی آواز تھی۔ جس نے یہاں سے وہاں تک کا سفر با آسانی کر لیا تھا۔ اور کسی کی آگ آگ نگاہوں کی گرمی آگ' حدت اور تپش نے عون عباس کو گردن گھمادینے پر مجبور کر دیا تھا۔

کسی میکانکی کیفیت میں وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور پھر تھم گیا۔ کیا اس کے دل پہ کوئی واردات ہوئی تھی؟ یا پھر ماہ رو کے عشق کی گرمی نے مقناطیس کی طرح عون عباس کے دل کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی تھی؟ جو بھی تھا۔ عون عباس نے نادانستہ کسی اور ہی گیان و دھیان میں بلا ارادہ اپنے دل کے مقام پر لمحہ بھر کے لیے ہاتھ ضرور رکھا تھا۔

گویا وہ تھم گیا تھا۔ ایک طوفان تلے آنے سے بچ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ دیر پہلے اچانک اتر آنے والے زلزلے کے آثار تک نہیں رہے تھے۔ وہ لمحوں میں سنبھل گیا تھا۔ وہ لمحوں میں بدل گیا تھا۔

کچھ دیر پہلے ماہ رو نے اس کی آنکھوں اور چہرے پہ الوہی رنگ اترتے دیکھے تھے۔ لیکن اس وقت وہ وجیہہ چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ انتہائی سخت' روڈ' اجنبی اور بیگانہ۔ یوں جیسے پہچانتا ہی نہ ہو۔

ماہ رو کو چلتے چلتے اور کاؤنٹر تک جاتے جاتے چکر سے آگئے تھے۔ وہ اسے دھیان سے دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے قطرہ قطرہ دل میں اتارنا چاہتی تھی۔

ماہ رو کو یاد تھا اور اسے آج بھی یاد تھا۔

اس وقت عون عباس نے بلیک ٹو پیس پہن رکھا تھا۔ اس کی شرٹ کا اوپری بٹن کھلا تھا۔ اس نے بڑے اہتمام سے شیو بنا رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر تازہ شیو کی نیلاہٹیں بہت واضح تھیں۔ اس کی رنگت انتہائی سرخ اور انتہائی سفید تھی۔ اور آنکھیں سیاہ آسمانوں جیسی۔ اتنی وسیع اور بہت گہری۔ ماہ رو کا دل ڈوبا اور پھر کبھی ابھر نہ سکا۔ عمر بھر کے لیے ڈوب گیا۔ رنگین سی آنکھوں کا اسیر ہو گیا۔ ماہ رو کو یاد تھا۔ آج بھی یاد تھا۔

وہ موبائل فون خریدنے کے لیے عون عباس کے قریب گئی تھی اور اپنا متاع دل بیچ آئی۔ اپنی انا' وقار اور عزت نفس بیچ آئی۔ وہ خود کو پورا پورا نیلام کر آئی۔

گو کہ اس نے موبائل فون خریدنے کے لیے ہی عون عباس سے کلام کیا تھا۔ وہ پورا گھنٹا موبائل فون کا بہانہ بنا کر عون عباس سے کلام کرنا چاہتی تھی۔ گفتگو کو طویل کرنا چاہتی تھی۔ اور اپنا مدعا بیان کرنا چاہتی تھی۔ اپنا حال دل سنانا چاہتی تھی۔

لیکن کچھ بھی نہ کر سکی۔ کھڑی کھڑی بس ساکت رہ گئی تھی۔ اور وہ اس کی انا اور غرور کو پیر تلے روند کر چلا گیا تھا۔ جاتے وقت اس نے اپنے بھائی عاشر سے محض اتنا کہا تھا۔

''میڈم کو ان کی پسند کا فون دکھا دو۔''

اس نے مزید کچھ بھی نہیں کہا۔ اس سے بیوپار تک کی بات بھی نہیں کی۔ کلام تک گوارا نہیں کیا۔ وہ اسے ایک کسٹمر جتنی اہمیت دیے بغیر ایسے گیا کہ لوٹ کر نہ آیا۔ وہ پون گھنٹہ کھڑی رہی۔ ڈیڑھ گھنٹا پورے پلازہ میں بے مقصد گھومتی رہی۔ دو گھنٹے گاڑی میں جلتی رہی۔ چار گھنٹے محض اندر کی آگ اور تپش کو بجھانے کی خاطر سڑکوں کو روندتی رہی۔ اور اگلے چوبیس گھنٹے لگاتار روتی رہی۔ روتی رہی۔ صرف اتنی سی بات پر کہ عون عباس نے اسے ایک کسٹمر جتنی بھی اہمیت نہیں دی تھی۔

اس نے نیا خریدا ہوا موبائل پرزے پرزے کر کے ہواؤں کے سپرد کیا اور اسٹرینگ وہیل پر سر رکھے رات بھر دیوانوں کی طرح روتی رہی۔ روتی رہی۔ عالم جنون میں روتی رہی۔

ہم سے کیسے درد کے قصے
ہم سے کیسے رنج کی بات
ہم پر بیتے کیا کیا موسم
تنہا دل' لاکھوں آفات

کسی نے کہا اور سچ ہی کہا تھا۔ صرف ماہ رو سرفراز کے لیے کہا تھا۔

''محبت جنہیں یاد کرتی ہے' انہیں سدا سفر میں دوڑاتے پھرتی ہے' محبت صرف جوگ ہے۔'' اور واقعی محبت صرف جوگ تھی۔ اور محبت صرف روگ تھی۔ وہ جان گئی تھی۔ اس پر برسات کے موسم اتر رہے تھے۔ دل ٹوٹ کے ہارا تھا۔ دل درد کا مارا تھا۔

کہیں چین نہیں تھا۔ کہیں امان نہیں تھی۔ آگ تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ جیسے دنوں میں سودائی ہو۔ پرائی ہو۔ وہ تو اکلوتی سہیلی فریحہ کے اندر اترتے موسموں سے بھی انجان اور بیگانہ تھی۔ دل نے بھیس کیا بدلا وہ ساری دنیا سے خفا اور ناراض ہو گئی۔

دوسری طرف فریحہ کو بھی چین کہیں نہیں تھا۔ گھر بھر میں شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہر طرف

ہنگامے اور رونقیں تھیں لیکن فریحہ کے من سے چین کا پنچھی نجانے اڑ کر کہاں چلا گیا تھا؟ اتنی دور گیا کہ لوٹا ہی نا۔ وہ سارا دن بولائی بولائی غمگین پھرا کرتی تھی۔

"تائی' امی اور بھابھیاں ان دنوں جہیز اور بری جمع کررہی تھیں۔ وہ گھر میں کم کم ہی دکھائی دیتیں۔ اس دن بھی فریحہ اکیلی تھی۔ اور بہت ہی اکیلی تھی۔

بوگن ویلیا کے پھولوں کو چنتی جانے کیوں وہ ماہ رو کو ان دنوں اتنا تسلسل سے یاد کررہی تھی۔ وہ ماہ رو جس کی بہت دن سے کوئی کال نہیں آئی تھی۔ نہ اس نے خود چکر لگایا تھا۔ جانے ماہ رو کس حال میں تھی؟ فریحہ کا دل جیسے جیسے شادی کے دن قریب آرہے تھے بجھتا جارہا تھا۔

وہ اس وقت بھی بے چینی سے ماہ رو کو سوچ رہی تھی۔ وہ اتنی اچانک ہی آئی تھی اور اتنی اچانک ہی چلی جاتی تھی۔ شاید واپس ابراڈ چلی گئی تھی۔ بنا بتائے۔ بغیر اطلاع کے۔ اور فریحہ نے بھی تو ماہ رو کو شادی کی اطلاع نہیں دی تھی۔ جانے کیوں امی نے اسے منع کردیا تھا۔ ان کے وہی پرانے وہم اور وسوسے۔

وہ سر جھکائے پتی پتی اٹھا رہی تھی جب اچانک قدموں کی چاپ پہ سر اٹھا کر دیکھنے لگی۔ سامنے عون عباس کھڑا تھا۔ ویسا ہی مکمل' شاندار اور دلوں کو دھڑ دھڑ دھڑکانے والا۔ کافی کلر کے سوٹ میں آج بھی اتنا ہی تابناک اور عالی شان تھا۔

فریحہ کا دل بھر بھر آیا۔

اس گھر میں فریحہ کی عون سے بہت دوستی تھی۔ بچپن سے لے کر اب تک۔ وہ دونوں اپنی بہت سی باتیں ایک دوسرے سے شیئر کرتے تھے۔

وہ اپنی یونی ورسٹی کے قصے اسے سناتا تھا۔ فریحہ دن بھر کی گوسپ اس کے گوش گزار کرتی تھی۔ جب وہ بڑے ہوئے تو پسندیدگی کچھ اور قربتوں میں ڈھل گئی۔ چونکہ والدین کی خواہش تھی سو دونوں نے کوئی بھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ ایک رشتہ جڑا اور بندھ گیا۔

نہ تو عون عباس کا کوئی آئیڈیل تھا۔ نہ اس نے ایسی نگاہ سے کسی لڑکی کو دیکھنا چاہا تھا۔ گو کہ یونی ورسٹی میں بہت سی لڑکیاں محبت کا ہاتھ بڑھا کرتا کام لوٹی تھیں۔ وہ ہمیشہ محبت کے معاملے میں کورا ہی رہا تھا۔ بس جو والدین نے پسند کیا اس کو پسند کرلیا۔ اس پہ شکر کیا۔

کبھی نہ اپنی مرضی چلائی نہ پسند کے نام پہ والدین کو شرمندہ کیا۔ زندگی کے کلی اختیار والدین کو تھما کر مطمئن ہوگیا تھا۔ (کم از کم لڑکی پسند کرنے کے معاملے میں اس نے اپنے باپ سے کوئی اختلاف نہیں کیا تھا)

فریحہ عام سی تھی۔ سادہ تھی' خوب صورت نہیں تھی۔ جو بھی تھا۔ اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ہاں سب سے بڑی بات اس کے والدین کی پسند ضرور تھی۔ سو اس کی بھی پسند بن گئی۔

فریحہ کی سادگی' شرافت' وقار اور سیرت نے عون عباس کے لیے پسندیدگی اور چاہت کے سارے در خود بخود وا کردیے تھے۔ پھر پیچھے رہ کیا جاتا تھا؟ محبت؟ جو شادی کے بعد خود بخود دلوں میں اتر جاتی ہے۔ اور اس وقت بھی فریحہ کے انتہائی سادہ اور زرد چہرے کو دیکھ کر وہ شوخ ہونے کی بجائے کچھ متفکر ہوگیا تھا۔ فریحہ بھی اسے دیکھ کر کچھ گھبرا گئی تھی۔ آج کافی دنوں بعد سامنا ہوا تھا۔

"یہ تم نے بھوک ہڑتال کیوں کررکھی ہے؟" اس نے متفکر انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔ فریحہ کچھ اور گھبرا گئی تھی۔

"نہیں تو۔"

"پھر اتنا زرد کیوں ہوتی جارہی ہو؟ کیا تمہیں شادی کے بعد کوہ قاف جانا ہے؟ بس ایک کمرہ بدلنا ہے۔" اس نے اب کی دفعہ ذرا مسکرا کر ہلکے پھلکے انداز میں کہا تھا۔

"میں نے کچھ غلط کہا؟"

"نہیں تو۔" فریحہ نے سابقہ الفاظ ہی دوہرا دیے۔

"پھر کھاتی پیتی کیوں نہیں؟ اتنی اپ سیٹ کیوں ہو؟" وہ نرمی سے استفسار کررہا تھا۔ فریحہ کے دل کو ڈھارس سی پہنچی تھی۔ اس نے تھوک نگل کر بتایا۔

"کھاتی تو ہوں۔ ایسے ہی دل گھبراتا ہے۔" اپنے

دھیان میں اس نے دھیمی آواز میں کہہ دیا تھا۔ عون کے ہونٹوں پر تبسم سا بکھر گیا۔

"اوہ۔ اچھا' تو معاملہ دل کا ہے۔ میں تو کچھ اور ہی سمجھ رہا تھا۔" اس نے شرارتی انداز میں کہا۔

"تم کیا سمجھ رہے تھے؟" وہ ذرا گھبرا گئی تھی۔

"کچھ نہیں۔ میں تو معدے کا معاملہ سمجھ رہا تھا۔ کھانا پینا جو چھوڑ رکھا ہے۔ سوچا تمہیں ڈاکٹر کو دکھا دوں۔" اس کی شرارت ہنوز برقرار تھی۔

"ایسی بات نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ بس ماہ رو کو سوچ رہی تھی۔" بلا ارادہ ہی ایک فضول بات اس کے منہ سے اچانک پھسل گئی۔ بھلا یہاں ماہ رو کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ امی ہوتیں تو اسے اچھی طرح بتاتیں۔ کیا فریحہ سا بے وقوف اور احمق بھی کوئی اور تھا؟

"ماہ رو۔؟" عون کی پیشانی پہ نامعلوم سی سلوٹ ابھر آئی تھی۔ وہ اس کے پلازہ میں آئی تھی۔ موبائل لینے' اور اس کے انداز' اس کا چہرہ' اس کی آنکھیں۔ اف' ابھی تک اس کا اپنا دل کانوں میں دھڑک رہا تھا۔ ایک مرد ہو کر اس کی ایسی کیفیت تھی۔

وہ آنکھیں۔ ان آنکھوں کے رنگ' حکایتیں' کہانیاں۔ افسانے' کچھ پیغام دیتے نئے راز۔ عون عباس کو لگا اگر وہ دوسری بھی غیر ارادی نگاہ ڈال گیا تو سرتاپا پگھل جائے گا۔ ان آنکھوں کے سمندر میں ڈوب جائے گا۔ بہہ جائے گا۔ کبھی ابھر نہ سکے گا۔ کیسی افسانوی آنکھیں تھیں۔؟ اور کیسے رومانوی تاثر تھے۔

تب اس نے آنکھوں کے رخ موڑ لیے تھے۔ وہ ڈوبنا نہیں چاہتا تھا۔

اور وہ ان قاتل آنکھوں کے "سم" سے بچ بچا کر باحفاظت فریحہ کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

اور اس وقت فریحہ اسی سہیلی کا ذکر چھیڑ رہی تھی جس پہ ایک نگاہ نے اس کے زمان و مکان گھما ڈالے تھے۔ صرف ایک ہی غیر ارادی اچٹتی سی نگاہ کا اتنا سا کمال تھا۔ اور یہ "کمال" کیا کم تھا؟ اور کیا واقعی ہی کم تھا؟

"وہ موبائل لینے آئی تھی۔" عون عباس کو بتانا ہی پڑا۔ فریحہ ٹھٹک گئی تھی۔ تو کیا واقعی ہی ماہ رو وہاں تک پہنچ گئی۔؟ اس کے خدشات بے بنیاد نہیں تھے۔ وہ ٹٹولتی نگاہوں سے عین سامنے کھڑے عون کا چہرہ دیکھتی رہی تھی۔ جیسے کسی انہونی کا راز پانا چاہتی ہو۔ لیکن اسے عون کے چہرے سے کچھ نہیں ملا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔

"تم نے ماہ رو کو کیسا پایا؟" فریحہ کے منہ سے بے ساختہ پھسل گیا۔ اسے گمان نہیں یقین تھا کہ عون عباس دو ٹوک الفاظ میں بس اتنی سی تشریح کرے گا۔ "انتہائی فضول۔" وہ ہمیشہ یہی کہتا آرہا تھا۔

عون اس کے سوال پر لمحہ بھر کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ وہ فریحہ کو کیا جواب دے؟ اس نے ماہ رو کو کیسے' کس طرح سے پایا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہی عکس لہرا گیا۔

عون عباس بھلا فریحہ کو کیا بتاتا؟ اس نے ماہ رو کو اب کی دفعہ کتنا عجیب اور مختلف پایا تھا۔ ادھر فریحہ جیسے جواب کی غرض سے الرٹ کھڑی تھی۔ جواب لیتے ہی اطمینان کی بانسری بجاتی اندر چلی جاتی۔ عون لمحہ بھر کے لیے سوچتا رہا۔ پھر باہر کی طرف نکلتے ہوئے محض اتنا سا بولا۔

"سر پھری۔"

☼ ☼ ☼

وہ تین دن بخار میں پھنکتی رہی۔ تین دن اسے کسی چیز کا ہوش نہیں رہا تھا۔ تین دن اس نے عون عباس کی اتنی معمولی سی "بے اعتنائی" کا سوگ منایا تھا۔ اور اگر کبھی وہ سچ مچ جان بوجھ کر بے اعتنائی برتتا تو وہ ماہ رو کا حال کیا ہوتا؟ وہ مرجاتی کیا؟ اس کی سانسیں بند ہوجاتیں۔

پچھلے تین دن سے وہ کمرے میں بند پڑی تھی۔ ہوش و خرد سے بیگانہ تھی۔ اور پچھلے تین دن میں ہی اسے ادراک ہوا تھا۔ وہ اپنے ڈیڈی کے لیے کس قدر قیمتی تھی۔ کس قدر انمول تھی۔ اور اس کے ڈیڈی

کسی اذیت میں مبتلا تھے۔ اسے تکلیف میں تڑپتا دیکھ کر کتنے بے چین تھے۔

اور شازمہ بھی خاصی متفکر دکھائی دیتی تھی۔ جیسے ہی ڈیڈی بیڈ روم سے نکلے وہ لپک کر اس کے قریب آگئی تھی۔ پھر بہانے بہانے سے وہ عون کے بارے میں کریدتی رہی۔ جس ذکر سے ماہ رو بچنا چاہتی تھی وہی باربار ساعتوں میں اتر رہا تھا۔ عون عباس کے نام پر اس کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ شازمہ جیسے خود بخود سمجھ گئی تھی۔ مزید اس نے کریدا نہیں تھا۔ لیکن اتنا ضرور کہا۔

"اتنی آسانی سے ہار ماننے والے بزدل ہوتے ہیں۔ محبت اور جنگ میں سب جائز مانا جاتا ہے۔" اس نے جیسے ماہ رو کو ایک نئی راہ دکھانی چاہی تھی۔

اور ماہ رو ہر اس راہ کی طرف لپک سکتی تھی جو اسے عون عباس تک پہنچانے کا رستہ دکھاتی۔ اسے منزل تک لے جاتی۔

شازمہ نے اسے اکسایا تھا وہ بستر پہ بزدلوں کی طرح مت پڑے بلکہ ہمت اور بہادری کی نئی مثال قائم کرتے ہوئے عون عباس کی زندگی کے رخ موڑ دے۔

جو بھی تھا شازمہ کی باتوں نے ماہ رو کے اندر ایک نئی زندگی کی لہر دوڑا دی تھی۔

وہ پہلے ہی مقام پہ دل ہار کے بستر پر پڑ چکی تھی۔ اسے اٹھنا ہی تھا۔ اور اپنے حصے کی خوشیوں کو وصول کرنا ہی تھا۔

کیا تھا اگر وہ تھوڑی سی عزت نفس کو ایک طرف رکھ کر بذات خود عون سے بات کر لیتی۔ وہ اسے بتا دیتی۔ کیسے اور کس طرح سے ماہ رو پہلی نگاہ کی محبت سے گھائل ہوئی تھی۔ اور وہ کس طرح سے بے دھڑک اس کے دل کی سلطنت کا مالک مختار بن گیا تھا۔

ماہ رو' شازمہ کے مجبور کرنے پہ ایک مرتبہ پھر رحمان پلازہ کی وسیع وعریض بلڈنگ کے نیچے اور اوپر ہر فلور پر گھوم رہی تھی۔

اسے آج بھی عون کا سامنا کرنے پر دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ عون کے سامنے کس طرح

سے جائے گی؟ اور کس طرح سے اعتراف محبت کرے گی۔

گو کہ وہ بہت بولڈ تھی۔ بہت ماڈ تھی۔ بہت حاضر جواب تھی۔ لیکن مقابل بھی تو عون تھا۔ اسے سوچ و سمجھ کر اپنا اعتراف محبت اس کی سماعتوں میں اتارنا تھا۔

آج سیل بوائے اسے عون اور اس کے والد' چچا کے مشترکہ دفتر تک لے گیا تھا۔ اس کی خوش نصیبی کے سوا اور کیا تھا جو عون اسے دفتر میں اکیلا مل گیا۔ وہ کمپیوٹر پہ الیکٹرونکس مصنوعات کے نئے نئے ماڈل دیکھ رہا تھا۔

ڈبل ڈائمنڈ کے روح میں اتر جانے والے خوشنما جھونکے کو محسوس کر کے ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھا اور لحہ بھر کے لیے بھونچکارہ گیا تھا۔

سامنے فریحہ کی وہی سرپھری سہیلی کھڑی تھی۔ ویسی ہی دلفریب' معطر اور تروتازہ۔ لیکن وہ یہاں آئی کیوں تھی؟ اگر موبائل کی کوئی شکایت تھی تو موبائل کاؤنٹر پہ جاتی۔ وہیں مسئلہ لکھواتی۔ موبائل واپس کرتی۔ وہ یہاں اس دفتر میں کیوں آئی تھی؟

عون عباس کا میٹر جیسے لحہ بھر میں ہی گھوم گیا تھا۔ اس کی تیوریاں سی چڑھ گئیں۔ ماتھے پہ بل آگئے۔ غصے میں س کی رنگت سرخ پڑ گئی تھی پھر بھی وہ خاصے تحمل اور ضبط کے ساتھ بولا تھا۔

"یہاں کیوں آئی ہیں؟ موبائل میں کوئی مسئلہ تھا تو باہر بتاتیں۔" اس نے محض فریحہ کی خاطر بہت تہذیب اور شائستگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ورنہ ایسی ویسی لسوڑا بنتی لڑکیوں کو تو منٹوں میں وہ سیدھا کر کے ان کی عقل ٹھکانے لگا دیتا تھا مگر اس وقت بڑے ضبط سے کھڑا تھا۔

"موبائل ٹھیک ہے۔" وہ بتا نہیں سکی تھی موبائل تو اسی روز ماہ رو نے پرزہ پرزہ کر دیا تھا۔

"تو پھر؟" عون نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ وہ جلد از جلد اس سے پیچھا چھڑوانا چاہتا تھا۔

ماہ رو جیسے تذبذب کا شکار ہو گئی تھی۔ وہ کیسے بات کرے؟ کس طرح سے کہے؟ لیکن اسے کہنا تو تھا۔ بولنا تو تھا۔ وہ جس مقصد کے لیے آئی تھی اسے کیسے ادھورا چھوڑ کے جاتی۔

"مجھے تم سے کچھ بات کرنی تھی۔" بالآخر ماہ رو نے اپنے ازلی اعتماد کا سہارا لیا تھا۔ اس کی توقع کے مطابق اسے بے انتہا اچنبھا ہوا۔

"کیا؟" وہ اس انداز میں کھڑا ہو گیا تھا جیسے بات سنتے ہی بھاگ کھڑا ہو گا۔ کم از کم اس کے انداز سے یہی لگ رہا تھا۔

"مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے عباس! آئی ریئلی لو یو۔ میں تم سے سچا پیار کرتی ہوں۔" ماہ رو نے اتنے آرام سے یہ الفاظ کہے تھے جیسے کہہ رہی تھی۔ "مجھے نزلہ ہو گیا ہے۔ جس کی دوائی چاہیے۔"

سامنے کھڑا عون عباس تو بھونچکا رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں ہی نہیں پورا وجود پتھرا گیا تھا۔ اسے گویا اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اتنا سرد پن ابھر کر سامنے آیا جسے دیکھ کر لحہ بھر کے لیے اس کی ریڑھ کی ہڈی تک سنسنا اٹھی تھی۔ وہ پہلے برف کی طرح سرد ہوا تھا پھر آگ کی طرح جیسے بھڑک اٹھا۔

لیکن ماہ رو اپنے ہی دھیان میں شان بے نیازی سے بولتی جا رہی تھی۔ جیسے یونی ورسٹی میں بے تکان بولتی تھی۔ جیسے ڈیڈی کے سامنے بولتی تھی۔ اس کا انداز وہی تھا۔ شاہانہ' کچھ مغرورانہ۔ شان بے نیازانہ۔ وہ بڑی ترنگ اور موڈ میں اعتراف محبت کر رہی تھی۔ اسے اپنی وہ تمام فیلنگز بتا رہی تھی جو ماہ رو نے محسوس کی تھیں۔ وہ آنسو بھی جو اس کی بے اعتنائی پہ بہتے تھے۔

ماہ رو تین منٹ کے اندر اندر بہت جذب کے عالم میں بڑی دلیری کے ساتھ اپنی حکایت دل سنا چکی تھی۔ پھر جب وہ خاموش ہوئی تو عون کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اتنا تعجب' غصہ اور زہر تھا ماہ رو جیسے لحہ بھر کے لیے سن ہو گئی تھی۔

اس کے خاموش ہوتے ہی وہ گہرے کاٹ دار زہریلے لہجے میں دھیمی آواز کے ساتھ پھنکارا تھا۔

"کچھ رہ گیا ہے یا اور.....؟" اس کے لہجے اور آواز میں آگ کی حدت سے بڑھ کر گرماہٹ تھی۔ پہلی مرتبہ اتنا روانی سے بولنے کے بعد ماہ رو کچھ گڑبڑائی تھی۔ اسے عون کے تیور کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ اس کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ گیا تھا۔

عون دو قدم چل کر آبنوسی دروازے تک پہنچا تھا پھر اس نے ہینڈل گھما کر ڈور کھول دیا تھا۔ پھر اس نے زہر خند لہجے میں غضبناک تیور کے ساتھ کہا۔

"گو۔" اس کا لہجہ سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی۔ عون غصے میں تھا۔ اور عون بے انتہا غصے میں تھا۔ ماہ رو کو یوں لگا اگر وہ ایک منٹ بھی وہاں رکتی تو زندہ حالت میں کبھی اپنے گھر نہ لوٹتی۔ اس کے لیے عون کا رویہ سمجھنا بہت دشوار تھا۔ وہ اتنی حسین، عالی شان ماہ رو کے منہ سے اظہار محبت سن کر بجائے خوش ہونے کے آگ بگولا کیوں ہو گیا تھا۔

اگر وہ کسی عام شخص کی سماعتوں میں یہ سب انڈیلتی تو شاید اس کا مارے خوشی سے ہارٹ اٹیک ہو جاتا۔ لیکن عون عباس کا رویہ بہت حیران کن تھا۔ بہت تکلیف دہ تھا۔ بہت توہین آمیز تھا۔ ماہ رو جیسے سجھ کر رو پڑی تھی۔ پھر وہ منہ پر ہاتھ رکھے روتی رہی۔ روتی رہی۔ ایک مرتبہ پھر وہ رحمان پلازہ سے روتی ہوئی نکل رہی تھی۔ اور اس کے پیچھے عون عباس کا پھنکارتا نفرت سے بھرا عکس بھی ساتھ آرہا تھا۔ آج ایک مرتبہ پھر اس کو ٹھوکر لگی تھی اور بڑی زور کی ٹھوکر لگی تھی۔ اس کی محبت کو عون عباس کے ایک لفظ "گو" نے دھتکار دیا تھا۔ ٹھکرا دیا تھا۔

وہ شازمہ کے کہنے پر اپنی عزت نفس کو مجروح کر کے زخم زخم سی جا رہی تھی۔ اس حال میں کہ اس کے بال بکھر رہے تھے۔ چہرہ آنسوؤں سے تر بتر تھا۔

یہ تو عون عباس تھا۔ جس کی نفرت اور زہر کو شان سے وصول کر کے وہ شکستہ دل، بکھرے حواسوں اور ٹوٹ پڑتی رنجیدگی کے ساتھ واپس جا رہی تھی۔

دل پر چوٹ پڑی تو اسے اذیت کے ہر رنگ سے آشنائی بھی ہو گئی تھی۔ اسے پارکنگ کی طرف جانا تھا۔ لیکن وہ فٹ پاتھ پہ چل رہی تھی۔ ویسے ہی دیوانوں کی طرح۔ اس کے لمبے ریشم جیسے بال اڑ اڑ کر اس کے منہ پر پڑ رہے تھے۔ اسے چلتے چلتے کئی مرتبہ ٹھوکر لگی تھی۔ کئی مرتبہ وہ زمین پر گرتے گرتے بچی تھی۔ اسے عون کا رویہ بھولتا ہی نہیں تھا۔ اس کا غصے سے بھرا چہرہ، زہریلے تاثرات۔ لہجے میں پھنکارتا ہوا "گو"۔

کوئی ایسے بھی کرتا ہے؟ کوئی محبت کی اس قدر توہین کرتا ہے؟ وہ محبت، جو چل کر اس کے قریب آئی تھی۔ اس کے قدموں میں گری تھی۔ اپنا آپ حقیر کیا تھا۔ اس قدر ارزاں کیا تھا۔ اور اس نے بدلے میں کیا کیا؟ ایک ہی ٹھوکر میں دھتکار دیا۔ ٹھکرا دیا۔ اسے چلتے چلتے پھر سے ٹھوکر لگی۔ وہ گرتے گرتے بمشکل بچی تھی۔ اس کے پیچھے کوئی آواز دے رہا تھا۔ کوئی بھاگ کر آرہا تھا۔ "ماہ رو' ماہ رو" پکار رہا تھا۔ اور ماہ رو پیچھے مڑ کر آنے والے کو دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

کیا وہ آواز عون عباس کی تھی؟ یا ایک الوژن؟ وہ آتی جاتی کربناک ہواؤں سے پوچھ رہی تھی۔

(باقی آئندہ)

مکمل ناول

نایاب جیلانی

دل ٹوٹ کے ہارا تھا

دوسری قسط

"جذبات کا اظہار انسان کو بے وقعت کر دیتا ہے۔" کوئی اس کے کان پاس چلایا تھا۔ اس نے بے ساختہ اپنے دونوں ہاتھ کانوں پہ رکھ لیے تھے۔ وہ اس وقت کوئی بھی آواز سننا نہیں چاہتی تھی۔

"اور جذبات کا اظہار عزت نفس کی موت ہے۔" کسی نے پھر سے اس کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ لیا تھا۔ اب کہ وہ چلا بھی نہیں سکی تھی۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ جذبات کا اظہار عزت نفس کی موت تھی۔ اور وہ خود اپنے ہاتھ سے اپنی عزت نفس کو پھانسی چڑھا آئی تھی۔ خود کو عون عباس کی نگاہوں میں دو کوڑی کا کر آئی تھی۔

اس کے پیچھے اب بھی آوازوں کا شور تھا۔ اور کوئی اب بھی اس کے پیچھے بھاگا بھاگا آ رہا تھا۔ ماہ رو بلند آواز میں روتے روتے جیسے تھم گئی تھی۔ معاً" کسی نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر چیختے ہوئے کہا تھا۔

"ماہ! یہ تم ہو ماہ! کہاں بھاگی جا رہی ہو؟ تم نے یہ اپنی حالت کیا بنا رکھی ہے؟ تمہیں کیا ہوا؟" وہ ماہم تھی۔ اس کی سہیلی۔ فریحہ سے کچھ زیادہ' اس کے بے انتہا قریب۔ اور اس وقت ماہ رو کی "حالت" کو دیکھ کر شاکڈ ہو رہی تھی۔

سرخ انگارہ دھلی ہوئی آنکھیں۔ بھیگی پلکیں، شدت ضبط سے سرخ پڑتا چہرہ۔ کانپتے ہونٹ' کپکپاتا وجود۔ وہ تو ماہ رو سرفراز نہیں کوئی ژولیدہ حال شکستہ دل بھکارن لگ رہی تھی۔ ماہم جیسے دھک سے رہ گئی تھی۔

"ماہ رو! تمہیں کیا ہو گیا؟" اس کا منہ بھی کھل گیا تھا آنکھیں پھٹ پڑی تھیں۔ اور ماہ رو جیسے اتنے دن اکیلے' تنہا ہر اذیت کا بوجھ سہہ سہہ کر تنگ آ چکی تھی۔ تھک چکی تھی۔

اس کے دل پہ بہت بوجھ تھا۔ اسے اپنے دل کو اس بوجھ سے آزاد کرنا تھا۔ وہ فٹ پاتھ پہ ہی ماہم کے گلے سے لگی اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔ ماہم کچھ اور بوکھلا گئی تھی۔ آخر کیا ہوا تھا؟ ماہ رو کو اس کے ابراڈ جانے کے دوران ماہ رو پہ کیا کچھ بیت گیا تھا اسے خبر ہی نہیں ہو سکی تھی۔

"مجھے روگ لگ گیا ہے۔" ماہ رو نے کتنی ہی دیر بعد بمشکل سنبھل کر جواب دیا تھا۔ ماہم کچھ اور ہکا بکا ہو گئی تھی۔ آخر یہ ماہ رو کس قسم کی باتیں کر رہی تھی۔

"کیسا روگ؟ اور یہ تم کیسی عجیب باتیں کر رہی ہو۔؟" ماہم نے بوکھلا کر دوبارہ پوچھا۔

عون عباس کی وہ دھیمی سلگتی چنگھاڑ میں کہا گیا لفظ "گو" اس کی روح کو دہکتے کوئلوں پہ گھسیٹ رہا تھا۔ آفس کا دروازہ کھول کر ماہ رو کو باہر نکل جانے کا اشارہ کرنا۔ وہ عمر بھر چاہتی بھی تو اس ذلت اور صدمے کو نہیں بھلا سکتی تھی۔ وہ اس کی زندگی کا پہلا کرش تھا۔ کبھی نہ بھولنے والا۔ کیا وہ سمجھ رہا تھا۔ ماہ رو کوئی کریکٹر لیس بگڑی ہوئی امیرزادی تھی۔ جو محبت کے نام پر۔ اسے لبھانے آئی تھی۔ اس کی شاندار پرسنالٹی پہ مرمٹ گئی تھی۔

کیا ماہ رو نے خوب صورت مرد نہیں دیکھے تھے؟ کیا عون عباس دنیا کا پہلا اور آخری خوب صورت مرد تھا؟

ہرگز نہیں۔ قطعاً" نہیں۔ ماہ رو نے اپنی زندگی میں بہت سحر طراز چہرے بھی دیکھے تھے۔ لیکن کوئی اسے اس طرح اسیر نہیں کر سکا تھا۔ کوئی اسے دیوانگی کی اس حد تک نہیں لا سکا تھا۔

یوں عون عباس وہ پہلا اور آخر کا مرد تھا جس سے ماہ رو سرفراز نے محبت کی تھی۔ ایسی محبت جو اسے شاہانہ انداز میں رسوا کر رہی تھی۔

جب وہ ماہم کو اپنے دل پر گزرنے والی حکایت کی داستان سنا رہی تھی تب بہت آرام سے ساری رام کہانی سننے کے بعد ماہم نے ماہ رو سے کہا تھا۔

"میں تمہیں اتنا بزدل نہیں سمجھتی تھی۔" اس نے نہایت تاسف کا اظہار کیا۔ وہ بولی تو بس اتنا ہی۔

"کوئی آپ کے پیار کو ریجیکٹ کر دے۔ آپ کو دھتکار دے۔ تو کیا کرنا چاہیے۔" ماہ رو نے ٹوٹے



پھوٹے لفظ لبوں سے ادا کیے تھے۔ اس کا لہجہ نہایت دھیما اور پرسوز قسم کا تھا۔

"کم از کم شکست تسلیم کر کے تمہاری طرح رونا نہیں چاہیے۔" ماہم کا انداز سابقہ ہی تھا۔ ہنوز خفگی میں لپٹا۔ وہ اس کے رونے دھونے پر سخت مشتعل ہوئی تھی۔ کوئی اتنا بھی کم ہمت اور بزدل ہوتا ہے؟ ماہم اس کی جگہ ہوتی تو کم از کم اس کی عقل ضرور ٹھکانے لگا کر آتی؟ کوئی اتنا احمق اور اندھا بھی ہو سکتا ہے "؟" جو ماہ رو جیسی لڑکی کو ٹھکرا دے۔ ماہم کو یقین ہی نہ آیا۔

"تو؟" ماہ رو نے ہونق پن سے گہری افسردگی بھری سانس خارج کرتے ہوئے کہا تھا۔

"تو یہ کہ ڈفر پرنسز! اس فولش ٹائپ فیز سے نکلو۔ خود کو فریش کرو۔ بحال کرو' تم ماہ رو سرفراز ہو۔ ڈنکے کی چوٹ پہ محبت کرنے والی۔ تمہیں گھٹ گھٹ کر مرنے کی ضرورت نہیں۔ تم اسے چاہتی ہو۔ کیا اس کے لیے "یہ اعزاز کیا کم ہے؟ مل اونر سرفراز احمد کی بیٹی اسے چاہتی ہے۔

کیا مڈل کلاس لڑکیوں کی طرح آنسو بہا رہی ہو۔ اس نے تمہیں ایک سنائی تھی۔ تم دس سناتیں۔ اور محبت کرتیں ببانگ دہل۔ وہ مانتا یا نہ مانتا' چاہتا یا نہ چاہتا۔ لیکن اسے ہماری ماہ رو کو رلانے کا کوئی حق نہیں تھا۔" ماہم ایک ہی سانس میں متواتر بولتی چلی گئی تھی۔ ماہ رو نے ایک گھٹا گھٹا سانس کھینچ کر باہر نکالا۔

"کیا یہ ممکن تھا؟" اس کے لہجے اور آواز میں مایوسی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ماہم نے تنک کر کہا۔

"کچھ بھی ناممکن نہیں۔ اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔ آسمان اس پرندے کا نہیں ہوتا۔ جس کے پر بڑے ہوتے ہیں۔ بلکہ آسمان اس پرندے کا ہوتا ہے۔ جس میں قوت پرواز ہو۔" ماہم کا انداز گہرا ناصحانہ تھا۔ تحریک دلانے والا۔ حوصلہ بلند کرنے والا۔ ماہ رو کو اپنے اندر ایک نئی روح اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ایسی تو نہیں تھی۔ پہلی ٹھوکر پر ہی اٹھ نہ سکتی۔ ایک مرتبہ پھر محبت کا کشکول لے کر عون عباس کے پاس نہ جاتی بلکہ پورے استحقاق سے محبت وصول کرتی۔

زبردستی' اعلانیہ' ڈنکے کی چوٹ پہ' اپنی ہمت کے بل بوتے پہ۔ ماہم نے اس کے اندر مرجھائے اعتماد اور اس کی ول پاور کو پالش کر دیا تھا۔

"تم ریفائن منٹ اسکوائر میں عون عباس کی زندگی میں تہلکہ مچا سکتی ہو۔ اس کے غرور' اکڑ' نخوت اور میں کو توڑ سکتی ہو۔ اس کے اعتماد کو ڈیس ٹرائڈ (تہس نہس) کر سکتی ہو۔ اور تمہیں ایسا کرنا ہوگا۔ اس کا بی ہیویئر تمہارے لیے انسلٹنگ تھا۔ بے انتہا انسلٹنگ' کیا سوچ کر اس نے تمہاری توہین کی۔ تمہیں ڈی گریڈ کیا۔ اسے بدلے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔" ماہم کا لہجہ بے حد روکھا اور روڈلی قسم کا تھا۔ جس میں عون عباس کے لیے ذرا بھی نرمی کی گنجائش نہیں تھی۔

ماہ رو کا دل جیسے رک رک کر چلنے لگا۔ دھڑک دھڑک کر رکنے لگا۔

"پلیز نہیں۔ میں عباس کو تکلیف نہیں دے سکتی۔" اس نے ماہم کے بدلے والے آپشن کو ریجیکٹ کر دیا تھا۔ ہاں وہ اپنی محبت پانے کے لیے ہر حد سے گزر سکتی تھی۔ اور آخری سانس تک اسٹرگل کر سکتی تھی۔ اتنا پوچھنے کا حق تو محفوظ رکھتی تھی۔ وہ اسے ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ صدا دے کر روکے گی۔ اسے مڑنے پہ مجبور کرے گی۔ ماہم اس کے تاثرات دیکھ رہی تھی جہاں نئی امید اور حوصلہ جگمگاتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اس کا ایک ایک تاثر پڑھ رہی تھی۔ پھر گہرا سانس کھینچ کر سر جھٹکتے ہوئے بولی۔

"خاصی ٹف اسائنمنٹ ہے ماہ رو! مجھے امید ہے تم اسے حل کر سکتی ہو۔" وہ اس کا گال تھپتھپا کر مسکرا رہی تھی۔

"کیا تم نے سنا نہیں' جب حسن تقریر کرنے لگتا ہے تو بڑے بڑے زبردست فصیح مقرر گونگے ہو جاتے ہیں۔" ماہم نے بڑے انداز میں بڑے کام کا فلسفہ جھاڑا تھا۔ وہ ابراڈ سے آکر خاصی سمجھدار ہو گئی تھی۔ ماہ رو کو مانتے ہی بنی۔

"تو اس کا مطلب ہے۔؟" ماہ رو کی آنکھوں میں

چمک بڑھ گئی تھی۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص ارادے کا پکا ہو وہ دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔" ماہم نے اس کا کندھا بھی تھپتھپا دیا تھا۔ اس کے اندر ایک امید' ایک تحریک رواں ہو گئی تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے ملنے والی ذلت کو بھول گئی تھی۔

اسے عون عباس کو ہر قیمت پر پانا تھا۔ چاہے دل جاتا یا چاہے جان بھی چلی جاتی۔

خلیل جبران نے ٹھیک کہا تھا۔ بالکل ٹھیک کہا تھا۔

"محبت طویل قربتوں کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ وحی کی طرح کسی لمحے میں ہمارے دلوں میں اتر جاتی ہے۔"

محبت کوئی الہامی طاقت تھی جو خدا کی طرف سے دلوں میں پیوست ہو جاتی اور عمر بھر کے لیے اپنا ٹھکانا بنا لیتی۔ کبھی نہ نکلنے کے لیے کبھی نہ چھوڑنے کے لیے۔ اس نے محبت کا ان دنوں فلسفہ اور نصاب پڑھنا شروع کیا تو جانے کون کون سے انکشافات کے در وا ہوئے تھے۔ اس کا جی چاہتا۔ وہ دن بھر محبت کے پھول کاڑھے اور رات بھی اس کی ردا اوڑھ کر سوتی رہے۔ کتنی مٹھاس تھی اس لفظ محبت میں۔

گو کہ محبت کتنی آنکھوں کے آنسو پیتی ہے' پھر بھی یہ کھاری بدذائقہ نہیں ہوتی۔ لوگ اسے امرت سمجھ کر پی لیتے ہیں۔ جیسے اس نے امرت سمجھ کر محبت کے جام کو پی لیا تھا۔ اور اب ایک بے سکونی تھی۔ جو رات دن گھیر میں لیے پھرتی تھی۔ لیکن اس بے چینی کے گھیر میں ایسا لطف تھا۔ ایسا مزہ تھا جو اس مدار کو عمر بھر چھوڑنے کی ہمت نہ کرتی۔ ہمیشہ اسی مدار میں رہتی۔

ان دنوں ماہ رو کی ساری بیرونی سرگرمیاں ٹھپ پڑی تھیں۔ وہ باقاعدہ کلب جایا کرتی تھی۔ ایکسر سائز کرتی تھی۔ جم جوائن کر رکھا تھا۔ اسپورٹس میں فٹنس کے لیے حصہ لیتی تھی۔ لیکن آج کل ہر ایکٹیویٹی سے ناطہ توڑ رکھا تھا۔ اس کا پورا وقت ماہم کے ساتھ گزر رہا تھا۔ ماہم کے آجانے سے وہ ترو تازہ ہو گئی تھی۔ اس دن لان میں ٹینس کھیلتے ہوئے ماہم کو اچانک فریحہ کا خیال آگیا۔

"تمہاری وہ سو کالڈ فرینڈ کہاں ہے آج کل؟ کافی دنوں سے اس کا ذکر نہیں سنا۔ ورنہ تم تو فریحہ نامہ کھول بیٹھو تو بند ہی نہیں کرتیں۔" ماہم نے ریکٹ ہوا میں اچھالتے ہوئے اچانک پوچھا تھا۔ ماہ رو کو بھی فریحہ کے ساتھ ایک ستم گر بھی یاد آگیا تھا۔ گو کہ ماہم جانتی تھی کہ عون عباس فریحہ کا کزن ہے تاہم وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ لوگ اکٹھے رہتے ہیں۔

"میں نے کال پہ کافی دفعہ ٹرائی کیا ہے۔ وہاں کوئی کال پک نہیں کرتا۔ ایک دن ملازمہ نے اٹھایا تھا۔ فریحہ لوگ کچھ خاص مصروفیت میں ہیں۔ میں نے تفصیل نہیں پوچھی تھی۔ گھر اس لیے نہیں جاتی۔ عباس کی فیملی بھی وہیں ہوتی ہے۔ ان کا جوائنٹ فیملی سسٹم ہے۔ میں نہیں چاہتی' عباس سے دوبارہ سامنا ہو۔" ماہ رو نے ایک افسردہ سانس فضا کے سپرد کرتے ہوئے آرام سے بتایا تھا۔ وہ ماتھے پہ بندھا بینڈ اتار کر لان چیئر پہ ڈھے گئی تھی۔ ماہم بھی ریکٹ گھاس پہ لڑھکا کے ٹیبل تک آئی۔ فریش جوس گلاسوں میں ڈال کر اس نے ماہ رو کے سامنے نشست سنبھال لی تھی۔

"ایک مرتبہ پھر کی تم نے بزدلوں والی بات۔" ماہم نے اسے بے ساختہ ٹوکا تھا۔

"تو کیا منہ اٹھا کر اس کے گھر جاتی رہوں۔ بغیر کسی بہانے کے۔ جبکہ فریحہ میرے لاکھ کہنے پہ بھی یہاں نہیں آتی۔" ماہ رو نے اس کا بڑھایا ہوا جوس کا گلاس پکڑ لیا تھا۔

"اوہ ہوں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرا یہ مطلب بھی نہیں تھا۔ اینی وے' فریحہ کو چھوڑو۔ اس کے کزن تک آؤ۔ عباس کا کوئی کانٹیکٹ نمبر ہے؟"

"نہیں۔" ماہ رو مایوسی سی بولی۔ ماہم جیسے چیخ پڑی تھی۔

"کانٹیکٹ نمبر بھی نہیں؟ فریحہ کے گھر گھاس چرنے جاتی رہی ہو؟ بہانے سے عباس کا نمبر تو اڑا لیتی۔ حد ہے یار! یہ انیس سو ساٹھ والی محبت کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔" ماہم نے اسے آنا" فانا" سٹارڈ کر رکھ دیا تھا۔

"فریحہ سے کس طرح مانگتی؟ تم بھی نا۔ اور ویسے بھی میں عباس کی غیر موجودگی میں جاتی تھی۔" ماہ رو نے خفگی سے بتایا تھا۔

"اس کی بہن سے لیتی۔ کیا نام ہے؟ کائنات۔" اس نے سوچ کر جھٹ سے کہا تھا۔ ماہ رو نے اسے گھور کر دیکھا۔

"تاکہ اس کی فیملی میں سب کو شک ہو جاتا۔" اسے یاہم کی عقل پہ تاؤ آیا تھا۔ بڑا کمال کا مشورہ دے رہی تھی۔

"او مائی گڈ نیس تم کس صدی میں اچانک پلٹ گئیں ماہ رو سرفراز! یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ یہ خط اور رقعہ بازی کا زمانہ نہیں۔ انٹرنیٹ کا جدید دور ہے۔ جو کام زبان نہیں کرتی، وہ موبائل کرتا ہے۔ ایک ایس ایم ایس پوری قیامت اٹھاتا ہے۔ جو کام زبان سے لے رہی تھیں۔ وہ موبائل سے لیتیں۔ آخر پتھر میں سوراخ ہو ہی جاتا۔ کالز، مسیجز، چیٹ، وہ کب تک اوائڈ کر سکتا تھا؟" ماہم نے ایک مرتبہ پھر اسے بری طرح لتاڑ دیا تھا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" ماہ رو نے تسلیم کر لیا۔ "ویسے ایک بات تو بتاؤ۔ محبت میں پہل کس کو کرنی چاہیے۔ مرد یا عورت؟" بڑے دنوں سے کلبلاتا ایک سوال وہ ماہم سے پوچھ بیٹھی تھی۔ کیونکہ وہ خود سے زیادہ ماہم کو عقل مند سمجھتی تھی۔ کچھ دیر کے بعد ماہم سوچ میں پڑ گئی۔

"ان فیکٹ، مرد کو۔ عورت کو نہیں۔ بٹ تمہاری سچویشن الگ ہے۔ تم ون سائیڈڈ کا شکار ہو۔ یہاں تمہیں پہل کرنا چاہیے تھی۔ تاکہ دوسری طرف کے اموشنز تک رسائی حاصل ہو جاتی۔ سو تم گلٹی فیل مت کرو۔" ماہم نے اسے اپنی سمجھ کے مطابق سمجھایا تھا۔ ماہ رو بھی کچھ مطمئن ہو گئی۔ ان کی سوسائٹی میں اظہار محبت ٹائپ چیزیں معیوب نہیں سمجھی جاتی تھیں۔ یہ ایک عام روٹین ورک تھا۔ کسی سے پیار ہونا، شادی کرنا اور پھر طلاق کی خبر بھی سن لینا۔

"و کبھی کبھی میں گلٹ فیل کرتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے عون عباس ایسا بندہ نہیں تھا۔ جسے کوئی بھی منہ اٹھا کر آئی لو یو بول دیتا۔ میں اس کے لیے انجان تھی۔ ہم ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں تھے۔ پھر میں نے اچانک ایک ایسی بات کہی جو اس کے تصور میں ہی نہیں تھی۔ آئی تھنک میں نے ایک مناسب بات کو ایک غیر مناسب سچویشن میں بے مول کر کے ناکارہ کر دیا ہے۔ میں اپنے لفظوں کی قیمت کھو چکی ہوں۔" ماہ رو نے افسردگی بھرے لہجے میں اپنے اندرونی خیالات اور بے چینی کی گانٹھ کھولی تھی۔

"یو ڈونٹ وری، تم الٹا سیدھا کچھ مت سوچو۔ جو تم نے کیا بہتر کیا۔ اس تک اپنے خالص جذبے پہنچا دیے۔ وہ عقل مند ہوا تو ان کی قدر کرے گا۔ پذیرائی کرے گا۔ ویسے بھی تم اس سے محبت کرتی ہو۔ وہ تو انجان ہے۔ کیونکہ اس کے جذبات تمہارے لیے ایسے نہیں۔ عباس کو الہام تو ہونا نہیں تھا۔ تم بتاتی تو اسے پتا چلتا۔ اگر انیس سو ساٹھ کی ہیروئن بنی رہتیں تو وہ کسی اور کو ڈولی میں بٹھا کر گھر لے آتا۔ اور تم دل میں عباس کو بسا کر کسی بزنس مین کے روز و شب تباہ کرتیں۔ میرے نزدیک تو یہ صاف رگنگ ہے۔ انتہائی دہرا پن۔ کھلی منافقت۔ شفاف دھوکا۔" ماہم نے جوس کا گلاس خالی کر کے ہاتھ جھاڑ لیے تھے۔ اس نے حتی المقدور ماہ رو کے اندر سے گلٹ اکھاڑنے کی کوشش کی تھی۔

"تم نے سنا نہیں۔ کسی ایسی خواہش کے پیچھے بھاگنا فضول ہے۔ جس کے نہ پورا ہونے کا گمان ہو۔ لیکن کسی ایسی خواہش کے پیچھے بھاگنا سود مند ہے۔ جس کے پورا ہونے کا قوی یقین ہو۔" ماہم نے ایک مرتبہ پھر اس کا شانہ تھپتھپا کر امید دلائی تھی۔ ماہ رو کے ہونٹوں پہ بھولی بسری مسکان اتر آئی۔

"ماہم! یو آر گریٹ! مجھے یقین آ گیا۔ کامیابیاں حوصلوں سے ملتی ہیں۔ حوصلے دوستوں سے ملتے ہیں اور دوست مقدروں سے ملتے ہیں۔ اور مقدر انسان خود بناتا ہے۔" اس کے اندر تروتازگی کی لہر پھیل رہی تھی۔ یہ امید صبح جمال تھی۔ جس کے طلوع ہونے پہ

سویرا ہر سو سنہرا پن بکھیر دیتا ہے۔ روشنی کرنوں کو بھی جگمگاتی ہے۔



آج شام کو مایوں کی رسم تھی۔ گھر میں مہمانوں کی چہل پہل سے خوب رونق کا سماں تھا۔ اس کی کچھ کزنز نے تو ڈھولکی منگوا کر رکھ لی تھی۔ ہر روز ڈھولک پر گانوں کی پریکٹس ہوتی تھی۔ عامر' یاسر' عاشر بھی شریک ہوجاتے۔ پھر اتنا ہنگامہ بپا ہوتا کہ حد نہیں۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ مہمانوں کے آنے سے گھر سچ مچ شادی والا گھر لگنے لگا تھا۔ ایک دم مصروفیت بڑھ چکی تھی۔ فریحہ کو ان دنوں کاموں سے آزادی تھی۔ سو وہ بور ہو ہو کر تھک چکی تھی۔ تائی اور امی اسے کچن میں بھی نہیں جانے دیتی تھیں۔ کزنز سب کائنات کے ساتھ مل کر یا تو اپنا حسن نکھارتیں یا لڈو کھیلتیں یا شطرنج کی بساط بچھ جاتی اور یا پھر گانوں پہ تانیں لگائی جاتیں تھیں۔ غرض ان میں سے کسی کے پاس بھی فریحہ کے لیے وقت نہیں تھا۔ ان دنوں اسے شدت سے ماہ رو یاد آرہی تھی گو کہ ماہ رو کی بہت سی فرینڈز تھیں تاہم فریحہ نے صرف ماہ رو کو ہی اپنا دوست بنایا تھا۔ ان کی دوستی کا ایک اصول یہ بھی تھا کہ وہ دونوں ہی اپنے گھر اور گھریلو باتوں کو ڈسکس نہیں کرتی تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں اتنا کچھ نہیں جانتی تھیں۔ فریحہ کو ماہ رو کے بارے میں اتنا پتا تھا کہ وہ ایک بڑے مل اونر کی اکلوتی بیٹی تھی' بہت شوخ مزاج' کچھ نخریلی' مغرور اور ہلے گلے کی شوقین اور ماہ رو کو ہمیشہ سنجیدہ مزاج فریحہ کو اپنے دل کے قریب لگی تھی۔

اسے یاد تھا جب پہلی مرتبہ فریحہ ماہ رو کو گھر لے کے آئی تھی پورا گھرانہ اسے دیکھنے کے لیے اکٹھا ہو گیا تھا۔ کائنات اور اس کی بھابھیاں تو ماہ رو کے نام کی مالا جپتی تھیں۔ حتیٰ کہ تائی اور تایا بھی ماہ رو سے بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ ان چند دنوں میں ہی ماہ رو ان کے گھر میں مقبول ہو گئی تھی۔ جب وہ نہیں آتی تو ثنا' مریم اور کائنات فریحہ کا سر کھالیتی تھیں۔ تب پہلی مرتبہ فریحہ کو اس کی امی نے ماہ رو کو یہاں بلانے پہ ٹوک دیا تھا۔ وہ تب امی کی بات میں اتری گہرائی کو سمجھ نہیں پائی تھی' لیکن جب ماہ رو کا اس گھر کے چند افراد سے التفات معنی خیز حد تک بڑھ گیا تھا تب فریحہ کی امی نے اسے بے انتہا گھرک کر منع کیا۔

"ماہ رو کو یہاں مت لایا کرو۔ میں نے تمہیں کتنی مرتبہ سمجھایا ہے۔" امی کا لہجہ دبا دبا غصیلا تھا۔ جیسے وہ بہت پہلے ہی آنے والے برے وقت کی آہٹیں پاچکی تھیں۔ تب تک فریحہ کو بھی ماہ رو کا یہاں اس قدر تسلسل سے آنا جانا کھٹک گیا تھا۔ وہ خود اس صورت حال پر گھبرانے لگی تھی۔ کیونکہ ماہ رو کا التفات تایا کی فیملی سے دن بدن بڑھتا جارہا تھا۔

"امی! میں اسے نہیں بلاتی۔ وہ خود ہی بہانے سے آجاتی ہے۔ شاید وہ اپنے گھر کی تنہائی سے تنگ آچکی ہے۔ اسے یہاں اپنائیت بھرا ہلے گلے والا ماحول ملتا ہے شاید اسی لیے۔۔۔" وہ چاہ کر بھی منفی خیالات کو اپنے دماغ میں جگہ نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ امی کے وسوسوں کو اپنے دل میں نہیں گھسانا چاہتی تھی۔ امی نے اس کی بات سن کر ترشی سے کہا۔

"امیروں کو تنہائی کی کیا پروا۔۔۔ جب چاہا' باہر نکلے گھومے پھرے' ہوٹلنگ' شاپنگ کی اور دن گزار لیا۔" ان کا موڈ خراب تھا۔ "سہیلی تمہاری اور بہناپہ ان کے ساتھ۔"

"وہ میرے توسط سے تو آتی ہے۔" فریحہ منمنائی تھی۔

"آخر پہلے کیوں نہیں آتی تھی؟" امی کا انداز سوچتا ہوا کچھ کچھ طنزیہ قسم کا تھا اور یہاں پہ ماہ رو کے لیے اس کی ساری وکالت دھری کی دھری رہ جاتی تھی۔ فریحہ حیران ہوتی تھی۔ واقعی ماہ رو پہلے کبھی اتنی ضد کر کے کیوں نہیں اس کے گھر آتی تھی؟ آخر اس دن ہوا کیا تھا؟ اس بھری دھوپ میں کون سی ایسی مقناطیسی کشش تھی جب ماہ رو ان سب کے ساتھ برج' فیشن زون' آوٹ فٹ اور رحمان پلازہ میں خوار ہونے کے

باوجود گھر چلی آئی تھی۔ وہ بھی بضد اصرار۔ بہت شوق اور چاہ میں۔

اگر فریحہ پچھلے کچھ عرصے پہ نگاہ دوڑاتی اور اس دھوپ بھری دوپہر کو یادداشت کے ہر کونے سے کھنگال کر سامنے لاتی تو اسے اس بھری دوپہر میں ماہ رو کے بدلتے انداز اور چہرے میں کچھ غیر معمولی پن ضرور دکھائی دیا تھا۔ ہاں تب فریحہ نے محسوس نہیں کیا تھا۔ غور بھی نہیں کیا تھا۔ حالانکہ تب گھر آتے ہوئے وہ زبردستی اسے ڈراپ کرنے آئی تھی اور برابر اس کے بارے میں چھوٹی سے چھوٹی بات کرید رہی تھی حالانکہ پہلے ایسا ہرگز نہیں تھا۔ اس نے تو کبھی یہ پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا کہ فریحہ کے بہن بھائی کتنے ہیں؟ پھر اچانک ماہ رو کو کیا ہوا؟

لیکن وہ اچانک بھی نہیں تھا۔ ماہ رو برج، فیشن زون اور آؤٹ فٹر سے لے کر رحمانی پلازہ پہنچنے تک بے زار دکھائی دی تھی۔

لیکن یہ بے زاری اسی وقت ختم بھی ہوگئی جب..... جب؟ اور جب فریحہ کو اپنے رحمان پلازہ آنے کی وضاحت دینا پڑی تھی۔ کیے وضاحت دینا پڑی تھی؟ یہ تو کچھ بھی ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ رحمان پلازہ میں اسے ڈانٹنے اور سخت سست سنانے کی جرات کرنے والا صرف عون عباس تھا۔ جسے اپنے گھر کی خواتین کا پلازہ میں آنا کبھی گوارا نہیں ہوتا تھا۔ اور اس چھوٹی سی جھڑپ کے بعد عون چلا گیا تھا جب تک وہ وہاں رہا تھا اس کی ماہ رو والی سائیڈ طرف پشت تھی۔ ہاں بڑے بڑے خوب صورت آئینوں میں عکس ضرور واضح ہوتا تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد ماہ رو کے ساتھ جو بھی ہوا وہ حیران کن تھا۔ ماہ رو کی بے زاریت ختم ہوگئی تھی۔ اس کا اتنی گرمی میں ان سب کے ساتھ معمولی شاپنگ کا حصہ بننا اور اس بات پہ غصہ کرنا بھی ختم ہوگیا تھا۔ ماہ رو کے موڈ میں واضح تبدیلی آئی تھی۔ اس تبدیلی کو سمیرا اور ہما وغیرہ نے محسوس نہیں کیا تھا بلکہ اس وقت فریحہ نے بھی محسوس نہیں کیا تھا۔

لیکن آج اپنی مایوں سے پہلے اس ستاروں بھری شام میں وہ بے دریغ ماہ رو کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کے ایک ایک بدلے انداز کو اس کے ایک ایک سابقہ انداز کو۔ وہ پہلے اور اب والی ماہ رو کا تقابلی جائزہ لے رہی تھی۔ اس میں کہاں کہاں بدلاؤ آیا تھا؟ وہ سوچتی رہی، سوچتی رہی اور ایک دم جیسے شاکڈ رہ گئی۔ ماہ رو تو سراپا بدل چکی تھی۔ وہ پہلے والی غرور کا مرقع بنی ماہ رو سے کس قدر مختلف ہوچکی تھی جو فریحہ کے گھر میں اس کی عام سی کزنز اور بھابیوں میں بیٹھ کر معمولی گوسپ پہ خوش ہوتی تھی اور قہقہے لگاتی تھی۔ آخر کیوں؟ کس لیے؟ اس کے "بدلاؤ" کی وجہ کیا تھی؟ فریحہ کا سوچ کی اس انتہا پہ جیسے دل بند ہونے لگا تھا۔

وہ اس وقت کوئی بھی منفی بات سوچنا نہیں چاہتی تھی، لیکن کچھ تو تھا جو من کو بے قراری کے پھیر میں گھبرانے پہ مجبور کررہا تھا۔ پھر جب فریحہ نے مایوں کا لباس زیب تن کرلیا اور تائی اس کی بلائیں لیتی اچانک کچھ یاد آنے پہ چونک گئی تھیں۔ انہیں ویسے اچانک خیال ہرگز نہیں آیا تھا وہ تین چار مرتبہ پہلے بھی پوچھ چکی تھیں۔

"فری! تم نے ماہ رو کو نہیں بلایا....؟ وہ کیوں نہیں آرہی.... اس کا نمبر بھی بند ہے۔ وہ ٹھیک تو ہے نا....؟"

جس قدر ماہ رو اس گھر میں تیزی کے ساتھ اپنی جگہ بناتی مقبول ہوگئی تھی سو اس کا اچانک بلاوجہ ہی تعلق ختم کرلینا سب کے لیے اچنبھے کا باعث تھا اور تائی تو کچھ زیادہ ہی ماہ رو کے لیے کانشس ہورہی تھیں۔

"میں نے بھی کال کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا نمبر بند ہے۔" فریحہ کو بھی یہی بہانہ سوجھا تھا۔ وہ بتا نہیں سکی تھی کہ امی نے اس سے بات چیت کرنے سے منع کررکھا ہے۔

"تو پھر تم عاشر کے ساتھ جاکر خود شادی کا کارڈ دے آتیں۔ اتنی پیاری تو بچی ہے۔ کیسے ہم میں گھل مل گئی تھی۔ ذرا بھی نخریلی نہیں.... دیکھو تو دل خود بخود خوش ہوجائے۔ ماشاء اللہ ایسی موہنی صورت کہ نظر نہ ہٹے.... یہ کائنات وغیرہ کا تو اس پہ دل آگیا تھا۔ میں بھی

چاہتی تھی کہ عاشر سے۔۔۔" وہ بولتے بولتے اچانک امی کی مداخلت پہ لحہ بھر کے لیے رک گئی تھیں۔ ورنہ وہ روانی میں ضرور کہہ جاتیں کہ ان کا ارادہ عاشر کے لیے اس کا رشتہ مانگنے کا تھا۔ امی بھی ان کی ادھوری بات کا مفہوم سمجھ گئی تھیں۔

"وہ تو باہر چلی گئی بھابھی! امیر لوگ ہیں آج ادھر تو کل سیر و تفریح کے لیے ملک سے باہر۔ اسی لیے رابطہ بھی منقطع ہے۔ پہلے پہل تو وہ باہر سے بھی کال کر لیتی تھی۔ جانے زیادہ مصروف نہ ہو۔" امی کے بروقت ٹھوس قسم کے بہانے پہ فریحہ لحہ بھر کے لیے چپ سی کر گئی تھی۔ امی کا یہ جھوٹ اگر کھل جاتا؟ ماہ رو آج ہی اگر اچانک آجاتی؟ کیونکہ وہ فریحہ کے گھر ہمیشہ اچانک ہی آتی تھی۔ اگر اسے سمیرا وغیرہ فریحہ کی شادی کے متعلق بتا دیتیں تو وہ ماہ رو کو نہ بلانے کا کیا جواز پیش کرتی؟

"اور بھابھی! کہاں ماہ رو' مل اونر کی بیٹی اور کہاں ہم درمیانے درجے کے کاروباری لوگ۔ بھلا ہمارا اور ماہ رو کی فیملی کا کیا مقابلہ۔ اچھا کیا آپ نے عاشر کا رشتہ مانگ کر بات نہیں گنوائی۔ بھلا ماہ رو کا ہمارے ساتھ کوئی جوڑ بنتا ہے؟ اس کا باپ تو دو ٹوک انکار کر دیتا۔ یہ تو چھوٹا منہ اور بڑی بات والا معاملہ ہو جانا تھا۔" امی اپنی بیٹی کے لیے ڈھال بننے کی کوشش میں اپنے ماں ہونے کا پورا پورا حق نبھا رہی تھیں۔

"میرے عاشر میں بھلا کیا کمی ہے؟ وہ تو خود ہی چھری تلے نہیں آرہا۔ اتنے رشتے آرہے ہیں۔ وہ مانتا ہی نہیں جانے کہاں دل اٹکا رکھا ہے۔ کچھ بھاپ بھی نکالے تو تب نا۔" تائی کچھ آبدیدہ سی ہو گئی تھیں۔ کیونکہ عاشر کا معاملہ ہمیشہ کھٹائی میں رہا تھا۔ لاکھ فرمانبرداری کے باوجود وہ ہرگز بھی شادی کے لیے نہیں مان رہا تھا۔ نہ اپنی پسند بتاتا تھا' نہ ان کی پسند پہ حامی بھرتا تھا۔ بس ایک ہی بات کہتا۔

"آپ عون کی شادی کر دیں۔۔۔ میں اس کے بچوں کا چاچا بن کر ہی خوش ہوتا رہوں گا۔" جانے اس کے من میں کیا تھا۔ اور اس وقت عاشر کی اچانک آمد نے تائی کو ماہ رو کو بلانے والے موضوع سے ہٹا دیا تھا۔ فریحہ نے دل ہی دل میں سکھ کا سانس لیا۔

"یہ میرے خلاف کیا پروپیگنڈا ہو رہا ہے؟" فریحہ پہ ایک اچٹتی نگاہ ڈال کر وہ ماں سے مخاطب ہوا۔ جو اسے دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھر کے رہ گئی تھیں۔ کیا تھا اگر وہ شادی کے لیے مان جاتا۔

"تائی تمہیں بھی قربان کرنے کا سوچ رہی ہیں۔" فریحہ نے مسکرا کر ماحول کی کثافت کم کرنا چاہی تھی۔

"میں تو ایک پر ہی قربان ہو چکا ہوں۔ مزید قربانی نہیں دے سکتا۔" عاشر کا انداز معنی خیز قسم کا تھا۔ فریحہ کو کچھ عجیب لگا۔ گو کہ وہ پہلے بھی خاصی معنی خیز گفتگو کرتا تھا تاہم اس وقت فریحہ کو کچھ الگ ہی فیل ہوا۔

"تو وہ جنم جلی ہے کہاں؟" تائی کو غائبانہ ہی اس پر تاؤ آگیا۔ "سامنے ہو تو اس کے پیر پکڑ کر بھی لے آئیں۔"

"وہ پیر پکڑنے سے بھی نہیں آئے گی۔ قسمت کے پھیر میں پھنسی ہوئی ہے۔" عاشر نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

"کیسی منحوس ہے۔" تائی کو اور بھی بری لگی تھی۔

"منحوس نہیں۔۔۔ بڑی بھاگوان ہے۔ نصیب والوں کی دہلیز پہ اترے گی۔" عاشر ہلکا سا مسکرا دیا تھا۔ اس کا انداز سابقہ ہی تھا تاہم اس میں ہمیشہ والی معصومیت ضرور موجود تھی۔

"میرا دل تو فریحہ کی سہیلی پہ آگیا تھا۔ ایسی سندر بچی ہے کہ پورے گھر میں اجالا بھر دے۔" تائی کو ایک مرتبہ پھر ماہ رو یاد آگئی۔

"کیوں؟ ہمارے گھر بجلی نہیں۔۔۔ یا جنریٹر کا فقدان ہے۔" عاشر نے تائی کی بات کو اپنے ہی رنگ میں لیا تھا۔ تائی نے اسے گھور کر دیکھا تھا پھر اپنی بات جاری رکھی۔

"ایسی چینی کی گڑیا' دل چاہے تو شوکیس میں سجا دیں۔"

"کمال کرتی ہیں امی آپ؟ شوکیس برتن سجانے کے لیے ہوتے ہیں جیتے جاگتے انسان نہیں۔ پھر ہمیں

ایک بیوی درکار ہے کوئی ڈیکوریشن پیس نہیں۔ محترمہ کوئی کام نہیں کرتیں۔ ہر کام کے لیے دس دس نوکر ہیں۔

پھر جم میں الگ سے جانا ہوتا ہے۔ شاپنگ' ہوٹلنگ' ہلا گلا اضافی کمالات ہیں۔ آپ اتنے اونچے خواب نہ ہی دیکھیں تو بہتر ہیں اور اگر اتنا ہی ماہ روبی بی پہ دل آگیا تھا تو پھر عون کو تختہ مشق بنا لیتیں۔ یقین واثق تھا کہ عون ان محترمہ کو سدھارنے کی طاقت رکھتا تھا۔ مجھ غریب کو تو کھڑے کھڑے گولی سے اڑا دیتی۔ حد ہے بھئی۔ خواب بھی دیکھا تو آسمانوں والا۔" وہ اتنے مزاحیہ انداز میں بولا تھا کہ فریحہ کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔ پھر وہ ہنس ہنس کر دوہری ہو گئی تھی۔ اس کی شفاف جھرنوں سی ہنسی نے لمحہ بھر کے لیے عاشر کو تھما دیا تھا۔ اس کے اپنے لبوں کی مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ پھر وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رکا تھا۔ الٹے قدموں ہی پلٹ گیا تھا۔ تائی' امی اور فریحہ اس کے ردعمل پہ ششدر رہ گئے تھے۔ اسے اچانک ہوا کیا تھا؟



یہ شدید گرم ترین دن تھا۔ نہ صرف گرم ترین بلکہ مصروف ترین بھی۔ عاشر کو بخار تھا سو وہ کام پہ نہیں آسکا۔ عاصم اور قاسم بھائی نیا مال بک کروانے کراچی گئے ہوئے تھے۔ رات کو تین ٹرک سامان کے آئے تھے۔ جنہیں خالی کروانا تھا اور آج ہی کروانا تھا۔ اگلے تین دن اور بھی مصروفیت کے تھے۔ کیونکہ اگلے تین دن میں باقاعدہ شادی کی رسموں کا آغاز ہو جانا تھا۔ عون عباس کو آج ہی تمام کام نمٹا کر فارغ ہونا تھا۔

وہ اپنے زیر نگرانی پیکنگ میں بند نیا مال اتروا کر گودام میں رکھوا رہا تھا۔ پھر پلازہ کی مختلف دکانوں میں مطلوبہ سامان پہنچانا بھی اسی کی ذمہ داری تھی۔ پیکنگ کھلوانا بھی اسی کے ذمے لگایا گیا تھا۔ خاص طور پر الیکٹرونکس کے ٹرالوں کو خالی کروانا بڑا محتاط قسم کا کام تھا۔ اوپر سے بلا کی گرمی تھی اچانک ہی سورج انتہائی پر تپش ہو گیا تھا۔ ابھی ایک ٹرک خالی ہوا تھا جب اس کی جینز کی پاکٹ میں رکھا سیل فون ایک تواتر سے بجنے لگا۔ اس نے مصروف انداز میں موبائل نکال کر کان سے لگایا تھا۔ دوسری طرف ایک دل نشین جانی پہچانی نسوانی آواز سنائی دی تھی۔ عون کی بھنویں تن سی گئیں۔ ماتھے پہ سلوٹ نمودار ہوئی تھی۔ اس کے اعصاب تک کھنچ گئے تھے۔ اس کا وجدان جس خاتون کی طرف اشارہ کر رہا تھا اگر کال وہی تھی تو پھر آج اس کی زندگی کا انتہائی برا ترین دن تھا۔ اور وہ اگلے دس سال تک بھی اس کال کو بھلانے والی نہیں تھی۔ اگر ذرا سی بھی غیرت رکھتی تو شرم سے ڈوب مرتی۔ اس دن کی ذلت کے بعد ایسی جرات کا دوبارہ مظاہرہ نہ کرتی۔

عون عباس کو اندازہ ہی نہیں تھا۔ اس کا کس ڈھیٹ اور انتہائی ڈھیٹ خاتون سے واسطہ پڑا تھا۔ مہذب الفاظ میں ایسی عورتوں کو مستقل مزاج کہا جاتا ہے تاہم عون کے نزدیک وہ کمال درجے کی ڈھیٹ لڑکی تھی۔ جسے اپنی انا' عزت اور وقار کا ذرا پاس نہیں تھا' لیکن آج وہ اس کے تمام طبق روشن کر دینا چاہتا تھا۔ جیسے ہی اس نے مدھر آواز میں عباس کہا۔۔۔ ٹھیک اسی لمحے وہ ذرا فاصلے پر شیڈ تلے کھڑا ہو کر سورج کی تپش سے بڑھ کے آگ اگلنے لگا تھا۔

"مجھے امید نہیں تھی۔ تم اس دن کی انسلٹ کے بعد رابطہ رکھو گی' لیکن آج پتا چلا ہے' تم کس قدر ڈھیٹ قسم کی لڑکی ہو۔ بلکہ شریف لڑکیوں کے نام کی بھی توہین ہو۔ تم میں ذرا بھی غیرت نہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں تم سی بے حیا اور بے ہودہ لڑکی نہیں دیکھی۔" عون جیسے چھوٹتے ہی پھٹ پڑا تھا۔ یہ ماہ رو کی خوش نصیبی تھی جو وہ اس وقت عون کے سامنے نہیں تھی۔ ورنہ یہ سامنے کھڑا ٹرالر اس کے اوپر سے گزار دیتا یا پھر بلڈوزر کے پہیوں تلے دبا دیتا۔ ادھر ماہ رو جیسے ہر قسم کے رویے کی توقع رکھ کر کال کرنے کی ہمت خود میں لائی تھی۔ وہ جانتی تھی عون کسی بھی انتہا پہ غصے کا گراف لے جا سکتا تھا۔ سو اس کے اطمینان

میں عون کے زہر اگلنے پہ بھی فرق نہیں پڑا تھا۔ بلکہ اس نے بڑے سکون اور دلچسپی سے عون کے الفاظ کو سنا تھا پھر انتہائی برجستہ لہجے میں بولی۔

"ویل' کوئی حسرت تو نہیں رہے گی نا۔ اب مجھ جیسی بے ہودہ تو دیکھ لی ہے۔ تم یہ بھی سمجھ چکے ہو گے میں کس قدر مستقل مزاج ہوں۔ تمہارے الفاظ میں ڈھیٹ ترین ہوں۔ تو پھر تم میرے ٹیلنٹ کو مان گئے نا۔ تمہارے نمبر تک رسائی بھی حاصل کر لی ہے۔ کسی دن تم تک بھی پہنچ جاؤں گی۔ پھر تمہارے دل کو اپنا بنانا بھی مشکل نہیں ہو گا۔" ماہ رو نے بڑے دلربا انداز میں کہا تھا۔ یوں کہ عون کا سارا خون رخساروں پہ سمٹ آیا۔ اس کی بے ہودہ گوئی پہ عون کو بے انتہا غیض چڑھا تھا۔

"مجھے یقین نہیں آتا۔ فریحہ نے تم جیسی لڑکی کو دوست بنا رکھا تھا۔ کیا فریحہ کو اچھے برے کی ذرا پہچان نہیں۔ تم تو ایسی بے لگام لڑکی ہو چار شریف لڑکیوں کو منٹوں میں اپنے جیسا بے لگام کر دو۔" وہ اسے بھگو بھگو کر جوتے مار رہا تھا۔ اور ماہ رو ان فقروں کو کسی اعزاز کی طرح وصول کر رہی تھی۔ اف یہ محبت بھی نا۔ کتنا لاچار کرتی تھی۔ کتنا خوار کرتی تھی۔ کتنا بدحال کرتی تھی۔

"فریحہ کو اچھے برے کی پہچان ہے یا نہیں۔ یہ تم فریحہ سے ہی پوچھ لو۔ اگر میں نے فریحہ کی شرافت کو خراب کیا ہے۔ پھر تو یہ الزام سچا ہو گا۔ اگر نہیں تو پھر اپنے الفاظ پہ ذرا دوبارہ غور کر لو۔ میں تو شریف لڑکیوں کو خراب کرنے والے الزام سے بری ہوں۔" ماہ رو نے بڑے انداز سے عون کو زچ کرنا چاہا تھا۔ باہم برابر اسے وکٹری کا نشان دکھا کر بیک اپ کر رہی تھی۔ اس کی کمر ٹھونک رہی تھی۔

"جسٹ شٹ اپ۔" وہ دھیمی آواز میں پھنکارا تھا۔ "تم نے مجھے فون کیوں کیا ہے؟"

ڈھنگ کا سوال تو اب کیا نا۔" ماہ رو جیسے قربان جانے لگی تھی۔ "میں نے تمہیں ایک بات بتانا تھی۔ اگر تم غصہ تھوک کر آرام سے سن لو تو...." اب کے ماہ رو نے تھوڑا انداز بدل کر لہجے میں عاجزی بھر لی تھی۔ اور وہ شاید کال ڈسکنیکٹ کرنے والا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے رک گیا۔ پھر اس نے پینترا بدل کر کہا۔

"میں تمہاری بات سن لیتا ہوں مگر وعدہ کرو تم دوبارہ کال نہیں کرو گی۔ یہ تمہاری آخری فون کال ہو گی۔"

عون کو اچانک لہجہ بدلنا پڑا تھا۔ اسے لگا' وہ غصہ دکھا کر اسے مزید چڑا رہا ہے۔ ایسی لڑکیوں کو دوسرے طریقے سے ہینڈل کرنا چاہیے۔ ورنہ غصے اور انسلٹ پہ وہ ضد اور سرکشی پہ بھی اتر سکتی تھی۔ یوں وہ دوہرا نقصان بھی پہنچا دیتی۔ سو عون کو اپنا دماغ حاضر رکھنا پڑا۔ ماہ رو کچھ الگ قسم کا کیس لگتی تھی۔

گو کہ اس دن سے عاشر نے کئی مرتبہ اسے دفتر میں بُلا کر کرید اتھا۔

"یہ فریحہ کی سہیلی کیوں آئی تھی! اور روتی ہوئی کیوں گئی؟ کوئی پرابلم تھی کیا؟" اس دن چاچا اور کئی ایک سیل بوائز نے بھی ماہ رو بی بی کو آتے اور جاتے دیکھا تھا۔ تب اس نے عاشر کو تو مطمئن کر دیا تھا۔ لیکن خود کو مطمئن نہیں کر سکا تھا۔

اس دن چاچا نے بھی عون کو بلا کر ماہ رو کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ ہر ایک کی سوالیہ نظروں سے عون کو ایسی الجھن ہو رہی تھی کہ حد نہیں۔ صد شکر کہ سب لوگوں کو مطمئن کر دیا تھا۔ اور گھر تک یہ بات نہیں پہنچ سکی تھی۔ اور آج پھر وہی ماہ رو ایک دفعہ مزید اس کے ضبط اور صبر کا امتحان لینے فون کال پہ موجود تھی۔ اور عون کو بڑے طریقے کے ساتھ سے ہینڈل کر کے اپنا پیچھا چھڑوانا تھا۔ کیونکہ وہ ان امیرزادیوں کی چند روزہ محبت کے مشغل سے بخوبی آگاہ تھا۔ اور ماہ رو کے جھانسے میں آنے والا بھی نہیں تھا۔ اس نے بڑے طریقے سے ماہ رو کو گھیر گھار کے وعدہ لینا چاہا تھا۔ اور ماہ رو نے بھی بغیر منت لگائے اقرار کا وعدہ کر لیا۔

"لیکن میری بھی ایک شرط ہو گی۔" اس نے بڑی حاضر دماغی کا ثبوت دیتے ہوئے بدلے میں شرط سنا دی تھی۔ عون کو لہجے اور آواز میں کچھ تبدیلی لا کر نرمی بھرنا پڑی۔ اگر ایک شرط کے بدلے میں اس چکنی جونک

سے پیچھا چھوٹ جاتا تو یہ کوئی بہت برا سودا نہیں تھا۔ عون نے بھی کچھ سوچ کر اقرار کرلیا۔

"دیکھ لو' تم اپنے پرامس سے ہٹو گے نہیں؟ وعدہ؟" ماہ رو نے اپنے ازلی اعتماد کے ساتھ کہا۔ عون کو دل ہی دل میں شدید تاؤ چڑھا تھا۔ کیا یہ واقعی فریحہ کی سہیلی تھی؟ کیا وہ جانتی نہیں تھی۔ تین دن بعد اس کی فریحہ سے شادی ہے۔

اس نے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے ایک لفظ وعدہ کہا۔ یوں کہ دوسری طرف ماہ رو کو جیسے ہفت اقلیم کی دولت حاصل ہوچکی تھی۔ وہ بے انتہا مسرور اور شاد ہوئی۔ خوشی اس کی آواز سے چھلک رہی تھی۔

"میں تمہیں دوبارہ کال کر کے تنگ نہیں کروں گی۔ لیکن تمہیں بھی میری محبت کا یقین کرنا ہوگا۔ اور اس یقین کا اقرار بھی کرنا ہوگا۔" ماہ رو نے ایک جذب کے عالم میں اس تک اپنی شرط پہنچادی تھی۔ جسے سن کر اسے ڈنک لگا تھا۔ وہ جیسے بدک کر پیچھے ہٹا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ غرا اٹھا۔

"شٹ اپ۔" اس کی غراہٹ پہ کچھ فاصلے پہ کھڑے چاچا مزدوروں سے کرٹن اٹھواتے چونک سے گئے تھے۔ معاً عون کو خیال آنے پر اپنا لہجہ دھیما کرنا پڑا تھا۔ اس نے جیسے خون کا گھونٹ بھرا تھا۔ پھر فون کو کان سے ہٹا کر دوبارہ لگاتے ہوئے بمشکل بولا۔

"میں یہ کام نہیں کرسکتا۔" اس نے صاف انکار کردیا تھا۔

"تو پھر میں چوبیس گھنٹوں میں تمہیں اڑتالیس کالز کروں گی۔ اور دو ہزار ایس ایم ایس۔ بولو منظور ہے۔؟" وہ جیسے لمبا سا لطف لیتے ہوئے بلیک میلنگ پہ اتر آئی تھی۔ دوسری طرف عون کو لمحہ بھر کے لیے دماغ کو ٹھنڈا کر کے سوچنا پڑا تھا۔ اسے شاید گمان ہوا تھا کہ یہ لڑکی اتنی آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ وہ چاہتا تو فریحہ کو بتا کر اس کا امیج تباہ کرسکتا تھا۔ اس کے کرتوتوں کا اشتہار لگوا سکتا تھا۔ لیکن پھر ہوتا کیا؟ ماہ رو بدنام ہوجاتی۔ ایک لڑکی' ایک عورت۔ جسے اپنے نسوانی پندار کی پروا نہیں تھی۔ لیکن عون بھی گھر میں بہن' بھائی' کزنز اور مزید رشتے رکھتا تھا۔ وہ کسی کی بیٹی کو کیوں بلاوجہ بدنام کرتا۔ گو کہ اب تو وجہ بھی تھی پھر بھی یہ سب اس کی تربیت کا حصہ نہیں تھا۔

کافی دیر سوچنے کے بعد عون نے ذرا نرم آواز میں اسے الجھانے اور بات ختم کرنے کی غرض سے کہا۔

"ویل۔ میں تسلیم کرلیتا ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ لیکن میں یقین کیسے کروں؟ تمہیں یقین تو دلانا پڑے گا۔ اب یہ تم پر ڈیپینڈ کرتا ہے کہ تم مجھے کیسے یقین دلاتی ہو۔" اپنے تئیں اس نے ماہ رو کو لاجواب کرنا چاہا تھا۔ مگر وہ ماہ رو ہی کیا جو لاجواب ہوجاتی۔ اس کا ازلی اعتماد' نخرہ اور حاضر جوابی لوٹ آئی تھی۔ اب اسے عون کو ستا کر مزہ آرہا تھا۔ وہ اس گفتگو کو مزید لمبا کھینچنے کی خواہش رکھتی تھی۔

"میں تمہیں یقین دلا سکتی ہوں۔ کیونکہ میں تم سے سچی محبت کرتی ہوں۔ وقتی ابال والی محبت نہیں۔ لمبی اور ہمیشہ والی۔ تم کہو' کس طرح سے یقین کرو گے؟ کیا زہر پھانک لوں؟ سوسائیڈ کرلوں؟ شہ رگ کاٹ لوں۔ خود کو آگ لگالوں؟ یا تمہارے پلازہ کی چوتھی منزل سے کود جاؤں۔" اس کے اگلے الفاظ نے عون کے سترہ طبق روشن کردیے تھے۔ اس کی سماعتیں جیسے سلگ اٹھی تھیں۔ وہ برجستہ بول پڑا۔

"میں تمہارا قتل اپنے ذمے کیوں لوں؟ اگر مرنا چاہتی ہو تو شوق سے مرو۔"

"تاکہ تمہارا پیچھا چھوٹ جائے۔" ماہ رو نے طنزیہ کہا۔

"خاصی سمجھ دار ہو۔" وہ بھی طنز پہ اتر آیا تھا۔

"بہت بددماغ بھی ہوں۔" اس نے جتلایا۔

"وہ تو نظر آرہا ہے۔" اس نے فون بند کرنا چاہا۔

"میری بات سنو۔۔۔" ماہ رو جیسے اس کا ارادہ بھانپ گئی تھی۔

"کیا ہے۔۔۔؟" وہ مشتعل ہوا۔ "کیا پیچھا چھوڑو گی یا نہیں؟" اس کے ضبط کی انتہا ہوچکی تھی۔

"ہرگز نہیں۔" ماہ رو نے کال کاٹ دی' تھی۔ پھر وہ

بیڈ پہ لیٹ کر ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ عون سے بات کر لینے کی سرخوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ عون نے اس سے اتنی لمبی بات کی تھی اور اس کی ہر بے سروپا بات کا جواب بھی دیا تھا۔ ماہ رو کا یقین کامل تھا کہ ایک نہ ایک دن عون کو اس کی محبت پہ یقین بھی آجائے گا اور ماہ رو پہ اس خوب صورت دن مبارک بادی کا فیضان ہو گا۔



پھر یہ فون کالز کا سلسلہ رکا نہیں تھا۔ بڑھتا چلا گیا تھا اور وہ اگلے تین دن سے بھی پہلے صرف چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر ناک کے بانسے تک عاجز آگیا تھا۔ چوبیس گھنٹوں میں ہر ایک منٹ بعد ماہ رو کی کال آرہی تھی۔ ہر سیکنڈ بعد میسج موصول ہو رہا تھا۔ وہ بیک وقت تین تین نمبروں سے کال، مس کال، میسج اور ایم ایم ایس کر رہی تھی۔ پھر یہ سلسلہ عون کے موبائل تک محدود نہیں رہا تھا بلکہ پلازہ کے ہر مختلف پارٹ، دکان، حصے میں لگے الگ الگ فونز پہ بھی کالز آنا شروع ہو گئی تھیں۔ وہ صرف چوبیس گھنٹوں میں ہی اس صورت حال پہ متوحش ہو گیا تھا۔ یوں لگتا ہر اٹھتی نگاہ اس سے سوال کرتی ہے۔ ہر اٹھتی نگاہ میں اس کے لیے عجیب تاثر ہوتا تھا۔ یہ اس کی اپنی اندرونی کیفیات تھیں جو اسے چور بنا رہی تھیں۔

اور آج تو حد ہو چکی تھی۔ صبح سے لے کر شام تک اسے ایک سو اسی کالز اور سات سو کے قریب میسجز موصول ہوئے تھے۔ سب سے بڑی شرمسار کرنے والی بات تو یہ تھی۔ جب وہ کپڑے کے لوڈ ڈپو سے کپڑا اتروا رہا تھا تب اس کی جیب میں موبائل بھیانک سائرن کی طرح بجتا رہا۔ متواتر میسجز بھی آتے جا رہے تھے۔ تنگ آکر اس نے فون سائلنٹ پہ کر دیا لیکن تب ہی ابو اور چاچا کی غصے بھری کالز پی ٹی سی ایل پہ آنے لگیں۔ وہ اسے موبائل توڑ دینے کا مشورہ دے رہے تھے۔ ظاہر ہے جب ضرورت کے وقت اٹھانا

نہیں تھا تو پھر موبائل جیسی سہولت کی ضرورت کیا تھی۔ تین دن سے وہ سائلنٹ والا حربہ بھی آزما کر بے زار ہو چکا تھا۔ کیونکہ ابو اور چاچا کے بعد امی، چاچی اور بھابیوں نے بھی اسے خوب سنائی تھیں۔ وہ تین گھنٹے ٹریفک میں پھنسی رہیں اور بار بار اسے کال کر رہی تھیں کہ وہ انہیں دوسرے روٹ سے پک کر لے لیکن چونکہ عون نے سیل سائلنٹ پہ کر رکھا تھا۔ اس لیے پتا ہی نہیں چل سکا تھا۔ وہ تو اس سچویشن پہ چکرا کر رہ گیا تھا۔ اب تو دکان میں کام کرنے والے لڑکے تک جان چکے تھے۔ صور اسرافیل کی طرح بجتی گھنٹیوں میں کوئی خاص بات تو ضرور تھی۔ یوں لگتا ہر آنکھ میں عون کے لیے کھوج بھر گئی ہے۔ یعنی وہ بھی۔۔۔ عون عباس بھی اس لت سے محفوظ نہیں رہ سکا تھا۔ جسے بڑے بڑے محتاط رہنے کے دعوے ہوا کرتے تھے۔ جس کا ماضی صاف شفاف تھا اور جو کسی پرائی عورت کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔

اسے اپنے باپ اور چاچا کی برسوں بنائی گئی عزت اور ناموس کی بڑی پروا تھی۔ سو، عون کیوں نہ اس صورت حال پہ پریشان ہوتا۔ جو بنی بنائی عزت پہ کیچڑ اچھالنے کا سبب بن رہی تھی۔ پھر چاچا اور ابو تک نے اسے بلا کر پوچھ لیا تھا۔ یعنی اس کے اردگرد رہنے والے قریبی لوگ اچنبھے کا شکار ہو کر چونک رہے تھے۔

"کوئی مسئلہ ہے عون! تمہارا دھیان کام پہ نہیں۔ ہر وقت موبائل کی گھنٹیاں بجتی ہیں۔ میں کچھ اڑتی



اڑتی بکواس بھی سن رہا ہوں۔" ابو نے نرم آواز میں اسے خوب اندر تک لتاڑ دیا تھا۔ تب وہ اور بھی پریشان ہوا تھا تھا۔ اس وقت ابو اور چاچا کو تو قائل کر لیا تھا لیکن وہ اپنے دل کی بے چینی کو کسی طور پہ قابو نہیں کر سکا تھا۔ جیسے یوں لگتا تھا کچھ ہو کر رہے گا۔ یہ جو ولایتی طوفان اس کی زندگی میں اٹھ رہا تھا' یہ کوئی معمولی طوفان ہرگز نہیں تھا۔ پہلے پہل اس نے یہی سوچا تھا۔ وہ لڑکی اس کا روڈلی ہیویئر دیکھ کر خود بخود ہٹ جائے گی لیکن ایسا ہرگز نہیں تھا۔ وہ انتہائی ڈھیٹ لڑکی تھی۔ وہ نہ بے عزتی سے ڈرتی تھی' نہ بدنام ہونے سے اور زبان اس کی اتنی لمبی تھی کہ اکثر وہ خون کے گھونٹ بھر کر رہ جاتا تھا۔ حتی کہ تنگ آکر اس نے ماہ رو کو یہ تک بھی کہا۔

"میری شادی ہو رہی ہے اور تم میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہیں۔" اس کے لہجے میں غصہ تھا' گرج تھی' غراہٹ تھی اور کچھ بے بسی بھی' اس نئی اطلاع کو سن کر بجائے وہ شاکڈ ہوتی' اس پہ لعنت بھیجتی' اس کا پیچھا چھوڑتی' بلکہ وہ تو بہت ایکسائیٹڈ ہو چکی تھی۔

"کیا میرے ساتھ۔۔۔؟" اس کا انداز انتہائی برجستہ تھا۔ وہ ہر بات کو چٹکیوں میں اڑاتی دیتی تھی۔ اس کے لیے کچھ بھی سنجیدہ نہیں تھا۔ جب اسے اپنے نسوانی پندار کی پروا نہیں تھی تو پھر وہ عون عباس کی پروا کیوں کرتی۔ اس وقت بھی وہ نئی سم منگوا کر پہلی سم کو توڑنے کے بعد سر تھام کر بے بس سا بیٹھا تھا۔ یہ ایک ہی دن میں چوتھی سم تبدیل ہو رہی تھی۔ اب تو اس کے بھائی بھی چونک کر سوال کرنے لگے تھے۔

"تم نے سمیں بدلنے کا کوئی ریکارڈ تو نہیں قائم کرنا؟" یہ سوال قاسم نے کیا تھا۔ ابھی یہ پہلا سوال تھا۔ پھر سوالوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ یوں کہ عون عباس بوکھلا گیا اور ابھی اس وقت عاشر نے اندر آتے ہوئے بار بار اسے کسی کی کال کو ڈسکنیکٹ کرتے دیکھ لیا تھا۔ پھر وہ اس کے قریب ہی لیدر کے آرام دہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں عون کے وجیہہ چہرے پہ پھیلی الجھن کو دیکھ رہی تھیں۔

اس کا انداز بھی کچھ کھوجتا ہوا تھا۔ کافی دیر دونوں بھائیوں کے درمیان معنی خیز سی چپ کی روا تنی رہی تھی' پھر عاشر کو ہی پہل کرنا پڑی۔

"آج کل فون پہ بڑے مصروف رہتے ہو' کبھی میسج دیکھتے ہو' کبھی میسج لکھتے ہو' کبھی کالز سنتے ہو' کبھی سم بدلتے ہو' کبھی سم توڑ دیتے ہو' کبھی فون بند رکھتے ہو' کبھی سرے سے فون ہی توڑ دیتے ہو' یہ کوئی تیسرا موبائل ہے تمہارا۔ آخر معاملہ کیا ہے؟ آج کل ابو اور چاچا بھی تمہاری روش سے اچنبھے کا شکار ہیں۔" عاشر نے بغیر تمہید کے صاف صاف بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اسے ابو نے عون کے پاس بھیجا تھا' تاکہ وہ اس کی پرابلم تو کھوج آئے۔ ویسے بھی دونوں بھائیوں میں اتنی بے تکلفی اور دوستی تو تھی ہی کہ وہ با آسانی عون سے ہر معاملے پہ ڈسکشن کر سکتا تھا۔ عون جیسے عاشر کی بات سن کر بھونچکا رہ گیا تھا۔ تو گویا بہت سی باتیں طشت ازبام ہونے کا وقت آگیا تھا۔ عون عجیب سی بے بسی میں جکڑ گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی کو بتا دیا' تب بھی عذاب تھا نہ بتایا تب بھی عذاب تھا۔

"کچھ نہیں یار!" عون نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔ اس دوران بار بار اس کا موبائل فون بلنگ کر رہا تھا۔ عاشر نے اک نظر موبائل اسکرین کو دیکھا اور پھر عون کے چہرے کی طرف۔ کچھ دیر بعد میسجز آنا شروع ہو گئے تھے۔ عاشر کی توجہ بار بار اصل موضوع سے ہٹ رہی تھی اور پچھلے کچھ دنوں سے ہر ایک فرد کو عون سے یہی شکایت تھی۔ اس کے پاس ایک منٹ کھڑے ہو کر بات کرنا بھی عذاب ہو جاتا تھا۔ کیونکہ ایک منٹ میں ایک سو دفعہ اس کے نمبر پہ کال اور میسج آنے شروع ہو جاتے تھے' جب تک کہ وہ اٹھا نہ لیتا' سن نہ لیتا' دیکھ نہ لیتا یا ڈس کنیکٹ نہ کر دیتا۔

"یہ سب کیا ہے عون! کیا تم جواب دینا ضروری سمجھتے ہو؟" اس دفعہ عاشر نے بہت غصے میں کہا تھا' چونکہ عون کی توجہ بھی بار بار ہٹ رہی تھی۔ وہ ترچھی نظروں سے موبائل کو دیکھتا تھا۔ جس کی اسکرین منٹ

منٹ بعد روشن ہو جاتی تھی۔ "ابھی یہ بات ہم تک محدود ہے 'کل کو چاچی 'امی 'فریحہ اور باقی سب بھی جان جائیں گے۔ بہتر یہی ہے 'تم اس سلسلے کو بند کرو' کل تمہاری بارات ہے اور آج شام کو مہندی کی رسم۔ ادھر تم فون خریدنے 'توڑنے اور سمیں بدلنے میں مشغول ہو۔" عاشر نے اتنے دنوں کا غصہ باہر نکال دیا تھا اور خاصے جارحانہ انداز میں اس کو لتاڑنے کی کوشش کی تھی۔ عون کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ اس نے بے انتہا توہین اور ذلت محسوس کی تھی۔ وہ اپنے سے دس ماہ چھوٹے بھائی کے سامنے بے انتہا شرمندہ ہو گیا تھا۔ اب عون عباس پہ یہ بھی وقت آنا تھا۔ وہ چھوٹے بھائی کے سامنے سوالیہ نشان بن گیا تھا۔ وہ اس کے سامنے کمرہ عدالت میں کھڑا ہو گیا تھا۔ اس ماہ رو سرفراز کی سرکشی کے سبب' اس ایک ماہ رو سرفراز نے عون عباس کو اتنا ہلکا اور بے بس کر دیا تھا۔ جسے اپنے ڈیفنس میں بولنا بھی محال لگ رہا تھا۔ وہ ہونٹ چباتا غصے میں کھڑا ہو گیا۔

"میں تمہیں سمجھا رہا ہوں عون! گھر میں خوشیوں کے شادیانے بج رہے ہیں۔ تم بھی ذرا سنبھل جاؤ۔ ایسا ویسا کوئی قصہ ہے تو اس پہ لعنت ڈالو۔ تم اچھی طرح سے جانتے ہو۔ فریحہ ہم سب کو کس قدر عزیز ہے اور اس کی آنکھ میں اترا آنسو کوئی بھی دیکھ نہیں سکتا۔ تم فریحہ کو رلانے کا سبب بنے تو اچھا نہیں ہو گا۔ بالکل بھی اچھا نہیں ہو گا۔ اسے میری وارننگ سمجھ لو۔ ابو کسی بھی بدنامی کے بار کو اٹھانے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔" وہ اسے ڈھکے چھپے لفظوں میں سمجھا گیا تھا۔ دوسرے معنوں میں ابو کی طرف سے وارننگ دے گیا تھا اس کا مطلب تھا ابو بھی کچھ کچھ ماہ رو والے قصے سے آگاہ ہو رہے تھے۔ ظاہری بات تھی۔ سب کچھ اس قدر واضح تھا کہ ہر کوئی اپنی اپنی سمجھ کے مطابق نتیجہ اخذ کر لیتا۔ عون مارے غصے کے بھپر رہا تھا اور اسی غصے کے عالم میں اس نے دفتر کی ایک ایک قیمتی چیز کو تہس نہس کر دیا تھا۔ اوپر سے اس کا موبائل بھی بھیانک سریں بکھیر رہا تھا۔ پھر ایک انجان نمبر سے میسج آ گیا۔ وہ جو تھک ہار کے صوفے پہ ڈھے گیا تھا۔ لحہ بھر کے لیے چونک گیا۔ کیا اسے میسج کھول کے دیکھ لینا چاہیے؟ کیا خبر کسی کا ضروری میسج ہو۔ اگر اس نے میسج نہ دیکھا اور ابو تک فون چلا گیا تو اس کی اچھی بھلی کلاس لگنے کا خدشہ تھا۔ اسی لیے عون کو میسج کھول کر دیکھنا پڑا۔ سامنے ایک نظم کے چند الفاظ چمک رہے تھے۔

کوئی مجھ کو ایسی دلیل دے
کہ میں ٹوٹ کر تیرے نقش
آنکھ کی پتلیوں سے مٹا سکوں
کوئی مجھ کو ایسی دلیل دے
کہ میں دل سے پھر تیری عمر بھر کی
رفاقتوں کو بھلا سکوں
کوئی مجھ کو ایسی دلیل دے
کہ میں عمر بھر تیری یاد کا
کوئی جشن ہی نہ منا سکوں
اگر ایسی کوئی سبیل ہے تو پھر آزما
جو نہیں تو پھر۔۔۔
مجھے یاد کر' مجھے یاد آ

عون کے دماغ سے شرارے نکل رہے تھے۔ اس کے اندر جوار بھاٹا تھا جو جمع ہو رہا تھا۔ آتش فشاں تھا جو پھٹ رہا تھا۔ کیونکہ ابھی کچھ دیر پہلے دفتر کی حالت زار کو دیکھ کر اس کا باپ آگ کی طرح بھڑک اٹھا تھا۔ ابو ابھی کچھ دیر پہلے ہی پلازہ میں آئے تھے۔ آتے ساتھ عاشر سے ٹکراؤ ہو گیا تھا۔ عاشر نے انہیں تسلی دی تھی کہ عون ٹھیک ہے۔ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ سو وہ بڑے چین کے عالم میں اوپر دفتر کی طرف آئے تھے۔ ان کے دل سے چند دن پہلے والے وسوسے مٹ چکے تھے۔ عاشر نے ان کی اچھی تسلی کروا دی تھی۔ کیونکہ کچھ دن پہلے ہونے والے واقعات میں انہیں عون بڑا چڑچڑا' بے زار اور بد مزاج محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بات یہ بات کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ اس کی شادی ہو رہی تھی اور یہ شادی زبردستی کی بھی نہیں تھی۔ پھر عون کے غصے اور بد مزاجی کا سبب کیا تھا؟ اسے تو خوش ہونا چاہیے

تھا، جبکہ وہ دن بدن بے زار، روکھا اور غصیلا ہو رہا تھا۔ عون کے باپ اور فریحہ کے تایا ہونے کے ناطے ان کے سارے وسوسے بے سبب نہیں تھے۔ انہیں ڈر تھا، کچھ انہونا نہ ہو جائے۔ وہ ان دنوں سخت پریشان تھے اور چاہتے تھے کہ عون، فریحہ کی شادی خیر، خیریت سے نپٹ جائے اور اب دفتر کی حالت دیکھ کر انہیں عون کی ذہنی کنڈیشن کا صاف نظارہ ہو رہا تھا۔ وہ تو پورے دفتر کو ٹوٹا بکھرا دیکھ کر بھونچکا رہ گئے تھے۔ انہیں عاشر کی تسلی پہ تاؤ چڑھ گیا۔ کیا اس نے اپنے باپ سے جھوٹ بولا تھا؟ وہ بھائی کے کسی عیب، غلطی یا راز کو چھپا رہا تھا۔ آخر کچھ تو تھا پس پردہ جسے عاشر نہ سہی عون لازمی طور پہ چھپا رہا تھا۔ آخر کیا تھا؟ کیا تھا جس کی پردہ داری تھی؟ ان کے دماغ سے عون کی طرح ہی شرارے نکل رہے تھے۔ اوپر سے اس کا بجتا موبائل چونکہ تین تین موبائل تھے اور ہر نمبر پہ ایک ساتھ کالز آرہی تھیں۔ ابو جیسے لمحوں میں سمجھ کر آگ بگولا ہو گئے تھے۔ ان کا شک یقین میں بدل رہا تھا۔ عون کے پیچھے کوئی تھا؟ کوئی لڑکی، شاید اس کی محبوبہ؟ یا پھر؟ ان کے دماغ کی نسیں پھٹنے لگی تھیں۔

وہ خون خوار تیور لے کر اس کے قریب آئے تھے۔ پھر انہوں نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے سب سے لاڈلے بیٹے کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑا تھا اور خونی رنگ آنکھوں سے عون کو گھورتے ہوئے لہرا کر اس کے منہ پر گونج دار تھپڑ دے مارا۔ یہ ساری کارروائی آدھے منٹ میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے دروزاہ لاک کر دیا تھا۔ پھر وہ شرارے اگلتے اس کے سر پہ کھڑے چلانے لگے تھے۔

"میں کہتا ہوں تم بے غیرت ہو چکے ہو۔ شرم نہیں تمہیں۔ رات کو مہندی کا فنکشن ہے۔ کل بارات ہوگی اور تم مجھے پوری برادری کے سامنے ذلیل کرنا چاہتے ہو۔ ایک جائز تعلق بننے میں رات بھر کا وقفہ بچا ہے اور تمہارے پچھلے عشق کی آگ نہیں بجھ رہی۔ اتنے دنوں سے تماشا دیکھ رہا ہوں۔ تحمل سے کام لے رہا ہوں، تاکہ تمہیں کچھ تو شرم آئے۔ مجھے تمہارے منہ نہ ہی لگنا پڑے۔ جو باپ بیٹے کے درمیان پردہ سا حائل ہے وہ چاک نہ ہی ہو، مگر تم نے آج انتہا کر دی۔" جب ان کا سارا لاوا ابل ابل کر عون کے پورے وجود کو غبار آلود کر گیا تھا۔ جب عون کی عمر بھر کی پونجی کو انہوں نے ایک ہی جھٹکے میں داغ دار کر دیا تھا۔ جب عون کے کردار تک بات پہنچ گئی تھی۔ تو پھر عون کے پاس باقی کیا بچا تھا؟

اس کا سب کچھ تو لٹ گیا تھا۔ وہ اپنے باپ کے سامنے رسوا ہو گیا تھا۔ اس کا باپ تو اپنی بھڑاس نکال کر جا چکا تھا لیکن عون عباس کے اندر ابلتے آتش فشاں کو کیسے روکا جاتا؟ وہاں تو آگ ہی آگ تھی جو آج عون عباس کے نصیب میں ذلت آئی تھی۔ اس کا ایک حصہ ماہ رو کو بھی ملنا چاہیے تھا۔ وہ بھی اتنی ہی ذلت اور رسوائی کی حق دار تھی۔ اگر عون عباس ذلیل ہوا تھا۔ اپنے باپ کے سامنے خوار ہوا تھا تو ماہ رو سرفراز کو بھی اپنے باپ کے سامنے ذلیل ہونا تھا۔ وہ جارحانہ انداز میں اٹھا تھا اور کسی بپھرے طوفان کی طرح باہر نکل گیا۔ اس کے انگ انگ سے شرارے پھوٹ رہے تھے۔



پورا گھر لائٹنگ سے سجایا جا رہا تھا۔ باہر گراؤنڈ میں شامیانے لگائے جا رہے تھے۔ مہندی کا فنکشن گراؤنڈ میں ہونا تھا۔ برات ہوٹل میں آنی تھی۔ اگر عون، تایا، تائی کا بہت لاڈلا تھا تو فریحہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس لیے یہ شادی انتہائی دھوم دھام سے ہونا قرار پائی تھی۔ کیونکہ یہ واقعی ہی یادگار ترین شادی تھی۔ کبھی بھلائے جانے والی نہیں تھی۔ نہ کوئی اسے بھلا پاتا۔ فریحہ تو کبھی بھی نہیں۔

سرشام ہی ڈھولک کی تھاپ پہ گیتوں کی پریکٹس شروع ہو گئی تھی۔ اس کی ساری کزنز بہت پرجوش تھیں اور رات بھر سے ڈانڈیا سیکھ رہی تھیں۔

تائی اور امی بہت مصروف تھیں۔ ثنا اور مریم پارلر روانہ ہو چکی تھیں۔ کائنات مہندی لگوا رہی تھی۔ ثنا کی بیٹی زینب، فریحہ کے پاس تھی۔ جسے تھپک تھپک

کر سلاتے ہوئے اس کی سوچوں کا کوئی رخ بھی مثبت نہیں تھا۔ امی نے اسے چپکے چپکے آنسو بہاتے دیکھا تو اندر آگئیں۔ پھرانہوں نے اسے ڈپٹ کر کہا۔

"فریحہ! کیوں رو رہی ہو؟ حد ہے بیٹا! تمہیں کوہ قاف نہیں جانا' نہ کسی دوسرے شہر جانا ہے' نہ کسی دوسرے پورشن میں جانا ہے۔ بس ایک کمرہ تو بدلے گا۔ یہاں سے عون کے کمرے تک۔" امی نے بے ساختہ اس کی پیشانی چوم لی تھی۔ تب پہلی مرتبہ فریحہ نے اپنی گھبراہٹ کی بھاپ امی کے سامنے نکال دی تھی۔ وہ دل پہ بوجھ لیے لیے تنگ آچکی تھی۔ امی پریشان نہ ہوں۔ بس یہی سوچ کر وہ ہر بات دل میں دبائے ہلکان ہو چکی تھی لیکن اس وقت فریحہ میں ضبط کا یارہ نہیں رہا تھا۔

"پتا نہیں امی! دل کیوں گھبرا رہا ہے۔ اندر کہیں چین نہیں۔" اس کی آواز پھر سے بھرا گئی تھی۔

"تم وہم میں نہ پڑو۔ اچھا اچھا۔ خوش گوار سوچو۔" امی نے اسے دلاسا دیا تھا۔ آج امی بہت خوش تھیں۔ بیٹی کا فرض بھی ادا ہو رہا تھا اور عمر بھر آنکھوں کے سامنے بھی رہتی اور داماد بھی دل پسند تھا۔ وہ اسے تسلی دے کر چلی گئیں۔ شاید کسی نے انہیں آواز دے کر بلایا تھا۔ فریحہ' زینب کو تھپک تھپک کر سلا چکی تھی' جب عاشر کا وہاں سے گزر ہوا تھا۔ فریحہ نے اچانک اسے آواز دے کر روک لیا تھا۔ عاشر لحہ بھر کے لیے رک گیا تھا۔ پھر اندر بھی آگیا۔ فریحہ مایوں کے زرد لباس میں خود بھی خاصی زرد لگ رہی تھی۔ موتی چور کے لڈو جیسی۔ عاشر نے ایک اچٹتی نگاہ ڈالی تھی۔ پھر جلدی سے نظروں کا رخ موڑ لیا۔ تاثرات بھی سپاٹ سے کر لیے تھے۔ فریحہ نے انگلیاں مسلتے ہوئے عاشر سے پوچھا۔

"عون آج کل کہاں ہے؟ پردہ تو مجھے اس سے کرنا تھا۔ وہ خود ہی روپوش ہو کر بیٹھ گیا۔" اس کے لہجے میں ٹوٹ پڑتی' رنجیدگی کا عنصر نمایاں تھا۔ عاشر نے گہرا سانس کھینچ لیا۔ وہ فریحہ کو کیا بتاتا؟ عون تو واقعی چند دنوں میں ایک پہیلی بن چکا تھا۔ اس کے دن رات کی کچھ خبر نہیں تھی۔ بات کرو تو کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ ایسی بد مزاجی تو عون کی طبیعت کا حصہ نہیں تھی۔

"کیا پتا۔ پلازہ میں ہی مایوں بیٹھ چکا ہو۔" عاشر نے اپنا لہجہ ہلکا پھلکا سا بنا لیا تھا۔ "سوچتا ہو گا گھر میں تردد کیوں کروں؟ پھر تو امی وغیرہ گھر میں پاؤنڈ کر لیں گے۔"

"مذاق نہیں کرو پلیز۔" فریحہ کی سنجیدگی برقرار تھی اور جو دبی دبی بے چینی' اضطراب اس کے چہرے پہ دکھائی دے رہا تھا' عاشر اس اضطراب کی وجہ بخوبی سمجھتا تھا۔ چاہے جتنا مرضی چھپانے کی کوشش کی جاتی۔ فریحہ کے دل میں بجتی خطرے کی گھنٹیوں سے کچھ بھی چھپانا محال تھا۔

"مجھے بتاؤ۔ عون کے ساتھ پرابلم کیا ہے؟ وہ ایسا تو نہیں تھا۔" اس نے دوٹوک عاشر سے وہ سوال پوچھ ہی لیا تھا۔ جس سے بچنے کی خاطر عاشر' فریحہ کے سامنے بھی نہیں آتا تھا۔ وہ جیسے بے بس ہو گیا۔

"حد ہے یار! کوئی پرابلم نہیں۔ تمہیں کس نے بتا دیا؟" عاشر بلاوجہ مسکرانے لگا۔ شاید فریحہ کو مطمئن کرنے کے لیے۔

"میرے دل نے۔" فریحہ کے جواب نے عاشر کو لحہ بھر کے لیے لاجواب کر دیا تھا۔

"کیا پتا تمہارا دل جھوٹ کہتا ہو۔" عاشر کے لیے بات بنانی مشکل ہو گئی تھی۔

"ایک بات بتاؤں عاشر! دل سب کچھ کہتا ہے لیکن جھوٹ نہیں کہتا۔" فریحہ کا انداز ہنوز وہی تھا' بلا کا سنجیدہ۔

"اور تم کچھ بتاؤ یا نہ بتاؤ۔ میرا دل کچھ اچھا نہیں بتا رہا۔"

"رہنے دو بس۔ دل کی حکایتیں۔ ہر بات اس کم بخت کی نہیں سنتے۔ ورنہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ نرا خسارہ اٹھانا پڑتا ہے۔" عاشر کا لہجہ کچھ افسردہ سا ہو گیا تھا۔

"اور مجھے لگتا ہے میرا دل خسارہ اٹھانے والا ہے۔" فریحہ کے اگلے الفاظ نے عاشر کو دم بخود کر دیا تھا۔ وہ بے ساختہ بول اٹھا۔

"اللہ نہ کرے، کیسی باتیں کرتی ہو۔"
"کیا تمہیں نہیں لگتا؟" وہ عاشر کی سننے کی بجائے اپنی کہے جا رہی تھی۔ کھوئے کھوئے اداس سے لہجے میں۔ عاشر کو ہول اٹھنے لگے تھے۔
"اللہ کی پناہ۔ بس کرو فریحہ! مت جان نکالو۔ ابھی مجھے اپنے بھائی کا ولیمہ کھانا ہے۔" وہ گفتگو کو پھر سے مزاحیہ ٹچ دے رہا تھا لیکن اسے لگتا تھا کہ اس کی کوشش نری بے کار ہے۔
"پتا نہیں۔۔۔ وقت کا کچھ اعتبار نہیں لگ رہا۔" فریحہ نے دبی آواز میں کہا۔
"مجھے تو تمہارا اعتبار نہیں لگ رہا۔" عاشر خفا سا ہوا تھا۔ "بندہ کوئی ڈھنگ کی بات سوچتا ہے۔ شکل اچھی نہ ہو تو بات اچھی کر لیتا ہے لیکن یہاں تو تم یکے بعد دیگرے ڈرائے جا رہی ہو' تاکہ مارے خوف کے ہر کسی کی گھگھی بندھ جائے یا ٹینشن کی وجہ سے سرسام ہو جائے۔" اس نے اچھی بھلی فریحہ کی کلاس لے لی تھی۔ فریحہ کچھ دیر تک خاموش ہو گئی تھی۔ جانے کیا سوچنے لگی تھی۔ پھر جب بولی تو اس کا لہجہ بلا کا سرد اور مضطرب تھا۔
"تم ہی بتاؤ۔۔۔ مجھے شادیانے بجانے چاہئیں؟ تمہارا بھائی نہ جانے کس کے پیچھے باؤلا ہو چکا ہے۔" وہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔ عاشر ہکا بکا رہ گیا تھا۔ یہ فریحہ کو کس نے بتا دیا؟ پھر ابھی کچھ کنفرم تو نہیں تھا۔ یہ ہوائی کس نے اڑا دی تھی؟ عاشر بے چین سا ہو گیا۔ فریحہ کو عون کے بدلتے معاملات، معمولات کا کیسے پتا چلا؟
"کس نے بکواس کی؟ کس نے بتایا تمہیں؟" اس نے بلا کے روکھے لہجے میں پوچھا۔ فریحہ جیسے بولی اور بولتی چلی گئی تھی۔ 'اس کی بے گانہ ہوتی روش نے' اس کے اجنبی انداز نے' اس کے بدلتے معمولات نے اور۔۔' عاشر جیسے خود دم بخود رہ گیا تھا۔ ابھی اس نے فریحہ کو کچھ بتایا ہی نہیں تھا اور وہ ساری کہانی، فریحہ نم آواز میں ترتیب کرتا رہی تھی۔ فریحہ کو آخر کس نے بتایا تھا؟ آخر کس نے؟ وہ یہ جانتا ہی نہیں تھا کہ فریحہ کو اس کے دل نے بتایا تھا۔ اس کے دل نے۔۔



اس نے سنہری ڈھلتی سہ پہر کو سمٹ کر گلابی شام میں بدلتے دیکھا اور مسکرا دی تھی۔ پھر اس نے جمائی کو روکا۔ گلاس ونڈو سے کرٹن ہٹا کر وہ لاؤنج کے پار اترتی گلابی شام کے حسن کو دیکھ رہی تھی۔ محسوس کر رہی تھی۔ آج کل بات بہ بات اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ سچ تو یہ تھا اس کا انگ انگ مسکرا رہا تھا۔ ماہ رو نے کرسٹل ٹیبل پہ رکھا اپنا سیل اٹھایا اور چپکے سے کئی ایس ایم ایس ایک ساتھ سینڈ کر دیے۔ اب وہ اپنے عالی شان بنگلے کے لاؤنج میں ننگے پاؤں گول گول گھومتی رقص کر رہی تھی۔ اس کے بچکانہ سے دیوانے پن کو دیکھتی' کچن میں اس کا پسندیدہ کیک کریم سے سجاتی ماہم نے مسکرا کر ماہ رو کو دیکھا اور پھر بے ساختہ ہنس پڑی۔
معاً" شازمہ سیڑھیوں سے اترتی دکھائی دی تھی۔ وہ شاید کہیں باہر جا رہی تھی۔ جانے سے پہلے وہ ماہ رو کے قریب لحہ بھر کے لیے رک گئی تھی۔ پھر اس نے مسکرا کر ماہ رو سے کہا۔
"تمہارا پرنس ابھی تک پرپوزل لے کر نہیں آیا۔ بہت لیزی ہے یار! اتنی دیر کرے گا تو تمہارے ڈیڈی کسی اور کو فائنل کر دیں گے۔" شازمہ نے نزاکت سے تھرکتی ماہ رو کو بریک لگانے پہ مجبور کر دیا تھا۔ شازمہ نے پھر سے انتہائی ملائمت سے کہا۔
"سم ٹائم اپنے پرنس کو یاد کرواتی رہا کرو۔۔۔ بہت جلد تمہارے ڈیڈی سیٹھ ہاشم کو اوکے کر دیں گے۔" شازمہ نے عادتاً" بے پر کی اڑائی تھی۔ ماہ رو اپنے حسین چہرے پہ ہاتھ پھیر کر دلکشی سے مسکرا دی۔
"ڈیڈی مجھ سے پوچھے بغیر کچھ نہیں کریں گے۔" اس کا انداز بھی خاصا مہذب تھا۔ تاہم ان کی تکرار کو انجوائے کر رہی تھی۔ کیونکہ وہ دونوں ہی مہذب انداز میں ایک دوسرے کے بخیے ادھیڑ لیتی تھیں۔ میٹھے طنز انجوائے کرتی تھیں۔
"بائی دا وے، تمہارا مشن امپاسبل کہاں تک پہنچا؟" شازمہ شاید کسی پیش رفت کا پوچھنا چاہ رہی

تھی۔

"ڈونٹ وری ڈیئر ممی! بہت جلد گڈ نیوز سننے کو ملے گی۔" شازمہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر اس کے جلوے بکھیرتے حسن کو دیکھ کر کچھ طنزیہ انداز میں بولی تھی۔

"آف کورس۔۔۔ گڈ نیوز کا ہی انتظار ہے' کون کافر ہو گا جو تمہیں انکار کرے۔

گڈ لک ہے اس عام سے شاپ کیپر کی۔ ہائی فائی جنیٹری کا حصہ بن جائے گا۔ لائف اسٹائل چینج ہو گا۔ ایک ہی جمپ میں اپر کلاس کا نمائندہ بن جائے گا۔ اسے ویل اینڈ بھی تو ہونا ہی ہے۔" شازمہ نے ماہ رو کے کھلے کھلے حسین روپ سے جیلسی فیل کرتے ہوئے پھر سے مٹھاس بھرا طنز کیا۔

"پلیز ڈونٹ مائنڈ۔۔۔ یو نو' میں تو بہت ٹرتھ فل ہوں۔ دل میں رکھتی نہیں۔ جو کہنا ہوتا ہے کہہ دیتی ہوں۔ چاہے برا لگے یا اچھا۔ تم کمفرٹنگ (راحت جاں) ہو' اپنے کنگ ڈم (راج پاٹ) کو انجوائے کرو۔ میں تمہارے پرسنل افیئرز میں انٹر فیئر نہیں کر سکتی۔ بٹ تمہارے ڈیڈی کے پرسنل ریلیشن کی وجہ سے بھی ۔۔۔ ہیلپ فل رہوں گی۔ اوکے پریٹی' بائے بائے۔" شازمہ نے دو انگلیوں سے ماہ رو کے چکنے گال کی ملائمت کو محسوس کیا اور ٹک ٹک چلی گئی تھی' جبکہ ماہم کچن میں کھڑی ہنس ہنس کر بے حال ہو رہی تھی۔ اس نے کریم بھرا ہاتھ منہ پہ رکھ لیا تھا۔ گویا ہنسی روکنے کی کوشش میں بے حال تھی۔

"مائی گاڈ۔۔۔ اس کو کیا ہوا تھا؟ ویری اسٹرینج! ایسی ایلو کیونسی (خوش بیانی) ایسی ویل فار میڈر ایسی پولائٹ' ماہ رو! میرے بازو میں چٹکی کاٹنا' کیسی ایکٹریس عورت ہے یار! منٹوں میں پٹا گئی۔" ماہم کی ہنسی نہیں رک رہی تھی۔

"ماہ رو! تمہاری ساس بھی ایسی قیامت ہوئی تو ہو چکا تمہارا گزارا۔" ماہم نے لمبے لمبے سانس لے کر بمشکل کہا تھا۔

"نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔ ان میں تو بہت ایلی گینسی ہے۔ وہ بہت ویل مینرڈ ہیں۔ ویری گریس فل لیڈی۔" وہ عون کی امی کو تصور میں رکھ کر بڑے دل سے تعریف کر رہی تھی۔

"آہم۔۔۔ ابھی سے ساسو ماں کو پٹانے والے اسٹائل۔۔۔" ماہم نے اسے ۔۔۔ چھیڑا تھا۔ پھر کچن سے نکل کر ماہ رو کے کہنے پہ میوزک چینج کر دیا۔ اب کوئی گائیکہ بڑی مدھر آواز میں غزل گا رہی تھی۔ یوں کہ ماہ رو کو لگا۔ جیسے اس کے جذبات کی عکاسی کر رہی ہو۔ اس کے دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش آ گیا تھا۔

وہ جو دعوے دار تھا شہر میں کہ سبھی کا نبض شناس ہوں
کبھی آ کر مجھ سے پوچھتا کہ میں کس کے غم میں اداس ہوں

مصنفہ کی آواز کا جادو تھا۔ جس نے پورے ماحول پر سحر طاری کر دیا تھا۔ ایک مسحور کن ماحول میں گائیکہ کی آواز کا جادو سر چڑھ کے بولنے لگا۔ ماہ رو تو کسی اور ہی جہان میں نکل گئی۔ مغنیہ نے جیسے اس کے دل کا ہر درد بڑے پیار سے سروں کے نام پہ چھیڑ دیا تھا۔

یہ میری کتاب حیات ہے' اسے دل کی آنکھ سے پڑھ ذرا
میں ورق ورق تیرے سامنے' تیرے روبرو تیرے پاس ہوں

ماہ رو کے دل میں کہیں میٹھا میٹھا سا درد اٹھ گیا تھا۔ کہیں مٹھاس بھری ٹیسوں نے نغمہ چھیڑ دیا تھا۔ اس کے ہونٹ گائیکہ کی آواز کے ساتھ ہی ہل رہے تھے۔

یہ تیری امید کو کیا ہوا' کبھی تو نے غور نہیں کیا
کسی شام تو نے کہا تو تھا' تیری سانس ہوں تیری آس ہوں

ماہ رو کی سانس جیسے سینے میں رکنے لگی تھی۔ گھٹ گھٹ کر چلنے لگی تھی۔ چل چل کر تھمنے لگی تھی۔ یہ دربار دل میں کون آ رہا تھا؟ یہ کس کے قدموں کی چاپ تھی۔

اس نے ریشمی گیلی پلکوں کو اٹھایا اور دنگ رہ گئی تھی۔ ماہ رو کے سامنے اس کا مجسم خواب کھڑا تھا۔ وہ الوژن نہیں حقیقت تھا۔ وہ حقیقت بن کے ماہ رو کے مقابل کھڑا تھا۔ اتنا قریب کے وہ ہاتھ بڑھا کر اس کی پیشانی چھو سکتی تھی۔ اتنا قریب کہ وہ اس کے گرم سانسوں کی مہک سن سکتی تھی۔ کیا وہ خواب تھا جو اتنا قریب تھا؟ اس انداز میں کہ ماہ رو اسے پہچان بھی نہ

پاتی۔ کوئی اور وقت ہوتا' کوئی اور صورت حال ہوتی تو عون عباس کو اپنے اس بنگلے کے لاؤنج میں کھڑا پا کر وہ اپنی پوری زندگی خیرات کر آتی۔ کیا وہ ماہ رو کا یقین بن کر آیا تھا؟ کیا وہ ماہ رو کا عشق بن کر آیا تھا' اس نے دل کے مقام پہ ہاتھ رکھ لیا۔۔۔ اور دھڑکنوں کی تسبیح سننے لگی۔
اگر اس کے سارے گمان سچ ثابت ہو جاتے تو ماہ رو سرفراز اتنی بڑی شادمانی کا بار اٹھا سکتی تھی؟ ہرگز نہیں۔۔۔ تو پھر ایک بات اس کا وجدان کہہ رہا تھا۔ آج پہلی مرتبہ ماہ رو سرفراز کا مجسم خواب کسی الہامی کیفیت میں نہیں۔ ایک ایسے انداز میں جو کسی باشعور سمجھ دار انسان کا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ آتش فشاں کا کوئی لاوا لگ رہا تھا۔ جو پھٹ رہا تھا۔ وہ ماہ رو سرفراز کو اپنی محبت سے سرفراز کرنے نہیں بلکہ راکھ کرنے آیا تھا۔ ماہ رو سرفراز پہ حالت نزع طاری تھی۔ اس کی آنکھوں نے لہو رنگ خون چھلکاتی ندی کو دیکھا تھا اور اس کے بھرے بھرے کٹاؤ دار ہونٹوں سے زہر نکل رہا تھا۔ وہ ایسا ہی زہر دار لگ رہا تھا۔ وہ قہر بن کر ٹوٹ پڑا تھا اور اس کے سم قاتل میں لتھڑے الفاظ۔۔۔؟

"تمہیں دیکھ کر میں سمجھ گیا۔ تم ہر سمجھ سے بالاتر ہو۔ تم آسائشات میں گھری ہوئی آزادانہ ماحول کی پروردہ 'لبرل ازم کے نام پہ بے حیا' بے باک' تمہاری لیے ہر اچھی صورت کی مرد کو محبت کے نام پہ پھانسا دینا مشکل نہیں ہو گا۔ تمہاری سوسائٹی میں آٹھ دس افیئرز' چھوٹے موٹے عشق' ہلکی پھلکی محبتیں یقیناً" ایک ماڈرن رواج کے تحت پروان چڑھتی ہوں گی۔ لیکن ہمارے ہاں اس تمام عشق پیچاں کے کھیل کو بے حیائی اور بے غیرتی تصور کیا جاتا ہے۔ ہم لوگ خاندان 'روایات' اقدار اور حدود و قیود پہ جان دیتے ہیں۔ عزت ہمارا اثاثہ ہے۔ کردار ہمارا سرمایہ ہے اور حیا ہماری وراثت ہے اپنے نفس کو طشتری میں سجا کر لذت اور صرف لمحاتی لذت کے پیچھے خوار ہونے والی عورتوں سے مجھے گھن آتی ہے گھن۔۔۔" اس نے ہنوز سابقہ دھیمے غراتے لہجے میں ماہ رو کے قریب آتے ہوئے ایک زوردار دھکا دیا تھا۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح لہرا کر زمین پر گری تھی۔۔۔ اور تب عون عباس نے اس کے قریب فرش پہ تھوک دیا تھا۔

"میں تمہارے منہ پر تھوک رہا ہوں۔۔۔ اس لیے کہ تمہیں ہمیشہ یاد رہے کسی مجھ جیسے مرد کو محبت کے نام پر اداؤں کے جال میں پھنسا لینا اتنا آسان بھی نہیں ۔۔۔ اور میرے اختیار میں ہوتا تو تمہیں ویسا ہی طمانچہ رسید کرتا جو میرے باپ نے میرے منہ پہ مارا تھا۔ صرف تمہاری وجہ سے۔" وہ جس طرح طوفانی انداز میں آیا تھا۔ اسی طرح گرم' پرحدت جھونکے کی طرح پلٹ گیا۔ یوں کہ فرش پر گری ماہ رو کے جسم میں جنبش تک نہیں ہوئی تھی۔ حرکت تک نہیں ہوئی تھی۔

کچن کے ڈور فریم میں کرسٹل کی ڈش میں تازہ بتازہ کیک رکھے کھڑی ماہم کو بھی جیسے جھٹکا لگا تھا۔ اس کے ہاتھ سے کرسٹل کی ڈش گری اور چکنا چور ہو کر فرش پہ بکھر گئی۔

وہ جیسے گہری نیند سے ہڑبڑا کر ماہ رو کی طرف دیوانہ وار لپک کر آئی تھی۔ پھر اس نے چیخ چیخ کر سارا گھر اکٹھا کر لیا تھا۔ کیونکہ ماہ رو خرد سے بیگانہ ہو چکی تھی۔



(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

مکمل ناول

نایاب جیلانی

دل لوٹ کے ہار اٹھا

تیسری قسط

اسے گیندے کے پھولوں سے سجی لڑکیوں والے نقش جھولے پہ بٹھادیا گیا تھا۔ اس کے اردگرد کزنز کا جھرمٹ تھا اور ڈھولک کی تھاپ پہ اب بھی شادمانی کے گیت گائے جارہے تھے۔ اسے رسم کے لیے باہر لایا گیا تھا۔ اور اس وقت گیندے اور گلاب کے پھولوں سے سجی فریحہ دیکھنے والوں کو بھی گیندے کا کوئی پھول ہی لگ رہی تھی۔

لیکن اس وقت فریحہ کے چہرے پہ کوئی وہم 'وسوسہ یا خدشہ نہیں تھا۔ بلکہ ایک الوہی مسکان نے اس کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ وہ دھیما دھیما مسکراتی بہت سوں کو انتہائی خوب صورت لگ رہی تھی۔

عاشر نے اس کے کئی پوز کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کرلیے تھے۔

جب رسم شروع ہونے لگی تو فریحہ کی امی نے تائی سے کہا۔

"ابھی تک عون نہیں آیا؟"

"آتا ہی ہوگا۔ رستے میں ہے۔ کہہ رہا تھا کہ فرض ادا کرنے گیا ہوں۔ بڑا ضروری فرض تھا۔ آنے والی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے۔" جواب قریب کھڑے عاشر نے دیا تھا۔ تائی اور فریحہ کی امی مطمئن ہوگئی تھیں۔ پھر وہ کیمرہ اٹھا کر اسٹیج پہ چڑھ آیا۔ فریحہ کی ابہام اور وسوسے بھی دور کرنے تھے۔ اسے دیکھ کر فریحہ نے اپنی پچویشن کی پروا کیے بغیر جھٹ سے شکوہ کیا۔

"دیکھ لو' تمہارا بھائی آج بھی نہیں پہنچا۔"

"دس منٹ میں پہنچنے والا ہے۔ تم خاطر جمع رکھو۔" اس نے قریب سے کیمرہ فوکس کیا اور کھٹ کھٹ دو تین تصویریں بنالی تھیں۔

"میرا بھائی تمہارے سارے شکوے دور کردے گا۔" عاشر نے شرارتاً" کہا۔

"رہنے دو' کیا میں اسے جانتی نہیں..." فریحہ خفا ہوئی۔

"تم جانتی ہی تو نہیں۔" وہ ایک اور تصویر بناتا ہوا بولا تھا۔ "اور تم تو منہ بند رکھو... سارے دانت نظر آرہے ہیں۔" اس نے فریحہ کو بے ساختہ ڈپٹا۔ معاً" پنڈال میں عون آتا دکھائی دیا تھا۔ اسے دیکھ کر لڑکوں اور لڑکیوں نے ہوٹنگ شروع کردی تھی۔

وہ مسکراتا ہوا اسٹیج کی طرف ہی آرہا تھا۔ عاشر نے اسے رستے میں جالیا۔

"جا ذرا اپنی شکل بدل کے آ۔ یہ بو والے کپڑے چینج کر حد ہے گندا سندا اٹھ کے چلا آیا۔"

"شیروں کے منہ دھلے ہوئے ہوتے ہیں۔" کسی نے عون کا کندھا تھپکا تھا۔

"آج گندا رہے گا تو کل روپ بھی چڑھے گا۔ تازہ شیو شوف بنا کر۔" منا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"اس پہ تو ابھی بھی روپ ہے ماشاء اللہ۔ رف اینڈ ٹف حلیے میں بھی۔" عون کی خالہ نے قربان ہوتی نظروں سے دیکھا تھا۔

"تو پھر اسٹیج پہ جانے دیں۔" عون نے انکساری کا مظاہرہ کیا۔ گویا تیار شیار ہونے کا موڈ نہیں تھا۔

"ہرگز نہیں۔" کائنات اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں طلوع ہوئی تھی یوں کے پورے اسٹیج کا

گھیراؤ کر لیا تھا۔ عون ہکا بکا رہ گیا۔
"یہ کیا؟"
"اسٹیج پہ چڑھنے کا ٹیکس دیں؟" اس نے ہتھیلی پھیلا رکھی تھی۔
کائنات کے برابر ثنا اور مریم بھی تن کے کھڑی ہو

گئیں۔ یک نہ شد' تین تین شد۔۔۔ وہ تو چکرا گیا تھا۔ ان کے جھرمٹ نے پیچھے موجود فریحہ کو چھپا دیا تھا۔ اس نے گردن اچکا کر پیچھے دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ پھر بھی اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ فریحہ دبا دبا سا مسکرا رہی ہے۔
"نکالو بھی۔۔۔ یہ ٹیکس تو ادا کرنا ہو گا۔ قومی خزانہ آج کل خالی ہے۔" ثنا نے اس کا کندھا ہلایا۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹا تھا۔
"میں کیوں دوں؟ کیا قاسم اور عاصم نے دیا تھا؟" وہ



چڑ کر بولا تھا۔
"ہماری دفعہ یہ رسم ایجاد نہیں ہوئی تھی۔" مریم نے تنک کر کہا۔
"میری دفعہ کیوں ہوئی ہے؟" عون نے ٹیکس دینے پہ صاف کنجوسی دکھائی تھی۔
"اب تو ہر دفعہ ہو گی۔ عاشر کی باری میں مزید نئی رسومات سامنے لائیں گے۔ یاسر اور عامر کی دفعہ کچھ اور رسمیں انٹروڈیوس کروائیں گے۔" ثنا نے اپنی طویل کاروباری پرافٹ ایبل پلاننگ ان کے گوش و گزار کی تھی۔۔۔۔ پوری پنڈال میں ایک ہنگامہ مچ گیا تھا۔
"یہ فاؤل ہے۔۔۔ فاؤل ہے۔" لڑکوں نے خوب احتجاج کیا تھا۔ عون کو جان چھڑوانی مشکل لگ رہی تھی۔ پھر وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ کس طرح سے پیچھا چھڑوائے؟ وہ سوچتا رہا تھا۔ پھر ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش کروایا۔
"اوکے' اوکے۔۔۔ میں شاور لے لوں' چینج کر آؤں۔۔۔ پھر ٹیکس کی رقم طے کریں گے بولو منظور؟" اس نے کائنات اور بھابھیوں سے بڑی ہوشیاری کے ساتھ پیچھا چھڑوا لیا تھا۔ پھر بالوں میں ہاتھ پھیرتا پنڈال سے باہر نکلا۔۔۔ معا" آندھی و طوفان کی طرح آتے قاسم نے اس کا بازو دبوچا تھا اور پھر ایک جھٹکے سے عون کو کھینچتا پنڈال سے دور' بہت دور لے آیا۔
عون اس افتاد پہ اچانک بوکھلا گیا تھا۔ قاسم کے تیور انتہائی خطرناک تھے اور عاصم کے تاثرات بھی کم و بیش ایسے ہی تھے۔
عون کو کسی بڑی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔ نجانے کیا ہوا تھا؟ اس کی چھٹی حس کوئی مثبت الارم نہیں دے رہی تھی۔
اس نے بڑے دونوں بھائیوں سے وجہ جاننے کی کوشش میں لب کشائی کی تھی یوں کہ وہ دونوں کسی بپھرے شیر کی طرح بڑے خوفناک انداز میں غرائے تھے۔
"تم نے اچھا نہیں کیا عون! اپنے باپ دادا کی عزت کو خاک میں ملا کر بالکل اچھا نہیں کیا۔۔۔۔ تم نے ہمیں کسی قابل نہیں چھوڑا۔۔۔ تم نے ابو کا سر ہمیشہ کے لیے جھکا دیا ہے۔۔۔ تم نے ابو کو پورے خاندان' برادری' رشتے داروں' عزیزوں اور احباب کے سامنے ذلیل کر دیا ہے تم نے ہمیں تباہ کر دیا ہے۔" قاسم کے آگ بھرے یہ الفاظ عون کے دماغ کو دہکتے الاؤ' جلتی بھٹی اور شعلوں کے سپرد کر گئے تھے۔ اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔ آخر عون نے کیا کیا تھا؟ اس سے کون سا گناہ سرزد ہوا تھا؟ اسے کچھ بتایا نہ گیا۔ وہ سارے رستے پوچھتا رہا۔ چیختا رہا۔ غراتا رہا۔ یہاں تک کہ اسے ایک بند کمرے نما ہال میں پہنچا دیا گیا وہاں ابو بھی تھے۔ چاچا بھی تھے۔ اس کے بھائی بھی تھے۔ ابو اور چاچا خون رنگ زخمی نگاہوں سے اسے گھور رہے تھے۔ ان آنکھوں میں کیا کچھ نہیں تھا۔ دھول' مٹی' ریت' غصہ' دکھ' ملال' غم۔
جانے ان سب کو کیا ہوا تھا۔ وہ تو چینج کرنے کی غرض سے پنڈال کی رونق سے باہر نکلا تھا۔ قاسم اور عاصم اسے گاڑی میں بیٹھا کر اس عمارت میں لے آئے تھے اور وہ دونوں بھی غم و غصے سے بے حال تھے۔
وہ عمارت کی پچھلی طرف سے انٹر ہوئے تھے۔ عون گھبراہٹ' غصے' اشتعال میں دیکھ نہیں سکا تھا۔ یہ عمارت کس چیز کی تھی؟
اور اب اس ہال نما کمرے میں چند اجنبی چہرے بھی دکھائی دیے تھے۔
اس کا دل کہہ رہا تھا کچھ انہونا ہونے والا ہے؟ آخر کیا ہونے والا تھا؟ عون کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد عون پہ ایک نفرت انگیز نگاہ ڈال کر ابو نے کسی باریش آدمی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔
"مولوی صاحب! بسم اللہ کیجیے۔"
ابو کی آواز میں دکھ تھا۔ شکستگی تھی' غصہ تھا اور سب سے بڑھ کر عون کے لیے شدید نفرت تھی۔ عون کا دم جیسے گھٹنے لگا۔ ابو کا اشارہ پاتے ہی مولوی نے خطبہ

بلند آواز میں پڑھا تھا۔ پھر کچھ رسمی کاروائی ہوئی تھی۔ رجسٹر پہ دستخط لیے گئے تھے۔ یہ کوئی ایجاب و قبول کی رسم تھی؟ یہ کسی کے نکاح کی رسم تھی؟ آخر یہ سب کیا تھا؟ کیوں تھا؟ کس لیے تھا؟

عون نے ابو کی زہر بھری گھوریوں سے خائف ہو کر غائب دماغی سے سائن کر دیے تھے۔ پھر ایک سوٹڈ بوٹڈ آدمی نے ابو اور چاچا کو گلے لگا کر مبارک باد دی تھی۔

یہ مبارک کس سلسلے کی کر دی تھی؟ یہ نکاح کس کا تھا؟ عون کا دماغ بند ہونے لگا۔ شعور کھونے لگا۔ عقل گم گئی۔ فہم مر گیا۔

اسے کچھ دیر بعد اسی سوٹڈ بوٹڈ آدمی نے گلے لگایا تھا۔ وہ آدمی کون تھا؟ وہ عون سے کیوں مل رہا تھا؟ بہت دیر بعد اس کے حواس ٹھکانے آئے تھے۔ بہت دیر بعد اس کی عقل نے کام کرنا شروع کیا تھا۔ بہت دیر بعد عون عباس کو پتا چلا تھا کہ یہ نکاح کی کاروائی ہو رہی تھی۔ اس کا نکاح کر دیا گیا تھا۔ فریحہ سے نہیں 'ماہ رو سرفراز سے اور یہ عمارت کسی ہوٹل کا کمرہ نہیں تھا بلکہ ایک نامور ہسپتال کی بلڈنگ تھی۔

اور جب تک اس کی عقل، شعور اور فہم نے کام کرنا شروع کیا تھا تب تک بہت دیر ہو چکی تھی... اتنی دیر کہ عون عباس منجمند ہو کر پتھر کا بت بن گیا تھا۔



ماہ رو کا نروس بریک ڈاؤن ہوتے ہوتے بچا تھا۔

اس وقت وہ سکون آور دواؤں کے زیر اثر تھی۔ اگر لمحہ بھر کی تاخیر کے بعد اسے ہسپتال لایا جاتا تو تب تک ماہ رو کو برین ہیمبرج بھی ہو سکتا تھا۔

یہ تو ماہم تھی جو نوکروں کی مدد سے بروقت ماہ رو کو ہسپتال لے آئی تھی۔ انتہائی ذمہ دار ڈاکٹرز کی فوری ٹریٹمنٹ نے ماہ رو کو کسی بھی انتہائی تکلیف سے بچا لیا تھا۔

اسے ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی ہوش آ گیا تھا۔ لیکن ہوش میں آنے کے بعد ایک قیامت سرفراز احمد کی منتظر تھی۔ وہ عالم غشی میں بھی "عباس عباس" پکارتی رہی تھی۔ وہ ہوش میں آ کر بھی چیخ چیخ کر روتی رہی تھی۔

"عباس! تم کہاں ہو۔ تم رکتے کیوں نہیں؟ میں تمہارے پیچھے بھاگ بھاگ کر مر جاؤں گی۔ عباس! رک جاؤ۔ عباس! لوٹ آؤ... دیکھو میں بری نہیں.... میں بری نہیں۔" وہ پچھلے ایک گھنٹے سے چلا رہی تھی۔ رو رہی تھی۔ سرفراز احمد کے دل پہ جیسے قیامت بیت گئی تھی۔ وہ تڑپتی ماہ رو کو سینے سے لگا کر رو پڑے تھے۔

ابھی اس کی حالت کو دیکھ کر ڈاکٹر واحدی نے بھی سرفراز احمد سے عباس کے متعلق پوچھا تھا۔ سرفراز احمد خود انجان تھے۔ بھلا کیا بتاتے؟ ان سے اکلوتی بیٹی کا رونا دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ صدمے سے ان کا دل پھٹ رہا تھا۔ وہ خود زندگی میں پہلی مرتبہ ماہ رو کو اس طرح تڑپتا دیکھ رہے تھے۔ ان کی جیسے جان نکل رہی تھی۔ یہ کون تھا جس نے ان کی شہزادی کو اس حال تک پہنچایا تھا۔ وہ زمین کے اوپر تھی' زندہ تھی لیکن چند ہی گھنٹوں میں ژولیدہ حال ہو چکی تھی۔ وہ ڈاکٹر واحدی کے بتانے پر خود بھی شاکڈ رہ گئے تھے۔ ڈاکٹر واحد نے تنہائی میں انہیں بہت کچھ بتایا تھا۔ "آپ کی بیٹی عباس نامی کسی

جوان سے انٹیچ منٹ رکھتی ہے۔ یہ کوئی شدید صدمہ یا ٹارچر کیے جانے کا اثر ہے۔ آپ ماہ رو کو اعتماد میں لے کر اس مسئلے کا حل کریں۔" ڈاکٹر واحدی کے بتانے پر وہ نظر چرا گئے تھے۔ اور اس وقت ماہ رو کا تڑپ تڑپ کر رونا سرفراز احمد کے لیے کسی آزمائش سے کم نہیں تھا۔ وہ ان کے کندھے سے سر پٹخ رہی تھی۔ اس حال میں کہ ماہ رو کے آنسوؤں سے ان کا شانہ تر ہو چکا تھا۔

"ڈیڈی! بتائیں مجھے' میں بری لڑکی ہوں؟ میں اچھی لڑکی نہیں ہوں؟ اگر میں بری لڑکی ہوں تو آپ نے مجھے اچھا کیوں نہیں بنایا؟ ڈیڈی وہ کہتا ہے میں بری ہوں.... ڈیڈی! اسے جا کر بتائیں میں بری نہیں ہوں۔ میں گندی نہیں ہوں۔ اگر میں بری ہوں تو اس کے لیے اچھی بن جاؤں گی۔ ڈیڈی! میں اچھی ہو جاؤں گی۔ پلیز' عباس کو لا دیں۔ عباس کو واپس لا دیں۔" ماہ رو چیخ چیخ کر ایک مرتبہ پھر خرد سے بیگانہ ہو گئی تھی۔ یوں کہ سرفراز احمد بھی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے تھے۔ انہیں کچھ کچھ معاملہ سمجھ میں آ گیا تھا۔ انہیں ماہ رو کی حالت زار کا سبب سمجھ میں آ گیا تھا۔ ماہ رو اس قدر آگے تک پہنچ گئی تھی اور انہیں خبر ہی نہیں ہو سکی۔ وہ کیسے باپ تھے؟ انہیں علم نہیں ہو سکا' اور ان کی بیٹی اتنے بڑے بڑے کربناک فیز سے گزر گئی۔ ان کا ملال کم نہیں ہو رہا تھا۔ پچھتاوا کم نہیں ہو رہا تھا۔

ماہ رو کی حالت کچھ سنبھلی تو انہوں نے ماہم کو بلا لیا تھا۔ تب شازمہ بھی موجود تھی۔ ماہم نے شازمہ کی موجودگی میں کچھ کھل کر نہیں بتایا تھا۔ پھر بھی اس کی ڈھکی چھپی باتوں کو سرفراز احمد سمجھ گئے تھے۔ ان کی بیٹی ان حالوں تک پہنچ گئی تھی۔ وہ کیسی کیسی اذیتوں سے گزر گئی تھی۔ انہیں ملال گھیرے ہوئے تھا۔ انہیں پچھتاوے گھیرے ہوئے تھے۔ ماہ رو کا اقرار محبت انکشافات کا مرحلہ بھی تھا۔ انہیں لگ رہا تھا' ماہ رو کی تربیت میں کوئی کمی رہ گئی تھی۔ کوئی کمی رہ گئی تھی۔ ورنہ یوں تو نہ ہوتا۔ آج انہیں شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ ماہ رو کی اپنی ماں ہوتی تو شاید ایسی صورت حال میں اسے نفسیاتی اور جذباتی سہارا دیتی۔ اس کا دکھ بٹاتی۔ اسے سمجھاتی اس تکلیف میں اسے اکیلے پن کا احساس نہ ہونے دیتی۔

شازمہ سے کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ وہ ماہ رو کا آزار کم کرتی؟ شاید کبھی نہیں۔

سرفراز احمد شدید پریشان تھے۔ اور اتنا انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ ماہ رو مجھنے سمجھانے والے فیز سے آگے نکل چکی تھی۔ وہ عباس سے محبت میں بہت آگے تک جا چکی تھی۔ جہاں سے واپسی ناممکن تھی۔

پھر انہیں اپنی بیٹی کی خوشی کے لیے کوئی سدباب تو کرنا ہی تھا۔ وہ کوئی مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے باپ تو نہیں تھے۔ اتنی سی بات پر بیٹی کو معتوب ٹھہرا دیتے.... وہ تو اپنی بیٹی کی خوشی کے لیے آخری حد تک بھی جا سکتے تھے۔ انہیں ماہ رو کی خوشی ڈھونڈنی تھی۔ انہیں عباس تک پہنچنا تھا۔ عون عباس تک جانا تھا اور یہ سرفراز احمد کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں تھا کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔

لیکن ہوا کچھ اس طرح سے۔

سرفراز احمد ابھی اپنے ذرائع الرٹ کر ہی رہے تھے جب شازمہ نے وہ کام کر دکھایا' جو ان کے گمان میں خاصا کٹھن اور مشکل ترین تھے۔

وہ جو سوچ رہے تھے کہ انہیں خود اپنی بیٹی کا پروپوزل لے کر رحمان اور فرقان صاحب کے پاس جانا ہو گا.... شاید ان کی منت بھی کرنا پڑے۔ شاید انہیں مجبور بھی کرنا پڑے۔ شاید بیٹی کا باپ ہو کر التجا بھی کرنا پڑے۔ سرفراز احمد اس وقت دم بخود رہ گئے تھے جب خود بخود عون عباس کا باپ' اس کا چاچا اور اس کے بھائی شرمندہ حالت میں' انتہائی شرمسار' افسردہ' رنجیدہ اور سر جھکائے سرفراز احمد سے معافی مانگنے پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے نہ صرف سرفراز احمد سے معافی مانگی تھی بلکہ بڑی عاجزی کے عالم میں سر جھکا کر اپنے بیٹے کی غلطی اور گناہ تسلیم کرتے ہوئے ماہ رو کا رشتہ طلب کیا اور فوری نکاح پہ اصرار بھی کیا۔

یہ سب انتہائی اچانک رد عمل کے طور پر ہوا تھا۔

کیا عباس نے خود رشتہ بھیج دیا تھا۔ جب اسے ماہ رو کی تکلیف اور ہسپتال میں ایڈمٹ ہونے کا پتا چلا؟ سرفراز احمد نے کسی بھی بات پہ غور نہیں کیا تھا ان کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا کہ جس خوشی کو وہ خود عون عباس کے گھر سے ڈھونڈ کر لاتے وہ خود بخود چل کر ان کی دہلیز پر آگئی تھی۔ یہ ان کی خوش نصیبی نہیں تو کیا تھا؟

یوں عون کے والد اور چاچا کے اصرار پہ فوری طور پر ہسپتال میں ہی نکاح کی کاروائی عمل میں لائی گئی تھی۔ رخصتی کے لیے اگلا دن مقرر ہو گیا۔ سرفراز احمد کو ماہ رو کی خرابی طبیعت کی وجہ سے اعتراض تو تھا ہی مگر شازمہ کے حامی بھر لینے کے بعد وہ خاموش ہو گئے تھے۔

یوں ماہ رو اگلے ہی دن بیاہ کر، پور پور سجا کر عون عباس کے گھر میں ہمیشہ کے لیے کسی سہانے خواب کی مانند اتر آئی تھی۔ ایسا خواب جو ایک ہی چھناکے میں ٹوٹ گیا تھا۔ اس بھیانک انداز میں کہ ماہ رو کراہ بھی نہیں سکی تھی۔



نکاح کے بعد فوری رد عمل کے طور پر اس کا اپنے ہی گھر والوں پہ پھٹ پڑنا فطرت کا عین تقاضا تھا۔

جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا اور جو کچھ کیا گیا تھا وہ کسی گہری سازش کا نتیجہ تھا۔

پہلے تو اسے نکاح کے دو گھنٹے بعد بھی یقین نہیں آیا تھا کہ ماہ رو سرفراز اس گھر میں، اس کی خواب گاہ میں ہمیشہ کے لیے آگئی تھی۔ وہی ماہ رو جس سے عون عباس کو شدید قسم کی نفرت ہو گئی تھی۔ اسی ماہ رو سے ہمیشہ کے لیے پیچھا چھڑوانے کی خاطر وہ کسی بدنصیب گھڑی میں اس کے گھر چلا گیا تھا۔ محض اسے آئینہ دکھانے۔ صرف اسے ذلیل کرنے اور بتانے کہ کم از کم آئندہ زندگی میں وہ اسے تنگ نہ کرے۔ وہ تو ماہ رو کے باپ کو اس کے کرتوت بتانے آیا تھا۔ مگر خود بری طرح سے پھنس گیا تھا۔

اور اسے بھی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس کے ساتھ ہوا کیا تھا؟ یہ گیم کس نے کھیلی تھی؟ یہ چال کس نے چلی تھی؟ وہ بھی اسی انداز میں کہ عون کا پورا گھرانہ اس کے خلاف ہو گیا تھا۔ ہر آنکھ میں اس کے لیے ملامت تھی۔ ہر آنکھ میں اس کے لیے غصہ تھا۔ وہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی قصوروار بن چکا تھا۔ ان سب نے عون کو کٹہرے میں کھڑا کر دیا اور خود ہی سزا بھی سنا دی تھی۔

آج اپنے ہی گھر میں داخل ہوتے ہوئے عون کو اپنا آپ اجنبی سا لگ رہا تھا۔ ایسے لگتا، ہر آنکھ اسی کے تعاقب میں ہے۔ جیسے اس نے بہت بڑا گناہ کر لیا تھا۔ جیسے اس نے بہت بڑا جرم کر دیا تھا۔

حالانکہ فریحہ سے اس کی شادی کو روکنے والے بھی اس کے گھر والے تھے۔ ماہ رو کو یہاں اس گھر میں لانے والے بھی یہی گھر والے تھے پھر ان کی ناراضی، غصہ، نفرت کا مطلب کیا تھا؟

وہ جتنا سوچتا اتنا ہی الجھتا۔ لیکن اسے نہ الجھنے کا اتنا وقت ملا تھا اور نہ سوچنے کا اتنا وقت ملا تھا۔ اس لیے کہ نکاح کے فوراً" بعد عون پہ بڑے بھیانک انکشافات ہوئے تھے۔

وہ سب کی نفرت غصے اور ملامت کی وجہ جان گیا تھا۔ وہ اپنے والدین کو حق پہ سمجھتے ہوئے ہر الزام سے بری کر چکا تھا۔

انہوں نے جو کیا تھا ٹھیک ہی کیا تھا۔ انہوں نے جو سنا تھا جیسا سنا تھا اسی پہ عمل کرنا تھا۔ اسی کو سچ ماننا تھا۔ اس کے غیرت مند ماں باپ کی طرح کوئی اور بھی ہوتا تو یہی کرتا اسے یہی کرنا تھا۔ ازالے کے طور پر وہ لوگ یہی کر سکتے تھے۔ اپنی عزت، ناموس اور وقار کو بچانے کے لیے اپنے تئیں عون کے ماں باپ نے بڑا بروقت فیصلہ کیا تھا۔

مگر چالبازوں کو تو ان کی سزا ملنی چاہیے نا؟

نکاح کے فوراً" بعد جب وہ کسی بپھرے طوفان کی طرح ہال کمرے میں موجود اپنے والدین اور بھائیوں پہ گرج رہا تھا۔

"آپ نے کچھ دیر پہلے جو میرے ساتھ کیا ہے۔

میں پوچھ سکتا ہوں؟ یہ سب کیا تھا؟ کیوں ہوا تھا؟ آپ نے میری زندگی کو کیوں تماشا بنایا؟" وہ نفرت اور آگ کا طوفان بنا ہوا تھا۔ وہ اس پوری رات لڑتا اور جھگڑتا رہا تھا۔ وہ اگلے دن تک بھی چیختا رہا۔۔۔ غصہ کرتا رہا۔۔۔ زہر اگلتا رہا۔

"یہ اس عورت کا منصوبہ ہے۔ اس نے مجھے چیٹ کیا۔ میں اسے کبھی کامیاب ہونے نہیں دوں گا۔" وہ کف اڑاتا اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہا تھا۔

"آپ سب اس عورت کے ساتھ مل گئے تھے۔ کیوں کیا آپ نے میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا؟" عون شدت ضبط سے پھٹ پڑا تھا۔ "اور یہ اس کے والدین تھے۔ جو اس پہ ذرا بھی بھروسہ نہیں کرسکے تھے۔ بلکہ اس چالباز عورت کی چال میں آگئے تھے۔ کیا انہیں عون پہ اعتبار نہیں تھا؟

اور جب عون نے بھرے مجمع میں اپنے باپ سے سوال کرلیا تو انہوں نے ذرا بھی اس کے وقار کی لاج نہیں رکھی تھی۔ انہوں نے اسے منہ توڑ جواب دیا تھا۔ انہوں نے اس کے منہ پہ طمانچہ مار دیا تھا۔

"تماشا تو تم نے ہمارا بنا دیا ہے۔ شادی والے گھر کو ماتم کدہ بنا دیا ہے۔ تمہاری چاچی ہسپتال میں پڑی ہے۔ مہمان انگشت بدنداں ہیں۔ ہر آنکھ میں تجسس ہے، غصہ ہے، دلچسپی ہے۔ ہر زبان پہ قصے کہانیاں ہیں۔ جاؤ باہر نکل کر دیکھو اور زبان چلانے والوں کی زبانیں کاٹ آؤ۔ ہر کوئی تمہیں گناہ گار تسلیم کر رہا ہے۔ آخر کچھ تو تھا نا۔ جو بات یہاں تک اس نوبت تک آئی۔

پچھلے کچھ عرصے سے میں بھی تمہارے رنگ ڈھنگ دیکھ رہا تھا۔ پھر بھی اپنی تربیت پہ ناز بہت تھا۔ جو اڑتے اڑتے قصے میرے کانوں تک پہنچ رہے ہیں۔ جھوٹے ہیں، بے بنیاد ہیں۔

ارے کوئی عزت دار شریف ماں باپ کی اولاد اتنا جھکتی نہیں۔ التجائیں نہیں کرتی اور وہ شریف آدمی کس قدر بے بس تھا۔ اور وہ عورت جس کی بیٹی کو اس کے گھر جا کر تم نے برباد کیا ہے اس عورت کا کیا قصور تھا جو روتی ہوئی میرے پاس آئی تھی۔ آخر کچھ تو تم نے ان لوگوں کے ساتھ کیا تھا۔ ان کی بیٹی کو کس انتہا تک پہنچا آئے کہ وہ ہسپتال میں زندگی موت کی کشمکش میں جا پڑی۔

تم پر قہر ٹوٹ پڑے۔ ذرا غیرت نہ آئی۔ ایک دن بعد تمہاری شادی کے شادیانے بجنے تھے اور تم نے اپنے نفس کے بے لگام گھوڑے کو سرپٹ دوڑا کر میرے سر میں خاک ڈلوا دی۔ میری عزت کو دھجی دھجی بکھیر دیا۔ مجھے ذلیل و خوار کر دیا۔ ساری دنیا کے سامنے سب سے بڑی بات میرے اکلوتے بھائی کے سامنے، اس کی اکلوتی بیٹی کے سامنے۔

آہ تھو، نفرت ہے مجھے تم سے۔ کاش میرے بس میں ہوتا تو تمہیں اپنی اولاد ماننے سے انکار کر دیتا۔ تمہیں گھر بدر کر دیتا۔ اپنے وجود اور کاروبار سے الگ کر دیتا۔

لیکن اس تمہاری ماں کی وجہ سے بے بس ہوں۔ یہ عورت مجھے کسی بھی انتہائی فیصلے تک نہ جانے دیتی۔ میں بے بس ہوں اور تمہیں اس گھر میں رکھنے پہ مجبور ہوں۔

اس لیے کہ جس عزت دار، شریف آدمی کی بیٹی کے سر پہ چادر ڈال کر ایک دعوے کے تحت یہاں لایا ہوں۔ اب اس عہد سے پھر نہیں سکتا۔ اس عہد کو زندگی بھر نبھاؤں گا۔ اس کی بیٹی کو اپنی بیٹی بنا کر لایا ہوں اور تمہارے حصے کے گناہوں کی معافی مانگ کر آیا ہوں۔ اس لیے کہ میرے اپنے گھر میں بھی بیٹیاں ہیں۔ میں کسی شریف آدمی کی بیٹی کو اپنی اولاد کے ہاتھوں برباد ہوتے اور اجڑتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔" ابو کا جاہ و جلال اور غصہ بحرہند میں کسی طوفان سے کم نہیں تھا۔ اور عون تو ایسے بدک کر پیچھے ہٹا تھا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مار لیا ہو۔

یہاں تو الزام در الزام کا سلسلہ چل پڑا تھا۔ نہ کوئی اس سے وضاحت لے رہا تھا۔ نہ کوئی بات سن رہا تھا۔ نہ کسی کو عون کی وضاحتوں میں دلچسپی تھی۔ وہ اپنی صفائی کس کے سامنے پیش کرتا۔

اس کا پورا گھرانہ اس کے خلاف ہو چکا تھا۔ اور ابو تو صفائی میں ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کر رہے تھے۔ عون کو لگا تھا اس کے دماغ کی شریان پھٹ جائے گی۔ کوئی نس تو ضرور پھٹ جائے گی۔ اس کی لہو رنگ آنکھوں میں شرارے پھوٹ رہے تھے۔ اس قدر بے اعتباری؟ اس قدر بد اعتمادی؟ صرف ایک دو ٹکے کی بے حیا عورت کی وجہ سے۔ جس نے رو دھو کر جانے کون سا ڈرامہ رچا کر اس کے والدین کو اپنے ہی بیٹے سے متنفر کر دیا تھا۔

عون کا دل چاہ رہا تھا ہر چیز کو آگ لگا دے۔ اس ماہ رو نامی خون آشام بلا کو آگ لگا دے۔

"اور صد شکر کہ میری بیٹی فریحہ کی زندگی برباد ہونے سے بچ گئی۔ بروقت تمہارے کرتوت ہمارے سامنے آ گئے۔ بہت جلد تمہارا گھناؤنا روپ کھل گیا۔ اگر یہ سب بعد میں پتا چلتا تو کیا ہوتا۔ کس قدر برا ہوتا.... اور تم نے اس بچی کو برباد کر کے اچھا نہیں کیا۔ میں اسی کے ازالے کے طور پر' تمہاری سزا بنا کر اسے یہاں لایا ہوں...." ابو ٹھونک بجا کر اعلان کر رہے تھے۔ بہت ساری آنکھوں میں ابو کے اس نیک عمل پہ ستائش بھری ہوگی۔ وہ اپنی عزت اچھالنے کی بجائے بڑی فہم و فراست کا مظاہرہ کرتے ہوئے رات کی تاریکی میں بیٹے کے عیبوں پہ پردہ ڈال کر اس ستم زدہ لڑکی کو بہو بنا کر گھر لے آئے تھے۔

یہ ان کی دور اندیشی اور دانش مندی ہی تو تھی۔

"برباد تو مجھے کیا ہے اس نے۔ میرے ہی گھر والوں کے سامنے مجھے ذلیل کیا ہے۔ میں اس سے انتقام لوں گا اور ضرور ہی لوں گا۔" غصے کی انتہا پہ عون کے اشتعال کا رخ کسی اور سمت نکل گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پھر سے خون بھر گیا تھا۔ ابو اس کے ارادے جان کر گرج دار لہجے میں پورے قد سے کھڑے ہو کر غرائے تھے۔

"خبردار' جو تم نے اس بچی کے ساتھ کوئی زیادتی کر کے میرا مزید تماشا لگوایا۔ خبردار' جو تم نے مزید میری عزت کا جنازہ نکلوایا.... میں اس کے باپ کے ساتھ عہد باندھ کے آیا ہوں۔ مجھے اور ذلیل کیا تو کھڑے کھڑے گولی سے اڑا دوں گا۔" ان کا بس نہیں چل رہا تھا۔ اپنے اونچے پورے بیٹے کا گریبان چاک کر ڈالیں۔ ان قدموں کو کاٹ ڈالیں جن سے چل کر وہ سرفراز احمد کے گھر کی دہلیز پار کر کے گیا تھا۔

وہ باپ کے فیصلہ کن گرج دار لہجے اور بھیانک دھمکیوں پہ روہانسا ہو گیا تھا۔

"ابو! آپ میرا یقین کریں۔ میں نے کچھ برا نہیں کیا۔ میرا کسی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں.... یہ سب جھوٹ ہے سازش ہے۔ میرے خلاف منصوبہ بنایا گیا ہے۔ میں تو فریحہ کے ساتھ شادی پہ خوش تھا۔ میں تو فریحہ...." عون نے شدت ضبط کے ساتھ آنکھیں دباتے بمشکل اپنے الفاظ منہ سے ادا کیے تھے۔ ابو نے اسے نفرت انگیز لہجے میں بے ساختہ روک دیا تھا۔ انہوں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے چلا کر کہا۔

"میری بیٹی فریحہ کا اپنی گندی زبان سے نام بھی مت لو۔ سنا تم نے' آئندہ میں تمہارے منہ سے فریحہ کا ذکر بھی نہ سنوں۔ یہ تو میرا بھائی ہے۔ جس نے میری بے بسی کو سمجھا میرا ساتھ دیا۔ ہر قدم پہ میرے ساتھ رہا۔ تمہارے عیب دھونے بھی میرے ساتھ گیا۔ اس آدمی سے معافی مانگی۔ میں تو عمر بھر اپنے بھائی کا احسان مند رہوں گا۔" ابو گرجتے گرجتے آخر میں آبدیدہ ہو گئے تھے۔ پھر دوبارہ سے فارم میں آ گئے۔

اس کی امی جو چپکے چپکے رو رہی تھیں ایک دم عون کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔

"بس بھی کریں بہت ہو گیا۔ اپنی جذباتیت اور غصے کا پتا نہیں میرے بیٹے کی جان کا وبال بن گئے ہیں۔ اس کی غلطی کیا ہے؟ جرم کیا ہے؟ میرا بیٹا ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ کسی کی ضرور چال ہو گی۔" امی جو اتنے گھنٹوں سے خاموش تھیں۔ اچانک اس کے سامنے ڈھال بن گئی تھیں۔ امی کے اٹھتے ہی عاصم اور قاسم بھی کچھ جز بز سے ہوئے۔ شاید وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ اس یوم حساب کا خاتمہ ہو۔ عدالت برخاست کی جائے۔ جو ہونا تھا۔ وہ ہو گیا تھا۔ جو ذلت اٹھانا پڑی تھی۔ وہ اٹھالی

تھی۔ اب باقی کیا بچتا تھا؟ ادھر عاشر بھی بے قرار سا کھڑا ہو گیا۔

"ابو! آپ عون کو ایک موقع ضرور دیں۔ آپ اس کی بات تو سن لیں۔ کیا پتا' واقعی ہی کوئی سازش ہو۔ ہمارا عون ایسا تو نہیں۔ کیا آپ اپنی تربیت کو بھول گئے ہیں؟"

عاشر کے نرم انداز پہ ابو بھی کچھ نرم ضرور پڑے تھے تاہم یہ نرمی عون کے لیے ہرگز نہیں تھی۔ یہ نرمی صرف اور صرف اس شریف آدمی کی بیٹی کے لیے تھی جسے عون نے برباد کیا تھا۔ اور جس کے باپ نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اپنی بیٹی کے لیے خوشیوں کی بھیک مانگی تھی۔

"میری بیٹی بہت نادان ہے۔ ناسمجھ ہے۔ اس کی غلطیوں پہ درگزر کیجیے گا۔ اسے آپ سب کے پیار کی ضرورت ہے۔ میری بیٹی نے پیار کے معاملے میں بہت محرومی دیکھی ہے۔" وہ بار بار بھیگی آواز میں اپنی بیٹی کے لیے خوشیوں کی بھیک مانگ رہے تھے۔ اور آخری دم تک اپنی بیٹی کی نادانی' کم فہمی' جذباتیت اور کچھ کچھ خود سری کی بات بھی کرتے رہے تھے۔ اس وقت عون کے ابو کو عون پہ بہت غصہ تھا۔ وہ کسی بھی بات کو سن نہیں سکتے تھے تاہم ماہ رو کو خوش رکھنے کا عہد ضرور دے کر آئے تھے۔ اور اب اس عہد کو زبردستی نبھا کر دم لینے والے تھے۔ اور دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے تھے۔

انہوں نے ببانگ دہل اعلان کر دیا تھا۔ کوئی بھی ماہ رو کو اس گھر میں تکلیف دینے کی کوشش نہیں کرے گا اور جسے وہ سنا رہے تھے وہ پیروں کی ٹھوکروں سے ایک ایک چیز اڑاتا' ہذیان بکتا نکل گیا تھا۔



ماہم نے کھڑکی سے پردے سمیٹ کر اے سی کی کولنگ کو کم کیا۔ پھر وہ بیڈ پہ آڑھی ترچھی لیٹی ماہ رو کو زبردستی اٹھا کر غرائی تھی۔

"اٹھ جاؤ ماہ رو! وہ لوگ آ بھی چکے۔ اور ابھی تمہارا اشنان بھی باقی ہے۔" اسے ہسپتال سے آئے سات گھنٹے ہو چکے تھے۔ اس وقت دن کے دو بج رہے تھے جب حواس باختہ سی ماہم اس کے روم میں بھاگی بھاگی چلی آئی تھی۔ اس کا چہرہ جوش کے عالم میں سرخ تھا۔ حواس باختہ تھے' آنکھیں چمک رہی تھیں۔ رنگت گلابی تھی۔

اس نے نیند میں دھت سوئی ماہ رو کو جھنجھوڑ کر اٹھا دیا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ماہ رو دوبارہ تکیے میں گم ہو گئی تھی۔ ماہم اسے جگا جگا کر تھک چکی تب اسے ٹھنڈے پانی کا خیال آیا تھا۔ وہ کیسے اپنا پرانا حربہ بھول گئی تھی؟ ماہ رو کے پیروں پہ پانی ڈالتے ہی اس کی نیند کو بھگا دینے کا قدرتی ٹوٹکا تھا۔

پیر گیلے ہوتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ جاتی تھی جیسے اس وقت اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ نیند میں گم... مندی مندی آنکھوں سے دیکھتی ہوئی۔

ماہم نے اسے ڈپٹ کر کہا۔

"ماہ رو! اٹھ جاؤ' وہ لوگ آ بھی چکے۔ تم نے تیار بھی ہونا ہے۔ یہ نہ ہو تمہیں چھوڑ کر بھاگ نکلیں۔" ماہم نے اسے دھمکایا تھا۔ تب وہ ایک مرتبہ پھر تکیے پہ سر گرا کر بے انتہا ہنسنے لگی تھی۔ ہنس ہنس کر دوہری ہو رہی تھی۔ اس کی ہنسی کے گھنگھرو پورے روم کی فضا کو کھنکھنانے پہ مجبور کر رہے تھے۔

یوں لگ رہا تھا وہ اتنے گھنٹوں کی گھٹن' حبس اور غبار کو ہنسی کی صورت میں ہمیشہ کے لیے باہر نکال دینا چاہتی ہے.... اپنے من کو شانت کر لینا چاہتی ہے۔ آخر دل کی مراد جو بر آئی تھی۔

ماہم نے زبردستی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر آواز دبانے کی کوشش کی تھی۔

"باقی اپنی سسرال جا کر ہنسی کے سر بکھیر لینا۔ ابھی فٹافٹ تیار ہو جاؤ۔" ماہم نے اسے کھینچ کر بیڈ سے اتارا تھا۔ تب وہ لمبی سی انگڑائی لے کر ہنستی ہوئے بڑے دلفریب لہجے میں بولی تھی۔

"پہلے مجھے یقین دلا دو ماہم! کیا میں خواب تو نہیں دیکھ رہی؟ یہ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر میری زندگی میں کیا کیا نہیں ہو چکا؟ میری ذات بدل گئی' نام بدل گیا'

زیست بدل گئی اور میں خود بھی بدل گئی۔ مجھے یقین کیوں نہیں آرہا ماہم! کہ خوابوں کی تعبیریں یوں بھی مل جاتی ہیں؟ محبتیں یوں مل جاتی ہیں عشق تکمیل کے مراحل تک بھی پہنچتا ہے؟ محبت کو وصل کی شب بھی نصیب ہوتی ہے؟

"مجھے یقین نہیں آرہا ماہم! بالکل نہیں آرہا... چوبیس گھنٹے پہلے ایک قیامت میری ہستی کو ہلا گئی تھی۔ وہ قیامت جسے میں دوبارہ سوچنا بھی نہیں چاہتی... وہ لمحے جنہیں میں ہمیشہ کے لیے بھول جانا چاہتی ہوں۔ وہ اذیت جو اسی وقت اپنا اثر کھو گئی تھی جب میرے نام کے ساتھ عباس کا نام جڑ گیا تھا۔ لیکن ماہم! مجھے یقین کیوں نہیں آرہا؟ یہ ممکن کیسے ہوا؟ عباس جیسا آتش فشاں، گل و گلزار کیسے بنا؟ اس نے اقرار کس طرح سے کیا؟ ہمارا نکاح کیسے ہوا؟ وہ کس طرح سے مان گیا؟ محض چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر سب کچھ میری چاہت، خواہش اور تمنا کے مطابق کس طرح سے ہوا..." وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بڑی گہری باتیں کررہی تھیں۔ کیونکہ جب سے نکاح ہوا تھا تب سے اس کا ذہن ان سوالوں کی یلغار میں خاصا گھٹ رہا تھا۔ وہ ماہم کے ساتھ سب کچھ شیئر کر کے خود کو پرسکون کرنا چاہتی تھی۔

"بی بی! تم آم کھاؤ... اب پیڑ کیوں گنتی ہو۔" ماہم کا انداز مزاحیہ قسم کا تھا۔ وہ اس کا گال کھینچتے ہوئے بولی تھی۔

"عباس پہ کیوپڈ کا تیر چل گیا ہو گا، اس وقت شرارے تو اگل گیا تھا۔ بعد میں جا کر احساس ہو گیا ہو گا۔ وہ کیوں ماہ رو کا دل توڑ آیا۔" ماہم نے مسکرا کر اس کے وہم دور کرنا چاہے تھے۔

"رئیلی؟" اس کی آنکھیں جگمگانے لگی تھیں۔ ماہم نے اثبات میں سر ہلایا۔

"پھر یوں ہوا کہ اسی رات بارہ بجے تک وہ اپنے ابا، چاچا اور بھائیوں کے ساتھ دوبارہ تمہارا دل جوڑنے ہسپتال پہنچ گیا۔" دل جوڑنے سے مراد نکاح تھا۔ ماہم اپنے انداز میں ہی گفتگو کرتی تھی اور بہت اچھی گفتگو کرتی تھی۔

"اس کے گھر والے اتنا اچانک مان گئے؟ مجھے یقین نہیں آتا۔" اس نے بے تابی سے کہا تھا۔ تب ماہم نے اپنا سر پکڑ لیا۔

"او... سلی گرل! مان گئے تھے تبھی کل نکاح کر گئے اور آج وہ سب نیچے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ تمہیں رخصت کروانے آئے ہیں۔" ماہم نے اپنا ماتھا پیٹ لیا تھا۔ ماہ رو کا دل جیسے دھک دھک کرنے لگا۔ دل کی لے کچھ بدل گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بار حیا سے جھک گئیں۔ دھڑکنوں میں غضب کا تلاطم برپا ہو گیا تھا۔ ماہم اس دلفریب منظر سے لطف اندوز ہوتی مسکرا کر بولی۔

"میں تو چاہتی تھی تمہاری شادی دھوم دھام سے ہو۔ مگر وہ لوگ سادگی پہ زور دے رہے تھے۔ پھر شازمہ آنٹی نے بھی کہا۔ جیسے وہ لوگ مناسب سمجھیں۔"

"ممی نے؟" ماہ رو کچھ چونک گئی تھی۔

"ہوں۔" ماہم نے بتایا۔ بلکہ مزید بھی بتایا۔

"نو ڈاؤٹ، ان دنوں میں شازمہ آنٹی نے تمہاری رئیل مدر جیسا رول پلے کیا ہے۔ اللہ ان کی ایبلٹی بڑھائے۔ اس تمام سیٹ اپ کو جو اس قدر اپ سیٹ ہو چکا تھا۔ اسے اپنے پوائنٹ آف وے یا میتھڈ سے شازمہ آنٹی نے اپنی فل سٹرینتھ اور ایبلٹی اور انرجی کے ساتھ ہینڈل کیا۔" ماہم کے لہجے میں ستائش بھری تھی۔ اور وہ پہلی مرتبہ شازمہ کی تعریف کررہی تھی۔

"اس نکاح کے بعد آج رخصتی میں ہر قسم کی فنڈنگ پلاننگ شازمہ آنٹی کی تھی۔ اور ان کے پریکٹیکل نالج کی وجہ سے آج یہ خوب صورت وقت تمہارا نصیب بنا ہے۔ اور تم ہمیشہ کے لیے عباس کی ہونے جارہی ہو۔" ماہم نے اس کی حیران آنکھوں میں جھانک کر کہا تھا۔ ماہ رو کا تحیر بڑھتا چلا گیا۔ بڑھتا چلا گیا۔

"گو کہ یقین نہیں آتا... بٹ مان لیتی ہوں۔" وہ

شرارتاً" مسکرائی تھی۔ "اب سارا کریڈٹ ممی کو دینا پڑے گا۔ محبت میں ہماری خواری تو بھاڑ میں گئی۔"

"تم جا کر اسے پوری حکایت سنا دینا۔" ماہم نے مشورہ دیا تھا۔ پھر اسے واش روم کی طرف دھکیلا۔

"ہری اپ، ابھی بیوٹیشن پہنچ جائے گی۔ یہ بھی کریڈٹ تمہاری ممی کو جاتا ہے۔ صبح سویرے برائیڈل ڈریس، جیولری، شوز اور تمہاری کافی شاپنگ کرلائی ہیں۔ وہ لوگ تو سادگی سے ہی چاہتے تھے پھر بھی آنٹی نے کافی اہتمام کرلیا۔" ماہم ممی سے کچھ زیادہ ہی متاثر لگ رہی تھی۔

پھر جب ماہ رو فریش ہو کر نہا کے باہر نکلی تب تک بیوٹیشن بھی پہنچ گئی تھی۔ مزید اسے ماہم سے کوئی بھی بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ حالانکہ وہ عباس کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی۔

پھر جب بیوٹیشن اس کے حسن کو چار چاند لگا کر چلی گئی اور ماہم اس کے حسن، خوب صورتی اور روپ کے جلوؤں کو دیکھ کر مصنوعی بے ہوش ہوگئی تھی تب ماہ رو نے اس کا بازو دبوچتے ہوئے زوردار قسم کی چٹکی کاٹ کر کہا۔ کیونکہ یہ کلبلاتا سوال اس کی جان لینے کے درپے تھا۔ ماہم نے سب کچھ بتایا تھا لیکن عباس کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔

"یہ ایکٹنگ چھوڑو، مجھے اتنا بتادو۔۔۔ عباس کیسا لگ رہا ہے؟" ماہ رو کے اس سوال پہ ماہم کی بے ہوشی خود بخود ٹوٹ گئی تھی۔ وہ پٹ سے آنکھیں کھول کر اٹھی۔ پھر اس نے بڑی حیران آنکھوں سے دیکھتی ماہ رو کی حسین آنکھوں میں اور بھی حیرانگی بھر دی تھی۔

"عباس تو نہیں آیا۔ اس کی امی، ابو، بھائی اور ایک بھابھی ضرور ہیں۔" اور ابھی ماہم مزید عباس کے نہ آنے پہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے روشنی ڈالنا چاہتی تھی جب اچانک دروازہ کھلا تھا اور ڈیڈی، شازمہ، عون کی امی اندر داخل ہو گئے تھے۔ تب سارے سوال، جواب، جواز اور وہم بھول کر ماہ رو ڈیڈی کی کھلی بانہوں میں سماگئی تھی۔

وہ آج اپنے ڈیڈی سے رخصت ہو رہی تھی گو کہ ڈیڈی نے اس کے ساتھ بہت کم وقت گزارا تھا۔ بہت کم اپنی محبت سے نوازا تھا پھر بھی اس نازک گھڑی میں اس کا دل بھر بھر آیا۔

اس کے آنسو آنکھوں سے اتنی خاموشی سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے کہ کسی کو خبر بھی نہیں ہو سکی۔ عون کی بھابھی نے اسے چادر اوڑھادی تھی۔

پھر وہ ڈیڈی کے بازوؤں کی زنجیر میں سر ٹکا کر روتی رہی۔ اور ڈیڈی کا ہاتھ اس کے سر پہ کچھ دیر کے لیے ٹھہر گیا تھا۔

ڈیڈی نے ماہ رو کی پیشانی چومی تھی۔ تو یوں لگا، تپتے صحرا میں ٹھنڈی میٹھی بوندیں ٹپ ٹپ گر رہی ہیں۔

اور جب وہ اپنے عالیشان بنگلے کی سیڑھی سے، جو دبیز ایرانی قالین سے مزین تھی۔ سہج سہج اتر رہی تھی۔ تو اسے اندازا نہیں تھا۔ وہ کہاں اتر رہی ہے؟ وہ بلندی سے پستی میں اتر رہی ہے۔ وہ آسمان سے پاتال کی طرف آرہی ہے۔ اور لاؤنج سے گزرتے ہوئے اسے اچانک عون عباس کے نقش پا کا خیال آگیا تھا۔

اسی فرش پہ عون کے پیروں کی دھمک پڑی تھی جس نے ماہ رو کے دل کی دھرتی کو ہلا دیا تھا۔ ابھی دو دن پہلے وہ اسے دھتکار گیا تھا۔ وہ اسے دھتکارتا آرہا تھا۔ اور گلاب کی نم شفاف ملائم اور حسین پتیوں پہ چلتے ہوئے ماہ رو سرفراز کو یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ نرم پتیاں نہیں، آبلہ پائی کے سفر کا ایک ٹریلر تھا۔

کیونکہ ماہ رو سرفراز کے راہ گزر کی مسافتوں کا ابھی اختتام نہیں ہوا تھا۔ ابھی یک طرفہ محبت کا یہ سفر تمام نہیں ہوا تھا۔

مجھے منزلوں سے عزیز تر ہیں تیری راہ گزر کی مسافتیں
کہ لکھی ہیں میرے نصیب میں ابھی عمر بھر کی مسافتیں
اسی ایک پل کی تلاش میں، جسے لوگ کہتے ہیں زندگی
تیری راہ گزر میں بکھر گئیں، میری عمر بھر کی مسافتیں

یہ اماوس کی گہری اور کالی رات تھی۔ کسی بھی ذی شعور کو خوف اور بھیانک خوف میں مبتلا کرنے والی۔ گہری، کالی اور سیاہ رات۔۔۔ جس کی پیشانی پہ کوئی ایک جگنو یا ستارہ نہیں چمکتا تھا۔ اسے پتا تو تھا' اماوس کالی اور خوف ناک بھی ہوتی ہے اور اماوس سیاہ نصیب بھی ہوتی ہے۔ اور اسے یہ بھی پتا تھا کہ اماوس بد نصیبوں کی زندگی میں "کالی رات" بن کر اترتی ہے شب برات بن کر نہیں اترتی۔ اور وہ جانتی تھی کہ اماوس مسطر سے جس کی زندگی کے گرد سیاہ حاشیہ لگا دیتے پھر کبھی کوئی بد نصیب ان کے حصار سے نکل نہیں پاتا تھا۔ اس کی زندگی پھر اماوس کے دائرے میں ہمیشہ رہتی۔ نہ بڑھتی نہ گھٹتی بس عمر بھر کے لیے ٹھہر جاتی۔ دراصل اماوس فریحہ کی طرح محبت کے ماروں اور نصیب سے ہاروں کی قسمت میں خود بخود بے قدموں چلے آتی تھی۔ جیسے سندر روپ چاند کا برج عقرب میں جانے کا وقت جو بڑا منحوس مانا جاتا تھا۔ اور فریحہ کو لگتا تھا اس کی زندگی کا چاند بھی قمر در عقرب میں عمر بھر کے لیے داخل ہو گیا ہے۔

فریحہ کو آج اماوس بھری رات میں "ودان ون نائٹ" کا مفہوم سمجھ میں آیا تھا۔ ان الفاظ کا فریحہ کی زندگی پہ اتنا گہرا' بھیانک اور اچانک اثر پڑے گا۔ یہ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ کیا کسی کے ساتھ "راتوں رات" یہ حادثہ ہوا تھا؟ جو فریحہ کے دل اور اس کی زندگی پہ گزرا؟۔ وہ مایوں کے پیلے جوڑے سے میت کے سفید جوڑے تک آ گئی۔ راتوں رات میں' صرف ایک رات میں۔ یہی رحمان منزل جہاں روشنیاں جگ جگ کر رہی تھیں۔ ڈھولک کی تھاپ گونج رہی تھی۔ قبرستان کے سناٹوں سے بڑھ کر خاموش ہو چکی تھی۔ شادی کے سارے رنگ اتر چکے تھے۔ اور فریحہ کا مایوں و مہندی کا جوڑا اونچے پلنگ کے عین اوپر گول مول سا انتہائی خستہ حالت میں نوحہ کناں تھا۔ کانچ کی زرد اور ہری چوڑیوں کا ڈھیر کرچی کرچی فرش پہ پڑا اپنی اس ناقدری پہ رنجیدہ خاطر تھا۔ یہ تو صرف مہندی مایوں کا جوڑا اور چوڑیاں ہی تھیں جنہیں اپنی ناقدری کا الگ سے ہی صدمہ اٹھانا پڑا تھا۔ یہاں تو جیتے جاگتے انسان تک "بے مول" اور "بے قیمت" ہو چکے تھے۔

فریحہ اپنی اس ذلت' توہین اور ناقدری کا رونا کسے دکھاتی؟ وہ اپنے ٹوٹے دل کے کانچ اٹھا اٹھا کر کس کی ہتھیلی پہ رکھتی؟ اس کے وہ تایا جو اپنی "ناموس" عزت اور خاندانی حشمت کو بچانے کی خاطر فریحہ کے دل کا سودا کر آئے تھے۔ اس کی خوشی اور محبوب کو کسی اور کی جھولی میں ڈال آئے تھے۔ کیا اس کے جان سے پیارے تایا نے اچھا کیا تھا؟ وہ رات کی سیاہی سے پوچھ پوچھ کر تھک رہی تھی۔ رو رو کر بدحال ہو رہی تھی۔ ٹوٹے خوابوں کے کانچ اٹھا اٹھا کر زخمی ہو رہی تھی۔ کیا وہ اماوس کی طرح بد نصیب تھی جو اس کے نصیب کا ستارہ گردش کرتا کرتا کسی اور کے نصیب کی پیشانی پہ جگمگانے لگا تھا۔ اور وہ ماہ رو سرفراز' آسمان کا چمکتا چاند' اپنے تمام تر کروفر اور غرور کے ساتھ اس کی ذات کا مکمل اختیار چھین کر بڑی شان' بڑی آن اور بڑی مہمان بن کر اسی رحمان منزل میں جلوہ افروز ہو چکی تھی۔ اس شبستان میں جسے فریحہ کے لیے پور پور سجایا گیا تھا۔ وہ خوب صورت خواب گاہ' جو فریحہ کے لیے خاص الخاص تیار کی گئی تھی اس پہ کس ہوشیاری کے ساتھ ماہ رو سرفراز نے قبضہ جمالیا تھا۔ کوئی ایسا قابض بھی ہوتا ہے؟ کوئی ایسا بھی سنگ دل ہوتا ہے؟ اور فریحہ نہ بول سکی تھی' نہ چیخ سکی تھی' نہ احتجاج کر سکی تھی۔ جبکہ ماہ رو سرفراز نے بڑی اعلا پائے کی سازشوں' منصوبوں اور چالوں کے ساتھ واویلا مچا کر عمر بھر کے لیے عون عباس کو اپنے دام میں کر لیا تھا۔ اور اس نے کتنی بڑی چال چلی تھی۔ ان ہی کے ہاتھوں ان ہی کا قتل عام کر دیا تھا۔ اور خود بے گناہ بھی رہی اور مظلوم بھی۔ نہ پھانسی ہوئی نہ دار پہ چڑھی۔ جس طرح وہ فریحہ سے اس کی زندگی اس کی خوشی زبردستی چھین چکی تھی۔ اسی طرح فریحہ جانتی تھی کہ اپنے حسن جہاں سوز کے ہتھیاروں سے ایک نہ ایک دن عون عباس کو بھی پسپا کر دے گی۔ کیوں کہ ماہ رو سرفراز کے پاس اداؤں کے' حسن کے'

چالوں کے تمام تر داؤ محفوظ پڑے تھے۔ وہ جو چاہتی' استعمال میں لے آتی۔
اور ابھی جب چند گھنٹے پہلے وہ دلہن کا حسین روپ سجا کر اپنی ساس کے جلو میں رحمان منزل کی راہداریوں میں سے گزر رہی تھی۔ تب پہلے سے گھر میں موجود عون عباس' بڑے ہال کے بند دروازوں کے اندرونی طرف اپنے باپ پہ اسی شدت کے ساتھ چلا رہا تھا جس شدت کے ساتھ وہ اس زبردستی کے نکاح کی رسم کے بعد چلایا تھا۔ غم و غصے سے بے حال تھا اور اس کے زہر میں بجھے الفاظ فریحہ کے جلتے بلتے دل پہ کسی پھوار کی مانند برس رہے تھے۔
"آپ نے اپنی ضد پوری کر تو لی ہے ابو! اسے بھگتنا اتنا آسان نہیں ہو گا۔ عون عباس کو جیتنا اتنا آسان نہیں ہو گا۔ یہ ماہ رو سرفراز کی بھول ہے کہ شاطرانہ چالوں سے انسان خریدے جا سکتے ہیں اور شاید خریدے جا بھی سکتے ہیں' لیکن عون عباس کو خریدنا اتنا سہل نہیں ہو گا۔" اس کے شعلوں میں لتھڑے الفاظ بڑے ہال کی کھڑکیوں سے باہر تک اس سکون کمرے میں بھی پہنچ رہے تھے جو فریحہ فرقان کی خواب گاہ میں شمار ہوتا تھا اور اس وقت کھڑکی کے پٹ کو ہاتھ میں پکڑے اس کی جلتی روح پہ سکون کی چھینٹیں گر رہی تھیں۔
"میں اس سازش کو "نو" پالوں گا اور اس کہانی کو زمین سے بھی اکھاڑ کر باہر لے آؤں گا جسے آپ کو سنا کر بے وقوف بنایا گیا تھا اور آپ آنکھیں بند کر کے اس پہ ایمان لے آئے۔" عون کی زخمی پھنکار میں اس شیر کی غراہٹ تھی جو اپنے شکار کی تلاش میں بو سونگھتا پھر رہا تھا۔ فریحہ نے کھڑکی کا پٹ اور بھی مضبوطی سے تھام لیا تھا۔
"آپ نے اسے میرے سر پر مسلط کیا ہے۔ میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔" وہ ابھی تک غرا رہا تھا۔
"دیکھو' دیکھو... اس کے انداز؟ سب کچھ کر کرا کے معصوم بن رہا ہے جیسے اس کا کوئی گناہ نہ ہو۔ ارے میں تو تمہارے عیبوں پہ پردہ ڈال کر اسے گھر لے آیا ہوں۔ اپنی اور تمہاری بھی نام نہاد عزت بچا لی ہے۔ ورنہ جو تم نے جرم کیا تھا اس کی کہیں معافی نہیں تھی۔" تایا رحمان بھی غرا اٹھے تھے۔ آخر عون کے باپ تھے۔ کیسے خاموش رہتے۔ باپ بیٹا ویسے بھی سیر اور سوا سیر کی واضح مثال تھے۔
"میں نے کیا جرم کیا تھا؟" وہ ایک مرتبہ پھر بھپر اٹھا۔
"یہ جرم نہیں تھا۔ ایک شریف آدمی کے گھر پہ اس کی غیر موجودگی میں دھاوا بولنا۔ اس کی بیٹی کو زدو کوب کرنا۔ جس کی وجہ سے وہ اسپتال میں جا پڑی تھی اور اس معصوم کی عزت...." آخر میں ان کا لہجہ کانپ سا گیا تھا۔ پورے وجود میں تھرتھراہٹ ہونے لگی تھی۔ وہ غم و غصے سے بے حال کانپ رہے تھے۔ جی چاہ رہا تھا اپنے ہی لخت جگر کو گولی سے اڑا دیں۔ وہ تو اسے منہ ہی نہیں لگانا چاہ رہے تھے۔ یہ تو عون تھا جو خود بخود اسی دلدل میں کنکریاں پھینک کر اپنے ہی اوپر گندی چھینٹیں ڈلوا رہا تھا۔ دراصل وہ اس ذلت کو بھول ہی نہیں پا رہا تھا جو اس نے پورے خاندان دوستوں' رشتے داروں اور مہمانوں کے سامنے جھیلی تھی۔
"کھاؤ قسم! تم سرفراز احمد کے گھر نہیں گئے تھے؟" وہ لہو رنگ آنکھوں سے اسے گھور کر پوچھ رہے تھے یہ ایسا مقام تھا جس پہ عون جھوٹا پڑ سکتا تھا اور انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔
"آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ آرام سے بیٹھ کر میری بات سن لیتے تو ان عذابوں میں نہ پڑتے۔ میں اس لیے نہیں گیا تھا وہاں... میں تو..." اس کی وضاحت کا گلا تایا رحمان نے ایک ہی دہاڑ میں گھونٹ دیا تھا۔
"تم گئے تھے یا نہیں؟ مجھے ہاں یا نہ میں جواب دو۔" وہ غضب ناک انداز میں چلائے تھے۔ فریحہ نے اپنے دل پہ ہاتھ جا رکھا۔ جانے عون کیا جواب دے گا؟ اگر اس نے ہاں بول دیا تو؟
"آپ نہیں سمجھ رہے ابو! کچھ نہیں سمجھ رہے۔

وہ میرے پیچھے خود پڑی تھی۔ آپ کچھ نہیں جانتے' مجھے موقع تو دیں۔ کم از کم ایک موقع تو دیں.... میں آپ کو ساری بات بتادوں گا۔ میں تو....'' وہ جو دو ٹوک گفتگو کر کے مقابل کو دوسرا موقع ہی نہیں دیتا تھا بولنے کا لمحہ بھر کے لیے ہکلا گیا۔ کیونکہ تایا رحمان ایک مرتبہ پھر اس کی بات کاٹ کر چلا اٹھے تھے۔

''میں تم سے کچھ اور پوچھ رہا ہوں۔ تم کچھ اور بکواس کرتے ہو۔ مجھے بتاؤ تم سیٹھ سرفراز کے گھر گئے تھے یا نہیں؟'' ان کی رگیں مارے طیش کے پھول کر نیلی ہو گئی تھیں۔

''میں اسے روکنے کے لیے۔ اسے منع کرنے کے لیے اور اس کے باپ کو اس کے تمام کرتوت بتانے کے لیے گیا تھا۔ میرا مقصد کچھ اور نہیں تھا۔ باخدا' میں سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ بہت آوارہ مزاج لڑکی....'' عون نے مارے طیش کے انتہائی فحش گالی بکی تھی جسے سن کر تایا رحمان گرج اٹھے تھے۔

''اپنا منہ بند رکھو ذلیل آدمی! خبردار' جو تم نے اسے اب دوبارہ گالی دی۔ وہ کل کیا تھی؟ میں نہیں جانتا' لیکن آج وہ میرے خاندان کی عزت ہے اور مجھے اپنی عزت کی حفاظت کرنا آتی ہے۔ اور رہی تمہاری بکواس تو.... اس کی میرے نزدیک کوئی وقعت نہیں۔ کیونکہ تم اب ہر قسم کی جھوٹی کہانی سنا کر اپنی ''میں'' کو برقرار رکھو گے اور اپنا دفاع کرنے کی کوشش کرو گے۔ تم میرے باپ نہیں۔ میں تمہارا باپ ہوں اور سب جانتا ہوں جو کچھ ہوا یا جو کچھ تم نے کیا تم میں ایسی غیرت ہوتی تو بار بار اس شرم ناک قصے کو دوبارہ مت چھیڑتے جس پہ میں نے مٹی ڈال دی تھی یا جس ذلالت کو سیٹھ سرفراز نے دفن کر دیا تھا اس کو اکھاڑنے سے پہلے دس مرتبہ سوچتے کیونکہ ہر دفعہ تمہارا ہی شرم ناک کارنامہ کھل کے سامنے آتا تھا اور میں تو منہ چھپاتا پھرتا اب تک اگر سیٹھ سرفراز میری التجا پہ کان نہ دھرتے۔'' وہ آنکھیں اور کان بند کر کے اپنی بات پہ زور دیتے تھے۔ اپنی بات منواتے تھے۔ اپنی ضد پر قائم رہتے تھے اور اپنی ہی بات کو ہی حقیقت اور سچ تسلیم کرتے۔ باقی سب ان کے سامنے جھوٹ 'بکواس اور چربہ تھا۔

''یہ تو سیٹھ سرفراز کی مہربانی جو انہوں نے اپنی بیٹی کا نکاح تم جیسے کمینے کے ساتھ کر دیا تھا۔ ورنہ تمہیں تو اس تمام بدنامی کے بعد کوئی شریف خاندان اپنی بیٹی کا رشتہ نہ دیتا۔'' انہوں نے نفرت انگیز لہجے میں اس کی دکھتی رگ پہ پھر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہ ایک دم ہی بھڑک اٹھا۔

''میں مر نہیں رہا تھا سیٹھ سرفراز کی بیٹی سے شادی کرنے کے لیے بلکہ وہ خود مر رہی تھی مجھ پہ۔'' عون زہر خند ہوا تھا پھر اس نے دروازے کے پاس رکھی میز کو زوردار ٹھوکر ماری اور کمرے سے بکتا جھکتا نکل گیا تھا جبکہ تایا رحمان مارے غیض کے ہال میں ٹہلنے لگے۔ فریحہ نے آوازوں کو ختم ہوتا محسوس کر کے کھڑکی بند کر دی تھی اور اس کی پشت سے ٹیک لگا کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ اسے تایا رحمان کی باتیں رہ رہ کر رلانے پہ مجبور کرتیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ عون نے جو کچھ کیا تھا اس کے نتائج میں وہ شریفوں کی فہرست سے نکل چکا تھا اور اسے کوئی ڈھنگ کا رشتہ بھی نہیں مل سکتا تھا' لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے ان کے اپنے ہی بھائی کی بیٹی اسے ہر الزام سے بری سمجھتی تھی۔ اس سے شادی کی خواہش مند تھی اور اس رشتے کے ٹوٹنے کی وجہ سے اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر مر رہی تھی۔

اگر عون برا تھا یا اس نے کچھ برا کیا تھا تو پھر سیٹھ سرفراز نے اپنی بیٹی کیوں اس کے ساتھ بیاہی تھی؟ کوئی بھی اس پہلو پہ نہیں سوچتا تھا۔ اور عون بقول ان سب کے کچھ غیر اخلاقی کام کر بھی چکا تھا تو ان سب کو کیا تکلیف تھی؟ اور ان سب نے مل کر فریحہ کو تختہ مشق کیوں بنایا؟ وہ عون کی اس کے ساتھ شادی ہو جانے دیتے۔ انہوں نے یہ شادی کیوں ختم کی تھی؟ آخر کیوں؟ کسی کو بھی فریحہ پہ رحم نہیں آیا تھا اور کوئی جانتا یا نہ جانتا' فریحہ تو جانتی تھی۔ اسی وقت سے جانتی تھی جب ماہ رو نے رحمان پلازہ میں عون کو دیکھا اور اس کی اسیر ہو گئی تھی۔ پھر بارہا فریحہ نے محسوس کیا تھا۔ وہ اس

گھر میں عون کے لیے آئی تھی۔ اس کے گھر والوں سے عون کے لیے گھلتی ملتی تھی۔ وہ اپنا سکہ پہلے سے ہی جمانا چاہتی تھی اور اس کے گھر والوں کو اپنے حسن اور دولت کے جال میں قید کر کے مٹھی میں کرنا چاہتی تھی۔ یہاں تک تو اس کی چالیں کامیاب ہو چکی تھیں۔ پھر آگے عون تک رسائی کا مسئلہ تھا۔ اس کی زندگی میں داخل ہونے کے لیے پری پلاننگ کی ضرورت تھی۔ کیونکہ اتنا تو ماہ رو بھی جان گئی ہو گی کہ بہت آسانی کے ساتھ وہ عون عباس جیسے مضبوط قلعے کو فتح نہیں کر سکتی۔ پھر اس نے پوری منصوبہ سازی کے بعد عون کے باپ تک رسائی حاصل کی ہو گی۔ انہیں جھوٹ موٹ کے قصے سنا کر رام کر لیا ہو گا اور یقیناً ”ماہ رو ایسا کر سکتی تھی۔ اس کے لیے یہ سب دائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ تھوڑا مشکل تھوڑا آسان۔ سو ماہ رو نے اپنا شکار حاصل کر لیا تھا۔ اس کے من کی مراد بر آ گئی تھی۔ اسے وصل کی شب نصیب ہو گئی تھی اور آج وہ ماہ رو سرفراز فریحہ کے حصے کی زمین پر اپنے خوابوں کا شیش محل بنا رہی تھی۔ وہ زندگی کی آخری سانس تک ماہ رو کو معاف نہیں کر سکتی تھی اور آج ماہ رو کس قدر شانت ہو گئی۔ کیونکہ اس نے عمر بھر کے لیے تمام تر دکھ، کرب، ذلت، بے چینی، آنسو اور اضطراب فریحہ کی جھولی میں ڈال دیا تھا، لیکن کیا وہ فریحہ کے سپنوں کی سرزمین پہ اپنے لیے محبت کی کوئی فصل کاشت کر پائے گی؟ کیا وہ فریحہ کے آنسوؤں اور بددعاؤں کی زیر سایہ خوش گوار ازدواجی زندگی گزار پائے گی؟ اور کیا وہ حقیقت میں عون عباس کی محبت حاصل کر پائے گی؟ شاید کبھی نہیں۔ کسی حال میں بھی نہیں۔ آخری سانس تک نہیں کیونکہ بیچ میں فریحہ فرقان کھڑی تھی۔ وہ ان دونوں کے درمیان ایک خلیج بن کر تن کے کھڑی تھی۔ وہ کبھی ان دونوں کو ایک نہیں ہونے دے گی۔ وہ یعنی فریحہ فرقان عمر بھر کے لیے ان دونوں کے بیچ اماوس کی رات بن کر کھڑی رہے گی۔ وہ ساری زندگی عون عباس کے لیے ایک ”گلٹ“ کی صورت مجسم زندہ رہے گی۔ اسے احساس دلانے کے لیے۔

اسے کبھی حقیقی معنوں میں خوش نہ ہونے دینے کے لیے تاکہ وہ بھی زندگی کی آخری سانس تک جلے۔ زندگی کی آخری سانس تک سلگتا رہے۔ اگر فریحہ فرقان اپنی زندگی عون عباس کے نام پہ قربان کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی تو پھر عون عباس کو بھی ساری عمر ماہ رو سرفراز کے ساتھ خوش نہیں رہنا تھا کسی صورت نہیں رہنا تھا۔ پھر ماہ رو سرفراز کو بھی فریحہ فرقان کی طرح جلنا اور سلگنا تھا۔ پھر ماہ رو سرفراز کو بھی اس کی طرح تنہا زندگی گزارنا تھا۔ پھر ماہ رو سرفراز بھی سہاگ رکھتے ہوئے ”بیوہ“ جیسی زندگی گزارے گی۔ فریحہ کا سایہ کبھی اسے خوش نہیں رہنے دے گا کیونکہ فریحہ کا سایہ ”اماوس“ کا سایہ تھا۔



سناٹا آج بھی نہیں ٹوٹا تھا۔ آج بھی اس روز کی طرح پورے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا حالانکہ آج تو عون کی منکوحہ کو گھر میں بیاہ کر لے آئے تھے۔ پھر بھی سکوت تھا کہ دلوں کو عجیب سے کرب میں چکر پھیریاں دے رہا تھا۔ ہر طرف بے سکونی سی بے سکونی تھی۔ شاید اس لیے کہ ان کا اپنا دل چین سے خالی تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ ان کی بیٹی کا دل بھی چین سے خالی تھا۔

اور کیا یہ فریحہ تھی؟ ان کی پڑھی لکھی فرمانبردار سنجیدہ مزاج نیک فطرت بیٹی۔ وہ تو اس وقت کوئی بدحال عمر رسیدہ عورت لگ رہی تھی۔ کوئی سودائی لگ رہی تھی۔ ان کے دل پہ جیسے گھونسا پڑا تھا۔ انہوں نے بے ساختہ فریحہ کو اپنے سینے میں بھینچ لیا۔ اور وہ جو اس طرح تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ ماں کے سینے سے لگتے ہی بالکل ساکت ہو گئی۔ جیسے بجلی کے بٹن کو دبا دینے سے آواز بند ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی کسی چابی کی گڑیا کی طرح خاموش اور ساکت ہو چکی تھی۔

”فریحہ! یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟“ وہ ماں تھیں ان کا دل تڑپ گیا تھا۔ فریحہ نے آواز کی سمت گردن اٹھا کر خالی خالی نظروں سے دیکھا تھا۔ پھر پھٹی پھٹی آواز میں بمشکل بولی۔

"تو کیسی حالت بناؤں؟
جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے۔ کیا میں خوشی کے شادیانے بجاؤں؟ اس کی امی کا دل پھٹنے لگا۔ آنکھیں بہنے لگیں۔ زبان سے عون کے لیے تنفر کا زہر گرنے لگا۔

"دنیا ایک عون پر ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ کمینہ تمہارے قابل ہی نہیں تھا۔" انہوں نے دل پر پتھر رکھ کر عون کو برا بھلا کہنا شروع کیا تھا۔ ورنہ عون کو اب بھی دل کوئی الزام دینے پہ راضی نہیں تھا۔ ان کے گزشتہ سارے خدشات وہمے' وسوسے ماہ رو کی طرف سے تھے۔ انہیں لگتا تھا۔ ماہ رو کسی "چال" میں ہے۔ وہ عون کو ہتھیانا چاہتی ہے۔ ان کا دل ٹھیک ہی وسوسے سے پال رہا تھا۔ وہ سارے خدشے بے بنیاد نہیں تھے ان کے سارے وہموں کا جواب آج ماہ رو کا دلہنوں جیسا روپ تھا۔ تو وہ ان کے خدشات پہ مہر لگا کر آج حوروں سا روپ لیے ان کے دلوں پہ سانپ دوڑانے آگئی تھی۔ تو ماہ رو سرفراز ان کے عون کو ہمیشہ کے لیے اپنا بنا کر آگئی تھی۔

دل اس حقیقت کو تسلیم ہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ان کا عون ایسا کمزور نہیں تھا جو کوئی بھی ماہ رو اسے کسی چال کے ساتھ "جیت" جاتی۔ عون نام کی سلطنت کو اپنے نام کروالینا کوئی اتنا سہل نہیں تھا۔

اور اس وقت فریحہ کو تسلی دیتے ہوئے' اس کے جلتے دل کو پرسکون کرتے ہوئے وہ یہی باتیں اسے سمجھا رہی تھیں۔

"دیکھ لینا' وہ دو دن بھی نہیں ٹکے گی۔ جینا حرام ہو جائے گا اس کا یہاں۔ عون کے ساتھ نباہ کرنا ایسی نازک اندام مہارانیوں کے بس کی بات نہیں۔ تم دیکھتی رہنا۔ جس طرح سے آئی ہے۔ ویسے ہی منٹوں میں چلی جائے گی۔"

"نہیں امی! یہ خونی بلا نہیں جائے گی۔ یہ عون کو اپنی اداؤں کے جال میں پھانس لے گی۔ اس کے پاس حسن جیسا باکمال ہتھیار ہے۔" فریحہ نے ہونٹ کاٹتے ہوئے اذیت سے کہا تھا۔

"عون ایسا کچا نہیں۔ تو بھائی جی نے اسے بے بس کر دیا تھا۔ وہ تو کبھی نہ مانتا۔ بھائی جی اور تمہارے ابا کو جانے کیا کیا بتا کر ان کے دماغ سن کر دیے تھے۔ وہ کچھ سنتے ہی نہیں تھے۔ کہتے یا عون کو مار ڈالیں گے یا خود کو۔ ورنہ نکاح کی حامی بھرے۔" انہوں نے پھر سے زخم ادھیڑ دینے والا ذکر چھیڑ لیا تھا۔

"جو ہونا تھا۔ وہ ہو گیا۔ ماہ رو کی پلاننگ تو کامیاب ہو گئی۔ وہ عون کو پانا چاہتی تھی بس پالیا۔" فریحہ کے دل پر آرے سے چل پڑے تھے۔

"زندگی کا اختتام تو نہیں ہو گیا نا۔ تمہارا دل توڑنے والوں کو سزا ضرور ملے گی۔ تم دیکھ لینا۔ عملی زندگی میں آکر کیسے عشق کا بھوت اترتا ہے۔ ایسی منحوس آئی ہے جس نے ہمارے گھر کی خوشیوں کو تباہ کر دیا ہے۔" فریحہ کی امی نے زہر خند لہجے میں کہا۔

"میرا دل اسی لیے گھبراتا تھا۔ یہ خدشے بے بنیاد نہیں تھے امی! دیکھا نا۔ ماہ رو نے میرا دل اجاڑ دیا۔ مجھے برباد کر دیا۔ اور خود عون پر قبضہ جما کر بیٹھ گئی۔" فریحہ ایک مرتبہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

"میں تو کہتی تھی۔ اس چڑیل سے دور رہو۔ اس کے سائے سے بھی دور رہا کرو۔ اس نے پشت میں خنجر گھونپ دیا نا۔" فریحہ کی امی کو نجانے کیا کچھ نہیں یاد آگیا تھا۔

"میں نے تو نمبر بھی بند کر دیا تھا۔ تعلق بھی توڑ لیا تھا۔ پھر بھی میری بدقسمتی بن کر سامنے آگئی۔" فریحہ گھٹ گھٹ کر رونے لگی تھی۔ یہ رونا تو اب اس کے ہمیشہ ہمیشہ ساتھ ہی تھا۔



رات تیسرے پہر میں داخل ہو رہی تھی۔
کھڑکی کے باہر لٹکی بیلوں سے موتیے اور چنبیلی کی خوشبو آرہی تھی۔ انتہائی معطر' خوب صورت اور حسین روح میں اتر جانے والی مہک نے پورے روم کو مہکا دیا تھا۔

رات کی رانی کا سحر سر چڑھ کے بول رہا تھا۔ اور اس وقت ماہ رو جہازی سائز بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے آنے والے سندر وقت کی آہٹوں کو سن رہی تھی۔ وہ حسین گھڑی جس کا انتظار دل میں میٹھا میٹھا درد جگاتا تھا۔ وہ ہی دلنشین ساعتیں جن کی آمد آمد کا چرچا پلکوں کو بار حیا سے جھکا رہا تھا۔

وہ جو اس کی جنوں خیز قسم کی محبت تھا۔ اس وقت محبوب بن کر آئے گا۔؟

اس وقت اتنے سحر انگیز ماحول میں دل کے اندر ہلکے ہلکے وسوسے بھی سر ابھار رہے تھے۔ جو باتیں اپنی ہی سرخوشی میں بہت پہلے اس نے نہیں سوچی تھیں وہ اس وقت بہت نازک صورت حال میں گھبرانے پر مجبور کر رہی تھیں۔ اس پہ دھیرے دھیرے کچھ خوف اور گھبراہٹ طاری ہو رہی تھی۔ جیسے جیسے وہ عون کے بارے میں سوچتی دل اتھاہ گہرائیوں میں خود بخود ڈوبنے لگا تھا۔ عون کہاں تھا؟ اس کے گھر رخصتی کے وقت بھی موجود نہیں تھا۔ وہ کس طرح سے عون کے موڈ کا اندازہ کرتی؟ وہ کس طرح عون کے رویے سے اس کی کیفیت کو جانچتی۔

وہ گھر آکر بھی اسے نظر نہیں آیا تھا۔ کھانے کے وقت بھی اندر نہیں آیا۔

آخر کچھ تو تھا جو اس کے دل میں وہم جگا رہا تھا۔ پریشان کر رہا تھا۔ اور ماہم کہتی تھی۔ اس کی مرضی تھی تو تب ہی اچانک نکاح اور رخصتی ہو گئی۔

تب بھی ماہ رو کا دل مطمئن نہیں ہوا تھا۔ یہ نکاح اور رخصتی پھر گھر والوں کا سرد سا رویہ کچھ بھی نارمل نہیں لگ رہا تھا۔

یہ "مرضی" سے زیادہ زبردستی والی شادی لگ رہی تھی۔ لیکن عون کے گھر والوں کو کیا ضرورت تھی اس پر دباؤ ڈال کر ماہ رو سے شادی کرواتے؟ وہ خود ہی ہر خدشے کو اٹھاتی اور دوسرے ہی لمحے گرا دیتی۔ پھر بھی دل کو چین نہیں تھا۔ وہ کہاں تھا؟ کیوں نہیں آرہا تھا؟ وہ تھکن سے ٹوٹتے ہوئے انگ انگ کے ساتھ عون عباس کا انتظار کر رہی تھی۔

"معا" دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا تو بے ساختہ وہ سمٹ کر چونک گئی تھی۔ ایسے ہی غیر ارادتا" اس کی نگاہ سنہرے گھڑیال پر پڑی تو اچانک ماہ رو چوکنا ہوئی تھی۔ گھڑیال پہ تین بجنے کا الارم گونج رہا تھا۔ اس نے نیند سے بوجھل آنکھوں کو بمشکل کھولنے پر آمادہ کیا۔

سامنے ثنا ہی کھڑی تھی وہ ثنا جو کھانا بھی دے کر گئی تھی۔ اب نجانے کیوں آئی تھی؟ ماہ رو بمشکل سیدھی ہوئی۔ ثنا نے ایک نظر ماہ رو کے تھکے تھکے چہرے کی طرف دیکھا تھا اور پھر جوں کی توں کارنر پہ رکھی ٹرے کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ کھانا پڑا پڑا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ ماہ رو نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ثنا کو کچھ بے چینی سے ہوئی تھی۔

"تم نے کھانا نہیں کھایا ماہ رو!"

"بھوک نہیں ثنا بھابھی!" اسے کچھ تو جواب دینا ہی تھا۔

"کیوں بھوک نہیں؟" ثنا نے کچھ تفکر سے کہا۔ کیونکہ گزشتہ رات وہ اسپتال میں رہ کر آئی تھی اس لیے ثنا کو کچھ پریشانی سی محسوس ہوئی تھی۔ کیا پتا' طبیعت خراب ہو۔

"دل نہیں چاہ رہا۔" اس نے بے زاری دکھائی تھی۔ واقعی ہی کھانے کو دیکھ کر طبیعت اوب رہی تھی۔ اور خوشبو جیسے دماغ کو چڑھ رہی تھی۔

"لیکن کھانا دل میں نہیں جاتا۔ معدے میں جاتا ہے۔" ثنا نے ماحول پر چھائی کثافت کو کم کرنے کی ہلکی سی کوشش کی تھی۔ تب ایک مرتبہ تو ماہ رو کا دل چاہا تھا ثنا سے دل میں اٹھتے سوالوں کے جواب پوچھ لے۔

لیکن اس کے سارے سوال اندر ہی اندر دم توڑ گئے تھے۔ وہ کچھ بھی نہیں پوچھ پائی تھی۔

"تو پھر میں دودھ لے آتی ہوں۔ کچھ معدے میں تو جائے گا نا۔" ثنا کی آواز اسے سوچوں کے بھنور سے کھینچ لائی۔ ماہ رو نے فورا" نفی میں سرہلایا تھا۔

"پلیز بھابھی! دودھ نہیں۔ میرے سر میں آل ریڈی (پہلے ہی) درد ہے۔ میں ٹھنڈا دودھ نہیں لوں گی۔"

"تو پھر چائے لے آتی ہوں۔" ثنا نے نرمی سے

کہا۔ تب سے لے کر اب تک ثنا ہی ماہ رو کے کمرے میں کئی مرتبہ جھانک کر اس کا احوال پوچھ رہی تھی۔ کسی اور نے آنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ شاید مریم سو چکی تھی۔ اس کے بیٹے کی طبیعت بھی نہیں ٹھیک تھی۔ اور کائنات بھی نجانے کہاں غائب تھی۔ وہ تو دکھائی بھی نہیں دی۔ ماہ رو کو خاصا دھچکا لگا تھا۔ "کیا کائنات بھی اس کے آنے پر خوش نہیں تھی۔"

پھر اس کی سہیلی فریحہ بھی نظر نہیں آئی۔ کم از کم فریحہ تو آتی۔ گو کہ اس کی شادی بہت اچانک ہوئی تھی وہ فریحہ کو اعتماد میں بھی نہیں لے سکی تھی پھر بھی فریحہ کو آنا تو چاہیے تھا۔ وہ رخصتی کے وقت بھی ماہ رو کے گھر نہیں آئی تھی' اس کی امی بھی نہیں تھیں۔ کیا یہ لوگ گھر میں موجود تھے؟ اگر تھے تو پھر دکھائی کیوں نہیں دیے۔

"بھابھی فریحہ کہاں ہے؟" ماہ رو نے بڑے آرام سے ثنا کو مخاطب کرکے فریحہ کی غیر موجودگی کے متعلق پوچھ لیا تھا۔ یوں کہ ثنا کا عجیب ہی انداز میں منہ کھل گیا۔ اور شدید حیرت تھی اس کی آنکھوں میں۔ کیا یہ ماہ رو مذاق کے موڈ میں تھی؟ یا پھر فریحہ پہ طنز کر رہی تھی؟ یا فریحہ کو جلانا مقصود تھا؟ ظاہر ہے فریحہ کی جگہ اس کی سیج پر قبضہ جما کر بیٹھی تھی اور فریحہ کے متعلق استفسار کر رہی تھی۔ کیسی حیران کن بات تھی۔

"اس وقت تو فریحہ سو چکی ہوگی۔" ثنا نے ذرا مبہم سا جواب دیا تھا۔

"لیکن دوپہر' سہ پہر' شام اور رات کو بھی وہ نظر نہیں آئی۔" اس نے پھر سے سوال داغا تھا۔ "کیا تب بھی سو رہی تھی؟" وہ عام لہجے میں لاپروائی سے بولی۔ ثنا جیسے تعجب میں گم ہوگئی تھی۔ کیا ماہ رو واقعی ہی انجان تھی؟ وہ اس کا چہرہ کھوجتی رہی تھی۔ کچھ سوچتی رہی تھی۔ یہ کس طرح سے ممکن تھا کہ ماہ رو انجان رہتی؟ کیا اسے عون نے نہیں بتایا؟ اور عون نے بھلا کیوں نہیں بتایا ہوگا۔ ایک طے ہوئی شادی اچانک ٹوٹی تھی۔ اور ماہ رو کی وجہ سے ٹوٹی تھی۔ اور ماہ رو اس طرح انجان پن اور بھول پن سے پوچھ رہی تھی جیسے کچھ اتا پتا ہی نہ ہو۔ ثنا دل ہی دل میں ماہ رو کی لاجواب ایکٹنگ کی قائل ہوگئی۔

"میں تو سوچ رہی تھی فریحہ سے لمبی گپ لگاؤں گی۔ اور اسے یہ بھی بتاؤں گی اس قدر اچانک یہ سب کیسے ہوا۔ فریحہ تو مجھ سے ناراض ہوگی۔ میں نے اسے کچھ بتایا جو نہیں۔ **ایکچوئیلی**! فریحہ سے رابطہ نہیں ہو سکا۔" ماہ رو نے مزید اپنی صفائی دینے کی کوشش کی تھی۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔

"فریحہ کیسے آسکتی ہے؟ وہ تو ابھی تک سوگ میں ہے۔ سوگوار ہے بے چاری۔ اس کے ساتھ کیا کچھ کم ہوا ہے؟ اسے تو سنبھلنے میں بڑا وقت لگے گا۔" ثنا نے اچانک بول کر اسے سوچوں کے گہرے سمندر سے نکال لیا تھا۔ گو کہ ثنا کا لہجہ طنزیہ نہیں تھا۔ نہ وہ طنز کر رہی تھی۔ نہ اس کے الفاظ ایسے تھے جو برے لگتے۔ ثنا نے خاصے محتاط لفظوں کا چناؤ کیا تھا۔ کیونکہ ماہ رو کے ساتھ اس کا رشتہ بہت نازک ہو چکا تھا۔ وہ ایسا کچھ نہیں بولنا چاہتی تھی جو ماہ رو کو برا لگتا۔ یا پھر وہ عون کو پہلی ہی رات شکایتاً "بتادیتی۔ اور ثنا کا امپریشن نئی نئی امیر ترین دیورانی پہ برا پڑتا۔ بہرحال فریحہ سے لاکھ ہمدردی سہی' وہ اپنی سسرال میں کھڑی تھی اور خاصے اکھڑ مزاج دیور کی ناراضی مول نہیں لے سکتی تھی۔

"اس کی سوگواریت یا پریشانی کی وجہ کیا ہے؟" اب کہ ماہ رو نے خاصی سنجیدگی بھرے تفکر سے پوچھا تھا۔ عون اپنی شادی توڑ کر' مہندی کے پنڈال سے سیدھا نکاح کرکے واپس لوٹا تھا اور یہ محترمہ جانتی تک نہیں تھیں کی فریحہ کے ساتھ کیا ہوا؟ حد ہی حد تھی۔

"فریحہ کی شادی ٹوٹی ہے۔ اس کے خواب ٹوٹے ہیں۔ جس بارات کا اسے انتظار تھا وہ آئی نہیں۔ تو کیا وہ شادیانے بجائے؟" بالآخر ثنا نے دھیمی مگر طنزیہ آواز میں ماہ رو کے سارے طبق روشن کردیے تھے وہ دلہناپے کا روپ بھلا کر ایسی ہکا بکا ہوئی کہ اپنی جگہ سے پوری کی پوری اٹھ کھڑی ہوئی۔ کیونکہ شاک ہی ایسا تھا۔

"فریحہ کی شادی ٹوٹ گئی؟ کیا اس کی شادی ہو رہی

تھی؟ اور مجھے بتایا بھی نہیں۔ انوائٹ تک نہیں کیا۔ ہماری یک جان دو قالب والی دوستی نہ سہی۔ تاہم فرینڈ شپ تو ضرور تھی اس نے مجھے اطلاع بھی نہیں دی۔" پہلی مرتبہ ماہ رو کی آواز میں کچھ خفگی اور شاک والی کیفیت نمایاں ہوئی تھی۔ اسے شدید دکھ ہوا۔ کیا فریحہ نے اسے اپنی خوشی میں بلانے کے قابل بھی نہیں سمجھا تھا؟ افسوس ہی افسوس تھا۔ اور ادھر ثنا خود بھی انتہائی تعجب کے عالم میں اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی تھی۔ اسے ماہ رو کی حیرت' شاک اور خفگی اب کی دفعہ کوئی اداکاری نہیں لگی تھی۔ تو کیا ماہ رو واقعی ہی انجان تھی؟ لیکن وہ انجان کیسے ہو سکتی تھی؟

ثنا کا دماغ تو اس گورکھ دھندے میں الجھ کر بالکل ماؤف ہوگیا تھا۔ کیونکہ دکھلاوا کم از کم اس قدر شفاف نہیں ہوتا۔ اس میں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہوتا ہے جو چونکا دیتا ہے۔ اور ایسا دقیق ڈھکوسلہ کرنا آسان بھی نہیں۔ ثنا کو ماہ رو کے انجان پن پہ یقین آگیا تھا۔

"فریحہ کی شادی کیوں ٹوٹی کیا ہوا تھا؟" ماہ رو کے اگلے سوال نے ثنا کا دماغ پھر سے گھما ڈالا تھا۔ اس کا منہ پھر سے تعجب بھرے انداز میں کھل گیا تھا۔ گو کہ اسے امید تھی ماہ رو اگلا سوال یہی کرے گی پھر بھی۔ اور ابھی ماہ رو کو جواب دینا چاہتی ہی تھی جب دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھل گیا تھا۔ ثنا گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی تھی۔



رات کی سیاہی سپیدہ صبح میں نہیں ڈھل رہی تھی۔ یوں لگتا تھا رات بھی آج ٹھہری گئی ہے۔

یوں ہی بے سبب زندگی کی سویرے پہ شام غالب آگئی تھی۔ ہر طرف ویرانی' سیاہی اور اندھیرا تھا جو ڈھلتا ہی نہیں تھا زندگی میں اچانک موڑ آتے ہیں۔ پھر بھی ذہن و دل انہیں قبول کر لیتا ہے۔ ہر حادثے کے بعد کی صورت حال کو بھی قبول کر لیا جاتا ہے۔ لیکن کچھ موڑ اور حادثے اس طرح بھی آتے ہیں جو برسوں ذہن و دل کی تختی سے مٹ نہیں سکتے۔ کھرچنا چاہو تب بھی نہیں۔ بھلانا چاہو تو تب بھی نہیں۔

عون عباس کی زندگی میں بھی اچانک ایک موڑ آیا تھا۔ جو زوردار حادثے کا سبب بنا تھا۔ اور اس حادثے میں عون عباس کا بڑا نقصان ہوگیا تھا۔ اس نے بہت کچھ کھو دیا تھا۔ عموماً" حادثے بڑے بھیانک ہوتے ہیں۔ جو زندگی کی قید تک سے آزاد کر ڈالتے ہیں۔ لیکن عون کی زندگی کا حادثہ بس یہاں تک محدود نہیں تھا۔ وہ اس حادثے میں زندگی کی حد تک بچ گیا تھا۔ لیکن باقی سب اس کا لٹ چکا تھا۔ ختم ہوگیا تھا۔ اس نے اپنے ماں باپ کے اعتبار کو کھویا تھا۔ اپنے بھائیوں کے اعتماد کو کھویا تھا۔ اپنے وقار' عزت' انا اور کردار کو کھویا تھا۔

اس نے بڑی گہری ضرب کھائی تھی۔ بڑی ذلت اٹھائی تھی۔ ہر آنکھ کی نفرت برداشت کی تھی۔ اپنوں کی بیگانگی کا مزہ چکھا تھا۔ جب وہ لوگ اسے بے یقین نگاہ سے دیکھتے تو عون کا دل چاہتا وہ ہر چیز کو تہس نہس کردے۔ جب وہ لوگ بے اعتباری کا مظاہرہ کرتے' اس پر یقین نہ کرتے' اسے جھوٹا' ڈھونگی' اور منافق سمجھتے۔ اس پہ کبھی اعتبار نہ کرنے کا اعلان کرتے تب پورے کا پورا عون عباس کنگال ہو جاتا تھا۔ تو اس کا دل چاہتا ہر شے کو ٹھوکروں سے اڑا دے۔ تباہ کردے۔

کوئی دو گھڑی اس کے پاس کھڑا رہنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ جیسے وہ کوئی اچھوت ہو۔ ہر سو ذلت ہی ذلت تھی۔ اور اس ذلت کا سبب صرف ایک ذات تھی۔ جو اس کی سزا بن کر نہیں بلکہ انتقام بن کر اس گھر میں آئی تھی۔

وہ غیض کے عالم میں اٹھتا' چلتا' گرتا اور پھر سر تھام کر دہاڑنے لگتا۔ یہ اس کے انتہائی ڈیپریسڈ (پریشان) ہونے کو ظاہر کرتا تھا۔ معاً" دروازے کی چرچراہٹ کے ساتھ ہی لکڑی کے بھاری پاٹ کھلے اور بند ہوئے تھے۔ عون نے لہو رنگ خونی آنکھوں کو اٹھا کر دیکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔ کوئی دبے قدموں اس کی پشت کے قریب آگیا۔ وہ آنے والے کی گہری افسردہ سانسوں سے ہی سمجھ گیا تھا کہ کون اس کے پیچھے کھڑا ہے؟

تائی نے دل میں اٹھتی اذیت کی لہر کو دبا کر ہاتھ میں پکڑا گلاس میز پہ رکھا تھا۔ پھر وہ اس کے قریب ہی دیوان پہ بیٹھ گئی تھیں۔

ماں کو دیکھ کر سیدھا ہونا ہی پڑا تھا۔

"عون! تم نے کھانا نہیں کھایا۔ نہ کل شام نہ صبح نہ دوپہر۔ اور ابھی دیکھو' اگلی سویر بھی آرہی ہے۔ بیٹا! یہ دودھ تو پی لو۔" تائی کی آواز میں سابقہ کسی بات کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ بس چاہتی تھیں کہ کم از کم ان کے سامنے عون ٹھیک رویہ رکھے۔

"جب موڈ ہوا کھالوں گا۔ کس کو تکلیف نہیں دوں گا۔"

"عون! میری جان! ادھر دیکھو! میرا کیا قصور ہے؟ مجھ سے کیوں ناراض ہو؟" تائی نے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اس کا سرخ کرب اذیت کے تاثرات سے سجا چہرہ تھام کر اذیت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ تب عون کچھ بے چین ہو گیا تھا۔

"میں نے کب آپ سے کچھ کہا۔ جو میرے ساتھ ان لوگوں نے کیا۔ اس میں آپ کا قصور ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ دکھ مجھے اس بات کا نہیں ہے۔ کہ ماہ رو نے اپنے مقام سے گر کر ابو وغیرہ کو ورغلایا اور مجھے سارے زمانے میں بدنام کر دیا۔ تکلیف مجھے ابو کی بے اعتباری کی ہے۔ کیا ابو مجھے نہیں جانتے تھے؟ میں نے کب ان کا سر جھکایا تھا؟

اگر ماضی میں میرا کوئی شرمناک قصہ ابو تک پہنچا ہوتا تب تو وہ اعتبار ہی کر لیتے۔ کہ میں ایسا ویسا ہوں۔ اور مجھ سے ہر برے فعل کی توقع کی جاسکتی ہے۔ لیکن جب میرا ماضی شفاف تھا تو حال اچانک اتنا برا اور بدنما کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ جسے گنگا میں نہائی سمجھ کر آپ بیاہ لائے ہیں۔ اس پہ بھی مجھے افسوس نہیں۔ کیونکہ وہ اپنے مقام سے گرا ہوا ہر کام کر سکتی ہے۔ یہ ان لوگوں کی سوسائٹی میں فیشن ہے۔ لیکن میں اس کی چالبازیوں اور گندے لائف اسٹائل کے چنگل میں نہیں آؤں گا۔ میں اس عورت کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ میں اس عورت سے بڑا سخت قسم کا انتقام لوں گا۔ ابو نے اسے عزت دار طریقے سے گھر لا کر مجھے سزا نہیں دی۔ بلکہ مجھے میرا انتقام پورا کرنے کا بہترین موقع فراہم کیا ہے۔

میں اسے ایسی سزا دوں گا۔ کہ عمر بھر یاد کرے گی۔ جو کچھ میں نے کھویا ہے۔ اس عورت کو بھی کھونا پڑے گا۔" اس کے دھیمے سلگتے لہجے میں زخمی سانپ سی پھنکار تھی۔ تائی کا دل جیسے دھک سے رہ گیا تھا۔

"عون! تو پاگل ہو چکا ہے؟ ہم خاندانی لوگ ہیں۔ ہمارے ہاں' بہو' بیٹیوں اور بیویوں کی قدر' عزت کی جاتی ہے۔ اور تم....." ان کا دل پھڑپھڑانے لگا تھا۔ عون کے ارادے تو انتہائی خطرناک لگ رہے تھے۔ آخر وہ ماہ رو کے ساتھ کیا کرنے والا تھا؟

"نہیں عون! ہرگز نہیں۔ تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔ جو ہو گیا اسے بھول جاؤ' یا بھلانے کی کوشش کرو۔ تم اپنے باپ کو جانتے تو ہو۔ اس لڑکی کے ساتھ کچھ برا کیا تو پھر سے گھر میں جنگ کا طبل بج جائے گا۔"

کیا خبر' اندر اپنے کمرے میں جاتا تو کچھ مزاج میں تبدیلی آجاتی؟ ماہ رو کو دیکھ کر شاید حواسوں پہ چڑھی گرمی اتر جاتی۔ چاہے وہ کسی بھی سازش کے ذریعے آئی تھی۔ اب آتو چکی تھی۔ ان کی بہو تھی۔ گھر کی عزت تھی۔ انہوں نے ماہ رو کے لیے اپنے دل میں تھوڑی جگہ بنالی تھی اور انہیں لگتا تھا ماہ رو کی موہنی صورت دیکھ کر عون بھی پگھل جائے گا آج نہ سہی کل تک اس کا غصہ اتر جائے گا۔ لیکن فی الحال انہیں عون کو بہلا پھسلا کر ماہ رو کے پاس بھیجنا تھا۔ وہ بے چاری تھکی ہاری جانے کب سے اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔

تائی خود بھی ایک ماں تھیں' ان کا جلدی دل پسیج گیا تھا اور وہ چاہتی تھیں عون اپنے کمرے میں جائے۔ آرام کرے۔ ٹھنڈے دل سے سوچے۔ جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے کیا خبر' اسی میں بہتری ہو۔ وہ ہمیشہ مثبت رخ پہ سوچتی تھیں۔ اسی لیے مطمئن رہتی تھیں جو کچھ ہوا تھا وہ واقعی ناقابل قبول تھا۔ دل و دماغ کو ہی نہیں زندگی کو بھی جھنجوڑ چکا تھا' لیکن اب گزرے برے وقت پہ رونے اور ماتم کرنے سے بہتر تھا آنے

والے وقت کو اچھا بنالیا جاتا' لیکن یہ باتیں عون کو سمجھانا انتہائی کٹھن تھا۔

"عون! اٹھو' اپنے کمرے میں جاؤ۔ دیکھو بیٹا! جو گھر میں گنے چنے مہمان رہ گئے ہیں انہیں باتیں بنانے کا موقع مت دو۔ وہ کیا سوچیں گے فریحہ کو ٹھکرا کر اپنی من پسند دلہن ڈنکے کی چوٹ پہ لایا ہے اور اسے بھی دیکھنا گوارا نہیں کر رہا کیا اسی میں خرابی ہے؟ ایسے فضول تبصروں سے بچنے کے لیے ضروری ہے۔ اپنے کمرے میں جاکر آرام کرو۔ دیکھو' دلہن سے اچھی طرح بات کرلینا۔۔۔ بیٹا! میری مجبوری سمجھو۔ اب میں مزید ماہ رو کی وجہ سے تم دونوں باپ بیٹے میں دوریاں نہیں دیکھ سکتی۔ اور وہ ماہ رو کے لیے بہت حساس ہو رہے ہیں۔" تائی نے نگاہ چرا کر جیسے التجا کی تھی۔

"ظاہر ہے' ان کے بیٹے نے ماہ رو کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اس کو بے عزت کیا ہے۔ اغوا کرنے کے لیے اس کے گھر دھاوا بولا ہے۔ وہ ان کی نظروں میں معصوم ہے۔ مظلوم ہے۔ وہ کیوں نا حساس ہوں گے۔" اس نے مارے غصے اور تنفر کے دودھ کا گلاس اٹھا کر دیوار سے دے مارا تھا۔ پھر تن فن کرتا ہال کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جارحانہ قدموں کی دھمک اس کمرے کی طرف جاتی سنائی دی تھی جس کمرے میں ڈنکے کی چوٹ پہ آئی ماہ رو جلوہ افروز تھی۔ تائی نے خوف کے مارے پھڑپھڑاتے دل پہ ہاتھ رکھ کر بے ساختہ ماہ رو کی سلامتی کے لیے دعائے خیر کی تھی۔



اور پھر وقت کے بجتے گھنگروؤں پہ بالآخر سکوت طاری ہو گیا تھا۔ صحرا میں باد صبا چل پڑی تھی۔ کچھ دیر پہلے کا گھٹن بھرا سماں ٹوٹ گیا تھا جس کا اختتام ہو گیا تھا۔ وہ دیوان عام سے نکل پڑا تھا۔ اس کے قدموں کا رخ ماہ رو کے کمرے کی طرف تھا۔ وہ اسے تصور کی آنکھ سے دیکھ رہی تھی۔ اور اس کا دل ایک ایک قدم پہ اعلان پیار کر رہا تھا۔ اس کی مشک بار پلکوں پہ حیا کا بوجھ پڑا اور وہ جھک کر گلاب رخساروں کو سلام پیش کرنے لگیں وہ قریب آرہا تھا۔ قریب آرہا تھا۔ قریب آچکا تھا۔ دروازہ کھلا اور پھر بند ہو گیا۔ اس کے قدموں کی چاپ' ماہ رو کا دل سن رہا تھا۔ اس کے ایک ایک قدم کو ماہ رو کا دل گن رہا تھا۔ پھر جب وہ نپے تلے قدم اٹھاتا اس کے قریب آیا تب لمحہ بھر کے لیے ماہ رو کا دل رک سا گیا تھا۔ اس کی ہتھیلیاں پسینے سے تربتر تھیں وہ کیسے پیش آئے گا؟ وہ کیا کرے گا؟ اور ماہ رو کو اپنے گھر میں ایک ہی رات کے اندر ڈھیر ساری بے زاری اور نفرت کے باوجود لے کر آنے کی کیا توجیہہ پیش کرے گا؟ کیا اس کا دل پلٹ گیا۔ وہ اچانک دل کی زمین پہ اگ آنے والی محبت کا حرف حرف سنائے گا۔ ماہ رو سرفراز نے اندھا دھند چلتے ہوئے' بے خیالی اور عالم جنون میں محبت کی ایک فصل کاشت کی تھی۔ آج اس فصل اور گلشن کا حقیقی مالک آگیا تھا۔ اپنے پیار کی برسات میں غنچہ غنچہ بھگونے۔ اس کا جھکا سر پھر اٹھ نہ سکا۔ کیونکہ عون عباس اس کے سر پہ کھڑا تھا۔ ماہ رو کو کچھ عجیب سا لگا۔ وہ کھڑا کیوں تھا۔ مقابل بیٹھ جاتا۔ اس کا خاموش ہونا بھی عجیب لگ رہا تھا۔ وہ خاموش کیوں تھا؟ ماہ رو کا خوش رنگ دھنک اوڑھ کے لہراتا دل کچھ گھبرا سا گیا۔ وہ ابھی تک اس کے سر پہ کھڑا تھا۔ کسی ننگی تلوار کی مانند۔ آخر کیوں؟ ماہ رو کو خود ہی اس عجیب طرح کے فسوں کو توڑ کر گردن کچھ اٹھانا پڑی تھی۔ اور پھر اس کی سحر طراز آنکھیں جیسے عون عباس کے چہرے پہ جم گئی تھیں۔ اس چہرے پہ کیا کچھ نہیں تھا۔ غصہ حقارت' نفرت' کراہت' گھن۔۔۔۔ اور یہ ماہ رو تھی جسے کبھی تاثرات پڑھنے' چہرے کھوجنے ہرگز نہیں آئے تھے۔ وہ تو سمجھ ہی نہ پاتی کہ آنکھوں اور چہروں کی کہانیاں کیا ہوتی ہیں؟ چہرے کتابیں کیسے بن جاتے ہیں؟ اور لوگ ان کتابوں کو حفظ کیسے کرلیتے ہیں؟ لیکن آج عون عباس کے تاثرات کو دیکھ کر اسے چہرے پڑھنے کے فن کا پتا چل گیا تھا۔ اسے سمجھ آگئی تھی کہ چہرے کس طرح سے پڑھے جاتے ہیں۔ اور یہ عون عباس کا چہرہ تھا۔ اور یہ ماہ رو کے محبوب کا چہرہ تھا۔ غیض و غضب کے رنگوں سے سجا' شدید نفرت کے

تاثرات سے برہم' زہریلے تیوروں سے اٹا۔ اور ماہ رو کا دل ڈوب گیا تھا۔ اس نے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھ لیا۔ اب وہ ساکت جامد نہیں تھا وہ اب بول رہا تھا۔ اور کیا وہ بول رہا تھا؟ اور وہ نہ ہی بولتا تو اچھا تھا۔

"اور بالآخر تم نے اپنا باکمال عشق پالیا۔ یہی کہا تھا نا تم نے۔ تمہیں مجھ سے محبت ہے دیوانگی کی حد تک اور تم نے یہ بھی کہا تھا۔ میں اسے ثابت کروں گی... کہا تھا نا... اب بولتی کیوں نہیں ہو... وہ لمبی زبان کہاں بھول آئی؟..." وہ کسی وحشی جانور کی طرح ماہ رو پہ جھپٹ پڑا تھا۔ انتہائی تکلیف و اذیت کی لہر نے ماہ رو کو یک دم چلانے پہ مجبور کردیا تھا۔ ورنہ اس کے تیور دیکھ کر ہی اس نے فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ جو بھی بکواس کرے گا۔ ماہ رو اس کا جواب نہیں دے گی۔ وہ خوف وہراس کے عالم میں ٹھٹھر گئی تھی۔ عون کا رویہ اس کے گمان کی آخری حد پہ بھی کہیں نہیں تھا۔ اس کے تصور میں بھی کہیں نہیں تھا۔ ایسا بہیمانہ استقبال؟ ماہ رو کا دل سینے کی سرحد توڑ کر چلایا۔ وہ اسے اپنی چاہ سے یہاں لاکر اتنا ذلیل کر رہا تھا؟ آخر کیوں؟ وہ اسے اذیت دے رہا تھا آخر کیوں؟

"چلاؤ مت' میری بات کا جواب دو۔ اور اپنا کہا پورا کرو... اپنے عشق کو ثابت کرو۔" وہ اس کے کان کی لوؤں پاس غرایا تھا۔ شدت درد کی وجہ سے ماہ رو کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ آنسو بہنے لگے تھے۔ وہ بے آواز رونے لگی۔

"اور کہو نا... تم نے ثابت کردیا اور واقعی ثابت کردیا۔ بڑی ڈینجرس پلاننگ تھی تمہاری۔ بڑے بڑے سورماؤں کے تجربوں اور عقل کو سلب کردیا تم نے۔ بڑے زہریلے ناگ سے ڈسوایا تم نے۔ کسی کو دوسرا سانس نہ لینے دیا۔ کچھ اور تک نہ سوچنے دیا۔ میں تمہاری شاطرانہ ذہنیت کی داد دیتا ہوں اور آج یہ داد و تحسین کی رات ہے۔ اور میں تمہیں اپنے ہی انداز میں تحسین پیش کروں گا۔ پھر تم سرپرائزڈ رہ جاؤ گی۔" اس نے ماہ رو کے گال میں پنجے گاڑ کر جھٹکا دیا تو وہ ایک ہی وار میں کراؤن سے جا لگی تھی۔ اس کا سر بری طرح سے چکرا گیا تھا۔

"چھوڑو مجھے! وحشی آدمی! تم پاگل ہوچکے ہو۔" ماہ رو کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوگیا تھا۔ اس نے درد کی شدت سے چلا کر کہا تھا۔ اس کی تکلیف کو محسوس کرکے عون کچھ اور شیر ہوا تھا۔ وہ یہی چاہتا تھا ماہ رو تکلیف سے روئے' چلائے... ہاتھ جوڑے' پیروں میں گرے۔

"ہاں... پاگل تو میں ہوچکا ہوں' مگر تمہاری محبت میں نہیں... تمہاری نفرت میں پاگل ہوچکا ہوں۔ اور تم اس پاگل کا 'پاگل پن' آہستہ آہستہ دیکھتی رہو گی۔ پھر عادی ہوجاؤ گی۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"اور میں تمہیں طلاق کبھی نہیں دوں گا۔" اس نے ادھورا جملہ مکمل کردیا تھا۔ ماہ رو گھٹنے پہ سر رکھے اپنی سسکیاں دبانے لگی۔

"میں طلاق لینے کے لیے آئی بھی نہیں تھی۔ میں تو تمہارے لیے آئی تھی' لیکن تم وہ نہیں... تم تو کوئی اور ہو۔" اس کا دل اونچی آواز میں کرلاتا رہا۔ عون عباس سابقہ انداز میں دھاڑتا رہا۔

"میں تمہیں اپنے ساتھ ہمیشہ کے لیے باندھ کر سزا دوں گا۔" اس نے بڑے کروفر کے ساتھ فیصلہ سنا دیا تھا۔

"یہی تو میں پوچھنا چاہتی ہوں۔ کیسی سزا دو گے؟ کیوں دو گے؟ میرا جرم کیا ہے؟ میرا گناہ کیا ہے؟" اس کی سسکاریاں کمرے کی خاموش فضا میں گونجتی رہی تھیں۔ ماہ رو روتی رہی تھی اور بڑے زخمی انداز میں پوچھ رہی تھی۔ عون اس کے معصومانہ سوال پہ پھٹ پڑا تھا۔

"اس سادگی پہ کون نہ مرجائے۔ مجرم اپنے جرم سے خود بھی آگاہ نہیں۔ اپنا گناہ مجھ سے پوچھتی ہو؟ ذرا اپنے آپ سے تو پوچھو' اپنے ضمیر سے پوچھو۔ کیا تمہیں یہاں ہونا چاہیے تھا؟ کیا تم نے کسی اور کی جگہ نہیں لی؟ کیا تم نے کسی اور کے ارمانوں کا خون نہیں کیا۔ کیا تم نے کسی کا دل برباد نہیں کیا؟۔ میں اپنے ساتھ کیے تمہارے ہر جرم کو نظر انداز کر بھی دوں؟

تمہارے حسن کی تابناکیوں سے وقتی طور پر بہل بھی جاؤں تو اپنے اس ضمیر کا کیا کروں؟ جو مجھے ابھی تک چین لینے نہیں دے رہا۔ مجھے پل صراط پہ کھڑا کیے ہوئے ہے۔ میرے اندر آگ لگا رکھی ہے۔ میرے اندر زہر بھر رکھا ہے۔ اس ذلت کو بھول بھی جاؤں جو مجھے تمہارے توسط سے ملی ہے تو اس فریحہ کا کیا کروں؟ جس کی آہیں میرا دل پھاڑتی ہیں' جس کے چہرے کی زردی' جس کی آنکھوں کی ویرانی' جس کی بے رنگ کلائیاں میرا رستہ روکتی ہیں..... بتاؤ' مجھے اس دوراہے پہ کیوں لائی ہو؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟ بتاؤ' میری زندگی میں کیوں آئی ہوں؟" وہ زخمی شیر کی طرح ایک مرتبہ پھر بپھر گیا تھا۔ یوں کہ ماہ رو کی آنکھیں بھی پھٹ گئی تھیں۔ یہ عون عباس کیا کہہ رہا تھا؟ یہ عون عباس کیا کہنا چاہتا تھا؟

ماہ رو نے کیا کیا تھا؟ کس کا دل اجاڑا تھا؟ کس کو برباد کیا تھا۔ کس کی آنکھوں میں ویرانی بھری تھی؟ کیا فریحہ؟ مگر یہاں فریحہ کا کیا ذکر؟ فریحہ کیوں؟ اور یہ عون فریحہ کا نام کیوں لے رہا تھا؟ اور پھر خوف و ہراس کی آخری حد سے پھسلتے ہوئے اچانک ماہ رو کی نگاہ سے سیاہ پردہ کھسک گیا۔ اسے ثنا کی باتیں یاد آگئی تھیں۔ اسے گھر والوں کی اذیت' خاموشی اور دکھ کی وجہ سمجھ میں آگئی تھی یہ گھر جو شادی والا نہیں..... مگروالا لگ رہا تھا۔ یہاں لوگ تھے' مہمان بھی تھے' مگر بجھے بجھے۔ یہاں نئی دلہن آئی تھی' مگر وہ حقیقی جوش' ولولہ اور نئی دلہن کی آمد سے ہونے والی چہل پہل اور رونق مفقود تھی۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے نظر چراتا پھر رہا تھا اور ماہ رو نے اس گھر کی راہداریوں سے گزرتے ہوئے خود بھی ابٹن' مہندی' بیلے' گیندے کی خوشبو محسوس کی تھی۔ تو کیا اس گھر میں کل کسی کی مہندی تھی؟ گزرے ہوئے کل؟ جب وہ اسپتال میں بے ہوش پڑی تھی؟ ماہ رو کا سوچ کی انتہا۔ جیسے سانس رکنے لگا تھا۔ دل بند ہونے لگا تھا۔ جان نکلنے لگی تھی۔ کیا فریحہ کی عون کے ساتھ شادی ہو رہی تھی؟ جو مہندی کی رات ٹوٹ گئی تھی؟ فریحہ کی شادی کیوں ٹوٹی؟ بارات کیوں نہیں آئی؟ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں کا سوال عون عباس کی آنکھوں میں سم قاتل بھر رہا تھا۔

"اور آج وہ اکیلی ہے۔ اپنی ذات کی بت کدے میں تنہا بیٹھی نصیب کی اس ستم رسیدگی پر آنسو بہا رہی ہے اور میں یہاں شب زفاف سجا کر بیٹھ جاؤں؟ یہ تم ہو سکتی ہو خود غرض' خود پسند' تنگ دل اور کمینی۔ اور یہ تم ہو سکتی ہو شاطرانہ چالیں چلانے والی' کسی اور کے حق کو چھیننے والی۔ اپنا آپ طشتری میں رکھ کر پیش کرنے والی۔ میرے نزدیک تم جیسی عورتوں اور طوائفوں میں کوئی فرق نہیں۔ وہ بھی تمہاری طرح نفس پرست عورتیں ہوتی ہیں۔" اس نے ماہ رو کے بالوں کو زوردار جھٹکا دے کر ایک مرتبہ پھر باتوں سے خنجر چلائے تھے یوں کہ اس دفعہ ماہ رو بھی خاموش نہیں رہ سکی تھی۔ جب بات کردار پہ آئی تو ماہ رو بھی پوری جان سے چلا اٹھی تھی۔

"جسٹ شٹ اپ' تم کون ہوتے ہو' مجھے طوائف بولنے والے۔ مجھے کریکٹر لیس کہنے والے..... کیا تم عورتوں کے کریکٹر سرٹیفکیٹ پاس کرتے ہو؟ تم نے میرے ساتھ اتنا روڈ اینڈ ربش بی ہیویئر (مغرورانہ اور فضول رویہ) روا رکھا۔ میں خاموش رہی۔ تم نے مجھے ٹارچر کیا میں چپ رہی۔ تم بلاوجہ مجھے "برا" کہتے جارہے ہو..... اب کریکٹر کو گندا کہنا شروع کردیا۔ کیا میری تھانوں میں تصویریں لگی ہیں؟ یا میں نے فحاشی کے اڈے بنا رکھے تھے؟" وہ بھی ماہ رو سرفراز تھی۔ جب بولنے پہ آئی تو رکی نہیں تھی۔ بولتی چلی گئی تھی۔

"اور تم فریحہ کے کس ملال' غم' الم اور رنج میں ہو؟ میں نے فریحہ کے ساتھ کیا کیا؟ اگر فریحہ کی شادی تمہارے ساتھ نہیں ہو سکی تو اس میں میرا کیا قصور؟ میں نے تو نہیں رکوائی؟" وہ بھی دلہناپے کا روپ بھلا کر پھٹی پھٹی آواز میں روتے ہوئے غرائی تھی۔ پھر اب کون سی دلہن اور کون سا دلہناپا؟ ماہ رو کا دل چاہ رہا تھا۔ اپنا یہ حسین روپ خود بگاڑ ڈالے۔ اس زرتار لباس کو آگ میں جھونک آئے۔ وہ اس کے ایک ایک لفظ کو سنتا رہا۔ تولتا رہا..... پھر غضب ناک ہو کر چیخ پڑا۔

"واہ ری بے خبری؟ واہ ری چالاکی؟ تم نے نہیں رکوائی؟ اس معصومیت پہ ساری دنیا نہ مرجائے۔ بہت زہریلی ناگن ہو؟ جب تمہارا باپ سارے زمانے میں پرسے لیتا پھر رہا تھا اپنی بیٹی کی عزت لٹنے پہ ڈھونڈورا پیٹ رہا تھا اور میرے باپ کے سامنے صف ماتم بچھا رکھی تھی۔ میرے باپ کو ساہوکاروں کے بازار سے گھسیٹ کر اسپتال لے گیا تھا اور وہاں جو اس نے ماتم کیا۔ رونا ڈالا۔ پورے عالم میں اپنا اور ہمارا تماشا لگوایا اس سارے ڈراپ سین کے بعد تم کیا سمجھتی ہو مجھ جیسے بدکردار اغوا کار اور غنڈے سے چاچا اپنی بیٹی بیاہ سکتے تھے؟ یہ شادی تکمیل تک پہنچ سکتی تھی؟ قطعی نہیں۔ پھر یوں ہوا۔ تمہاری تمناؤں کے عین مطابق شادی والا گھر مرگ میں بدل گیا۔ یوں لگا' میرا ہی جنازہ اٹھ گیا ہو۔ ہر طرف رونا' آہیں' چیخیں' بکواس' طنز باتیں اور میرے باپ کا وہ جلال۔۔۔ جو مجھے کبھی بھولتا ہی نہیں۔ کبھی بھولے گا بھی نہیں۔ زندگی کی آخری سانس تک یاد رہے گا۔ وہ بے اعتباری' جو انہوں نے مجھ پہ کی' وہ طمانچے جو انہوں نے مجھے مارے۔ میں تو ابھی وہ پہلا طمانچہ نہیں بھول سکا تھا جو پلازہ کے دفتر میں مجھے میرے باپ نے مارا تھا۔ اس وقت جب تم اپنی سوکالڈ محبت کا ماتم کرکے گئیں۔ اور میں نے تمہیں دفتر سے نکال دیا تھا۔ تب میرے باپ نے تمہیں دیکھ لیا۔ اور یہ تمہاری ہی خوش نصیبی تھی کہ میرے باپ نے تمہیں خود دیکھ لیا۔ انہیں کسی اور ثبوت کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ وہ سمجھ گئے تھے میں نے تمہارے ساتھ کچھ غلط کیا ہے۔ پھر وہ دوسرا طمانچہ۔ جو میرے منہ پہ بھرے مجمع میں پڑا تھا۔ کیا اس طمانچے کی گونج میں بھلا سکتا ہوں؟ اس ذلت' اس توہین اور اس بے عزتی کو بھول سکتا ہوں۔۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔ اور یہ طمانچے اسی بے عزتی کے بدلے میں تمہیں بطور رونمائی پیش کررہا ہوں کیونکہ رونمائی کا تحفہ دینا ہمارے معاشرے کا پرانا رواج ہے۔ ہر دلہن کو اس کی حیثیت کے مطابق تحفہ دیا جاتا ہے۔ چونکہ تم اسی حیثیت اور قابلیت کی کیٹگری میں آتی ہو۔ سو تمہیں بالی' چوڑی' گہنوں کے بدلے میں طمانچے کا تحفہ دیا جارہا ہے تاکہ تم عمر بھر نہ بھلا سکو۔ ہمیشہ یاد رکھ سکو۔" عون نے ایک ہی سانس میں اندر کا سارا غبار' ساری بھڑاس نکال لینے کے بعد ایک بھرپور تھپڑ اس کے منہ پہ دے مارا اور وہ درد و کرب کی اذیت کو سہتی بلند آواز میں نہیں گھٹ گھٹ کر دیوانہ وار رو رہی تھی۔

اور عون عباس اندر تک سے سارے زہر' آگ' تنفر کو اکھاڑ کر کل تک کے لیے روح تک سرشار اور ٹھنڈا ہوچکنے کے بعد بڑے ہی کروفر کے ساتھ زمین پر اپنے پیروں کی دھمک دیتا باہر نکل گیا تھا۔ اور ماہ رو اپنی قسمت کے اس ظالمانہ موڑ پر انگشت بدنداں تھی۔ اس نے جو چاہا تھا جیسا چاہا تھا ویسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اور شاید فریحہ کی ساری بددعائیں فیض یاب ہوچکی تھیں۔ اگر رونا فریحہ کے نصیب میں لکھا جاچکا تھا تو سرشار اور خوش ماہ رو بھی نہیں تھی۔ اگر فریحہ برباد ہوئی تھی تو آباد ماہ رو بھی نہیں ہوسکی تھی۔ اگر عون عباس فریحہ کو نہیں مل سکا تھا تو ماہ رو بھی خالی ہاتھ' خالی دل بیٹھی تھی۔ اور اس نے کہا تھا وہ ساہوکار کا بیٹا ہے۔ ناپ تول میں پورا پورا حساب رکھے گا۔ برابری کی چوٹ پر ضرب مارے گا اور اس نے اپنا کہا پورا کردکھایا تھا۔



ہر گزرنے والی رات گزر ہی جاتی ہے۔ چاہے اچھی ہو یا بری۔ یہ اور بات ہے کہ ہر زخم بھول بھی جائے مندمل بھی ہوجائے تب بھی رویے کبھی نہیں بھولتے۔ رویوں کے زخم ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔ سو' رات گزرنے کے ساتھ وقت' لمحے' ساعتیں بھی بدل گئی تھیں۔ اگلا دن بھی چمک کر طلوع ہوگیا تھا کھڑکی کے پار سے سنہرے صبح بھی دریچے کی درزوں سے چھن چھن کر آتی کمرے کو روشنی سے بھر رہی تھی۔ ماہ رو نے تھکی تھکی سوجی آنکھوں کو بمشکل کھول کر گھڑیال دیکھا تھا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اٹیچ باتھ روم میں

گھس گئی تھی۔ باتھ روم کی طرف آتے ہوئے اس نے کمرے کی کسی بھی طرف نگاہ نہیں ڈالی تھی۔ اسے بس جلد از جلد فریش کردینے والے باتھ کی طلب تھی۔ اسے تازہ دم ہونا تھا۔ رات بھر کی گھٹن اور حبس کو باہر نکالنا تھا۔ سب سے بڑی بات عون کی گزشتہ رات ہونے والی ہر قسم کی بات اور بکواس کو بھلانا تھا۔ اور یہ ماہ رو کا آخری فیصلہ تھا۔ وہ رات کی کہانی کو رات میں ختم کرچکی تھی۔ جو رات کو ہوا تھا۔ وہ سویرے نہیں ہوسکتا تھا۔ ماہ رو ایسا موقع فراہم بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی۔ اس لیے کہ ماہ رو نے پیچھے ساری کشتیاں جلاڈالی تھیں۔ اسے مڑکر نہیں جانا تھا۔ عون عباس کی زندگی سے نہیں جانا تھا۔ وہ زندہ حالت میں یہاں آئی تھی اور مرکر یہاں سے جائے گی۔ ایک بات تو طے تھی وہ اسی گھر میں رہے گی اور عمر بھر رہے گی۔ جو کچھ رات میں ہوا تھا۔ وہ اچھا تو کہیں سے نہیں تھا۔ وہ تو بڑا ہی برا اور بدنما تھا۔ پھر بھی ماہ رو اپنے ستم گر کے ایک ایک ستم کو بھلا دینے کا پکا فیصلہ کرچکی تھی۔ وہ پوری رات سوچتی رہی تھی۔ اس نے ہر پہلو کو سوچا تھا جو کچھ ہوا تھا اس میں بے شمار چیزیں ابہام زدہ تھیں۔ ڈھکی چھپی تھیں اور بہت زیادہ بدگمانیوں اور غلط فہمیوں میں اٹی تھیں۔ عون نے جو کہا تھا بہت بڑی غلط فہمی کی بنیاد پہ کہا تھا۔ اسے شدید مس گائیڈ کیا گیا تھا۔ ڈیڈی نے ایسا کوئی الزام عون پہ نہیں رکھا تھا۔ کیا وہ خود اپنی بیٹی کو بدنام کرتے؟ ہرگز نہیں۔ عون کو یقینی طور پر کسی نے بھڑکا رکھا تھا۔ اس کے کان بھر رکھے تھے اور ماہ رو کے خلاف کرر کھا تھا۔

وہ گزشتہ شب عون کی کسی غلط فہمی، الزام یا بہتان کو غلط ثابت نہیں کرسکتی تھی۔ اپنی طرف سے کوئی بھی صفائی پیش نہیں کرسکتی تھی۔ وہ تب نہ کوئی صفائی لیتا نہ وضاحت سنتا اور نہ ہی کسی دلیل کو تسلیم کرتا۔ وہ بہت غصے میں تھے۔ یقینی طور پہ اس کا غصہ، دکھ، جلال سب کچھ اپنی جگہ درست تھا۔ اس وقت ٹھنڈے تازہ پانی سے فریش ہوکر وہ بلا کی تازہ دم اور تروتازہ ہوچکی تھی۔ گیلے بالوں کو تولیے میں لپیٹ کر وہ واش روم سے باہر آتے ہوئے رات کے ایک ایک منظر کو دانستہ بھلا کر نکلی تھی۔

وہ ساری اذیت کو بھلا کر پرسکون تھی۔ اسے پرسکون ہی رہنا تھا۔ کیونکہ وہ عون عباس سے محبت کرتی تھی۔ وہ اس کی محبت میں یہاں تک آئی تھی۔ اسے صرف محبت تھی اور عون عباس سے تھی۔ وہ برا تھا یا اچھا؟ اس سے محبت کرتا تھا یا نفرت؟ کوئی بھی سوال اسے اپنے مقصد سے ہٹا نہیں سکتا تھا۔ کوئی بھی رکاوٹ اسے عون عباس سے دور نہیں کرسکتی تھی۔ اور اب ماہ رو سرفراز کو اگلا لائحہ عمل بھی سوچنا تھا۔ اس گھر میں کس طرح اپنی جگہ بنانی تھی اور کس طرح اپنا قیام مضبوط کرنا تھا اس پہ بھی نظر ڈالنی تھی۔ سب سے بڑی بات جو باہر لوگوں کے ذہنوں میں اس کے متعلق عون کی من چاہی بیوی کا امیج بنا ہوا تھا۔ اسے آخری سانس تک برقرار رکھنا تھا۔ اور ماہ رو سرفراز کو ایک من چاہی، جان عزیز ہیپی اینڈ بی لوڈ (سہاگ بھری) بیوی کا سوانگ بھی بھرنا تھا۔ وہ عون کے اردگرد بسنے والوں کو بتادے گی۔ امیرزادیاں محبت کرتی اور نبھاتی ہیں، جوائنٹ فیملی کا حصہ بھی بن سکتی ہیں اور امیرزادیاں ہر رنگ میں، ہر سانچے میں بھی ڈھل سکتی ہیں اور جو لوگ آج باتیں بنا رہے تھے اور اس شادی کو "دوروزہ" شادی کا ٹائٹل دے رہے تھے ایک دن خود ہی اپنی زبانوں کو بند کرلیں گے۔ ماہ رو عون عباس سے عشق کرکے آئی تھی اور عشق نبھا کر رہے گی۔ چاہے کچھ بھی ہوجاتا۔ جند چلی جاتی یا جان نکل جاتی۔ اگر عون عباس قول کا پکا، نفرت میں سچا تھا تو ماہ رو بھی ضد میں پکی اور عشق میں سچی تھی۔



اور وہ ایک ہی رات کے بعد نئی ماہ رو کے روپ میں ڈھل کر منظر عام پہ آگئی تھی۔ یوں کہ اس کے کھلے کھلے حسین، شگفتہ اور دلفریب روپ کو دیکھ کر جو واقعی سمجھ رہے تھے کہ عون، ماہ رو کو طوفانی محبت سے بے

بس ہو کر اپنی شادی توڑ کے بیاہ لایا ہے۔ ان کے یقین پہ جیسے مہر لگ گئی تھی۔

"میں نا کہتی تھی۔ آج کل کے لڑکوں کا کیا بھروسا؟ گھر میں ماں باپ نے رشتہ پکا کیا اور وہ باہر آنکھیں لڑا آیا۔" کسی رشتے کی خالہ 'ماسی نے دوسری کے کان میں گھس کر دل کا "ساڑ" باہر نکالا تھا۔ دوسری والی دو من کی گردن ہلا کر رہ گئی تھی۔

"ارے ایسے دودھیا لشکارے مارتے حسن کے سامنے اپنی فریحہ کا دیا کیسے جل پڑتا۔ اس کی لو تو اس بجلیاں گراتے روپ سروپ کے سامنے ایک ہی پھونک میں بجھ گئی ہوگی۔" ایک اور ماسی نے بھی اپنا حصہ ڈالنا ضروری سمجھا۔

"دیکھو' فاخرہ بیٹے کی صفائیاں دیتی نہ تھک رہی تھی۔ میرا بچہ ایسا نہیں۔ نہ دل کا کچا ہے نہ قول کا۔ یہ بس تقدیر کا کوئی ہیر پھیر تھا جو سارا کچھ الٹ پلٹ گیا ہے۔" پہلی والی بے جمالو ٹائپ عورت نے عون کی امی کے لہجے کی نقل اتاری تھی۔

"ارے اس ہیرے کے سامنے کوئی تانبا کس طرح سے ٹھہرتا؟ عون کی تو سدھ بدھ بھلا دی ہوگی۔"

"اور دیکھو' لڑکی میں بھی حیا نہیں۔ گیلے بال کمر اور گلے میں ڈالے' دوپٹا ندارد۔۔۔ کیسے گھر میں گھوم رہی تھی۔" ایک آنٹی نے جیسے کلیجے پیٹ لیے تھے۔

"اتنی حیادار ہوتی تو اس انداز میں آتی؟ جانے اندر ہی اندر کیا معاملہ ہو؟ کیا خبر' عزت بچانے کے لیے یا چند ماہ بعد بنا شادی کے دادا دادی بننے کے خوف سے اسے اٹھا لائے ہوں۔" کسی ماسی نے ٹھٹھا لگایا تھا۔ باقی سب کو بھی اس بات میں بڑا ہی لطف آیا۔

"ٹکے گی نہیں۔۔۔ دیکھ لینا۔۔۔ عیاش امیرزادی ہے۔ آج اس ڈالی پہ تو کل کسی اور ڈالی پہ۔۔۔ رنگ رنگ کے مردوں کا سواد بڑا ہو تو گھر نہیں بنا کرتے۔" بی جمالو صاحبہ نے پھر سے گل افشانی کی تھی۔

"تم عون کو نہیں دیکھتی۔ کیا بیبا اور معصوم بنا کرتا تھا اور کرتوت شیطانوں سے بدتر۔۔۔ اپنے ہی چاچا کی عزت خاک آلود کر ڈالی۔ کیا بھروسا اس اولاد کا۔۔۔ پکڑ کے ماں باپ کو کسی قابل نہیں چھوڑا۔ منہ چھپاتے پھرتے ہیں بے چارے۔۔۔" کسی نے چھالیہ کتر کر پان بنایا۔ گلوری منہ میں ڈالی اور عزت داروں کی پگڑیوں میں تھوک دیا۔ "اور تم نے حاجی قیصر کی بیٹی کا سنا جو۔۔۔" اب نیا قصہ چھڑ گیا تھا۔ اس معاشرے کا یہی دستور تھا۔ یہی روش تھی اور اس معاشرے کے لوگ بھی یہی تھے۔ چار دن ایک قصے کو مرچ لگا کر دور دور تک اچھالتے پھر کسی نئی کہانی کے پیچھے چل نکلتے۔ نئے لوگ' نیا قصہ' نئی کہانی' نیا لطف' نیا مزہ۔۔۔ وقت گزاری کے نئے انداز۔۔۔ لیکن ایسے لوگ یہ تک نہیں جانتے تھے کہ جن لوگوں پہ یہ کیچڑ اچھالتے تھے ان پہ یہ سب بکواس کس کس انداز پہ اثر کرتی تھی؟ دیوان عام میں اسی کاؤچ پہ لیٹا عون زہرخند لہجے میں سوچتا رہا تھا کیونکہ وہ کسی کی زبان روکنے پہ قادر نہیں تھا اور نہ بندے بندے کو پکڑ کر اپنی صفائی دے سکتا تھا۔ وہ قسمت کی اس ستم ظریفی پر بس سلگ سکتا تھا۔



اس نے قد آدم آئینے میں اپنا ناقدانہ جائزہ لے کر خود پہ ایک بھرپور نگاہ ڈالی تھی۔ خوب صورت کاٹن کی امبرائیڈڈ شرٹ میں اس کی دودھیا رنگت بہت چمک رہی تھی۔ اس شرٹ کی سلیوز (آستینیں) برائے نام تھیں اور جو تھیں وہ انتہائی مہین تھیں چونکہ یہ ممی نے اس کی چوائس کو سامنے رکھ کر شاپنگ کی تھی سو سارے لباس ایسے تھے کچھ کی تو سلیوز سرے سے تھی ہی نہیں۔ کچھ فراکس تھے' کچھ میکسیاں اور کچھ اسکرٹس۔ ان میں ٹراؤزر اور ٹاپ بھی موجود تھے۔ وہ سلیکشن کے معاملے میں سوچتی رہ گئی تھی۔ اس گھر کے ماحول کو سامنے رکھ کر اسے بہت سمجھ سوچ کے ڈریسنگ کرنا ہوگی۔ امبرائیڈڈ ریڈ شرٹ کے ساتھ ریڈ ٹائٹس اور ریڈ ہی نفیس آرام دہ چپل پہن کر اس نے لمبے حسین ریشم ایسے بالوں کو کھلا چھوڑ دیا تھا۔ پھر کمرے میں نگاہ ڈالی۔۔۔ پورا کمرہ صاف شفاف اور چمک رہا تھا جانے کس نے صفائی کی تھی؟ جب وہ باتھ

لے رہی تھی تب ہی کوئی صفائی کر گیا تھا۔ ہاتھ لینے کے بعد جب وہ باہر نکلی تب ہی اس کی نگاہ صوفے پہ پڑی تھی۔ اس وقت ماہ رو کو صوفے پر عون سویا دکھائی دیا تھا۔ وہ کچھ حیران ہوئی تھی۔ شاید وہ فجر کے بعد آیا تھا اسے اس کی امی نے بھیجا تھا یا پھر خود ہی مہمانوں کا خیال کرکے واپس آگیا تھا۔ جو بھی وجہ تھی کم از کم ماہ رو کو اس کی موجودگی کچھ ڈھارس پہنچا گئی تھی۔ اسے کسی کی سوالیہ نظر کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

وہ اس وقت بڑے لاپروا انداز میں آڑھا ترچھا پڑا سو رہا تھا۔ چونکہ صوفہ بھی جہازی سائز تھا سو اسے سونے میں دشواری نہیں ہوئی تھی پھر بھی اس کا ایک پیر اور دایاں بازو نیچے لٹک رہا تھا۔ ماہ رو کے من میں نہ جانے کیا آئی تھی۔ وہ عون کے قریب آگئی۔ کچھ دیر وہ بے خیالی میں عون کے پاس کھڑی رہی۔ وہ اس کے خوب صورت تیکھے کھڑے کھڑے مغرور نقوش کو دیکھتی رہی۔ اور بہت کچھ سوچتی رہی۔ ماہ رو نے اپنی ہی سوچ کو جھٹکا دیا اور ذرا سا جھک کر نیچے ہوئی۔ اس کوشش میں ماہ رو کے سارے ریشمی بال دائیں کندھے سے ہوتے ہوئے عون کے منہ پر آگرے تھے۔ نیم گیلی مشک بار سی زلفوں کی ٹھنڈک اور خوشبو کی تاثیر نے عون کو آنکھیں کھولنے پہ مجبور کر دیا تھا اور وہ جو اس کا بازو پکڑ کر اوپر اٹھا رہی تھی لمحہ بھر کے لیے بوکھلا سی گئی۔ اسی بوکھلاہٹ میں وہ اچانک سیدھی ہوئی اور بازو تک ہوا میں چھوڑ دیا۔ جو کٹے ہوئے شہتیر کی طرح دوبارہ اپنی جگہ پہ پہنچ گیا تھا۔ پھر ایک جھٹکے کے ساتھ عون اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے حواس کچھ ٹھکانے آئے تو سارے تیر بھی کمان میں سیدھے کرلیے تھے۔ کچھ سنبھل کر وہ خجل سی ماہ رو سے طنزیہ انداز میں مخاطب ہوا۔

"رات کی تمام عزت افزائی بھول کر صبح سویرے ہی اداؤں کے تیشے تیز کرلیے تم نے۔ ظاہر ہے کوئی اور تو تم میں مجھے متاثر کرنے کے لیے خوبی ہے نہیں.... ایک حسن کا جال ضرور ہے جس میں پھانسنے کی کوشش میں ہر حد کو آزما ڈالو گی۔" ماہ رو اس کے کاٹ دار لفظوں کا ہر وار سہ کر کچھ خفیف سی ہوگئی تھی چونکہ رات کی نسبت وہ اتنا بھڑک نہیں رہا تھا۔ اس لیے ماہ رو کو کچھ ڈھارس سی ہوئی تھی۔

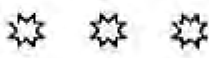
"تمہارا بازو لٹک رہا تھا.... میں تو آرام سے اوپر اٹھا کر....." ماہ رو نے صفائی دینی چاہی پر عون نے بیچ میں ہی اچک لیا تھا۔

"لٹک ہی رہا تھا.... کٹ تو نہیں گیا تھا۔ جو تم فرسٹ ایڈ دینے بھاگی بھاگی چلی آئی۔ اوپر سے اپنی زلفوں کو آزاد چھوڑ کر ان کا بھی جادو آزمانا چاہا...." وہ بھی کیسے کیسے فضول طنز کر رہا تھا۔ ماہ رو شرمندہ سی ہوگئی تھی۔ اسے شرمندہ دیکھ کر وہ بھی رہ نہیں سکا تھا۔

"عجیب حیرت کی بات ہے۔ لوگوں کو کسی بات پہ شرمندہ ہونا بھی آتا ہے۔" وہ بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتا کچھ لاپروائی سے بولا تھا۔ کل کی طرح آج صاحب بہادر زہر نہیں پھونک رہے تھے۔ شاید گرج برس کے بعد کچھ دیر تک مطلع صاف تھا۔ کسی بھی وقت غبار آلود ہونے کے امکانات تاہم ضرور تھے۔ پھر اسے ماہ رو کو سرتاپا دیکھنے کا بھی خیال آگیا اور دوسرے ہی لمحے مزاج یار کے موسمی حالات خراب ہوتے چلے گئے تھے۔ اس کی سوجی آنکھوں میں جو نیند کی کمی کا شکار لال بوٹی سی ہو رہی تھیں اس وقت ناگواری سے اور بھی لال ہوگئیں۔

"یہ تم نے کیا پہن رکھا ہے؟ کوئی شریفانہ لباس نہیں تھا؟ اور اس کی آستینیں کہاں ہیں؟ دوپٹا بھی نہیں۔ شیم آن یو۔ میرے گھر میں بزرگ مرد اور جوان بھائی موجود ہیں۔ مہمان بھی آجا رہے ہیں اور تم اشتہاری ماڈل بنی گھر کے اندر باہر گھومتی رہو گی.... تمہیں سارے رولز ریگولیشنز (اصول وضوابط) سکھانے پڑیں گے۔ آج ہی کان کھول کر سن لو۔ ایسے بے ہودہ کپڑوں میں گھر سے باہر جانا تو دور اس کمرے سے باہر بھی نہیں نکلو گی۔ ورنہ میں تمہارا حشر کردوں گا۔" وہ خاصا گرج کے ناگواری بھرے لہجے میں بولا تھا۔ ماہ رو لب بھینچ کر رہ گئی تھی۔ بھلا اسے کیا

جواب دیتی اس کے سارے ڈریسز ایسے ہی تھے۔
"اور جاؤ کوئی دوپٹا ای سے لے کر پہنو۔۔۔" وہ مزید بھی اس کی درگت بناتا' لیکن بیڈ روم کے دروازے سے آتا شور سن کر لب بھینچتا واش روم کی طرف بڑھ گیا تھا اور ماہ رو ایک مرتبہ پھر خود کو باور کروا رہی تھی کہ اسے عون سے محبت تھی اس کی خوبیوں یا کمزوریوں سے نہیں۔ اگر وہ اسے ٹوک رہا تھا۔ غصہ کر رہا تھا تو کرتا رہے۔ ماہ رو کو دل پہ نہیں لینا تھا۔ اور بس نہیں لینا تھا۔ اس نے سارے آنسو اندر ہی اندر پی لیے تھے۔ اور پھر بڑی بشاشت سے کھلے ڈور سے آتی ماہم کے گلے سے جا لگی تھی۔ ایک دم اس اجنبی ماحول میں کسی بہت اپنے کو پا کر اس کی کیا کیفیت تھی۔ وہ لفظوں میں بتا نہ پاتی۔ ماہم نے بھی چٹا چٹ اس کے رخسار چوم لیے تھے۔
"کہاں ہیں تمہارے سرتاج؟ اتنی کالز کی تھیں مگر صاحب بہادر نے فون نہیں اٹھایا۔ بتانا تھا کہ ناشتا کرنے کا تکلف مت فرمائیں۔ ہم ناشتا لے کر آ رہے تھے اور تم نے کچھ ٹھونس تو نہیں لیا؟" ماہم فل اسپیڈ سے بولتی بہت کھلکھلا رہی تھی۔
"سیل شاید سائلنٹ پہ تھا۔" ماہ رو کو بتانا پڑا۔
"اور تمہارا؟" اس نے خفگی سے پوچھا۔
"وہ کلچ (بٹوہ) میں۔" اس نے جان کر چہرے کا رخ موڑ لیا تھا تاکہ ماہم اس کے چہرے سے کچھ کھوج نہ لے۔ کچھ اخذ نہ کر لے۔
"اور دولہا بھائی؟" ماہم نے شرارتاً پوچھا۔
"باتھ روم میں۔" وہ سنجیدگی سے بولی تھی۔
"ویل' تم اپنے سرتاج کے ساتھ باہر آجاؤ۔ بڑے ہال میں تمہاری ساس ماں نے ناشتا چنوا دیا ہے۔ آج لائف میں پہلی مرتبہ دسترخوان پر بیٹھ کر ناشتا کرنا ہوگا۔ ہم سب کے معدے بھی خالی ہیں۔ دیر مت لگانا' جلدی آنا۔" ہنستی مسکراتی ماہم جلدی سے باہر نکل گئی تھی۔ تب اس نے جیسے کھل کر سانس لیا تھا۔ صد شکر کہ اس کا دھیان ماہ رو کے چہرے پر نہیں پڑا تھا۔ ورنہ وہ کتنی ہی وضاحتیں دیتی تب بھی ماہم کو مطمئن نہیں کر سکتی تھی۔ معاً" عون بھی باہر نکل آیا تھا۔ ماہ رو کو اسے ماہم کے متعلق نہیں بتانا پڑا تھا۔ کیونکہ ثنا خود آ کر اسے باہر آنے کا کہہ گئی تھی۔ ماہ رو کہتی تو شاید وہ مروت نبھانے کے لیے اور دنیا والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے بھی نہ جاتا۔ تاہم اپنی بھابھی کا احترام اس پر لازم تھا۔ وہ انکار نہیں کر سکا۔
ماہ رو بھی اس کے انتظار میں رکی ہوئی تھی۔ جب وہ بال بنا کر' پرفیوم اسپرے کرنے کے بعد باہر جانے لگا تب غیر ارادتاً" ماہ رو پہ نگاہ پڑی تو رک گیا۔ وہ خاصی تذبذب کا شکار کھڑی انگلیاں چٹخا رہی تھی۔
"آپ باہر چلیں گی یا کسی شاہی سواری" کو بلایا جائے؟" اس کا انداز کاٹ دار قسم کا طنزیہ تھا۔ ماہ رو جیسے کٹ کر رہ گئی تھی۔ پھر بھی اپنی جگہ سے ہلی نہیں۔
"تمہارے گمان میں ہوگا میں تمہارا ہاتھ پکڑوں اور شہزادی صاحبہ کو سج سج چلاتا باہر لے جاؤں۔ لیکن اس بھول میں نہ رہنا۔ اس گھر میں ایسے بے شرمانا رواج نہیں ہیں۔" وہ زہرخند ہوا اور اب کی دفعہ جھڑک کر بولا۔ "چلو"۔
"میرے پاس دوپٹا نہیں۔ تم اپنی امی سے لادو۔" بالآخر اس نے باہر نہ جانے کی وجہ بتا دی تھی۔ عون کی بھنویں تنی تھیں۔ پھر تھوڑا اچک کر نارمل ہوئیں۔ وہ اس کے تذبذب کو جان کر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ "ڈرامہ باز۔"



ہال کمرے میں لمبا سا دسترخوان دیکھ کر ماہ رو حیران رہ گئی تھی۔ یہاں سے وہاں تک لوازمات سجے تھے اور کھانے والے ندارد۔
"اتنے بڑے دسترخوان پر بس ہم چار لوگ۔" ماہ رو نے بے ساختہ ماہم کے کان میں گھس کر کہا تھا۔ پھر بھی اندر آتی ثنا نے اس کی بات سن لی تھی۔
"چار کیوں؟ ماشاء اللہ سے۔ ابھی پوری پلٹن

"آجاتی ہے۔ بے فکر رہو۔" ثنا کے کہنے کی دیر تھی۔ ناشتا لگنے کا طبل بجتے ہی گھر کے کونوں کھدروں سے ایک ایک فرد اور بچہ خود بخود نکل آیا تھا۔ کسی کو بھی جا کر بلانا نہیں پڑا تھا۔ مہمان بھی موجود تھے۔ میزبان بھی۔ تایا رحمان کے آتے ہی ماہ رو احتراماً" کھڑی ہو گئی تھی۔ یہ عون کے ابو تھے انہوں نے آگے بڑھ کر ماہ رو کے سر پر ہاتھ رکھا' پیار کیا اور مٹھی بھر پیسے بھی دیے۔ وہ پیسے لیتے ہوئے کچھ ہچکچا گئی تھی۔ تب مریم نے اس کا شانہ تھپکا۔ وہ بڑا سا انار کے جوس کا گلاس پکڑ کے گھونٹ گھونٹ پی رہی تھی۔

"بزرگوں کا تبرک اور پیسہ کبھی نہ چھوڑو۔ جتنا ملے ہڑپ کر جاؤ۔" مریم کی بات پہ قہقہہ پڑا تھا۔ اس کے چھوٹے دیور یاسر نے بات کو آگے بڑھایا۔

"ہماری بزرگ تو آپ ہیں بھابھی! ذرا اپنا چھوڑا تبرک مجھے بھی دیں۔ فریش انار کے جوس میں کیا ذائقہ ہوتا ہے؟ آج اس کا اندازہ تو کروں۔" وہ مریم کے ہاتھ سے گلاس پکڑ کر بولا تھا۔ وہ بے چاری ارے ارے کرتی رہ گئی تھی۔ یاسر نے ایک ہی سانس میں غٹاغٹ چڑھا لیا۔

"واہ۔ کیا لاجواب ٹیسٹ تھا۔ اسے کہتے ہیں خالص انار کا جوس۔" اس نے خالی گلاس ہوا میں لہرایا۔

"اور جو پہلے چڑھایا تھا وہ کیا تھا؟" عاشر نے اسے دھمو کا جڑا۔

"وہ۔" اس نے "وہ" کو لمبا سا کھینچ کے ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ "اس میں تو بھابھی نے چینی اور پانی ملا کر دیا تھا۔ یقین مانو' روزانہ ایسے ہی کرتی ہیں۔ خود خالص انار کا جوس پی پی کر انار دانار ہو چکی ہیں۔ ہمیں ملاوٹ شدہ دیتی ہیں۔ دیکھو' میری رنگت کیسی پھیکی پڑ گئی ہے۔" یاسر نے منہ لٹکا کر مریم پہ ایسا الزام رکھا کہ وہ تنک کر بول پڑی۔

"تم دیوروں سے یہی صلہ ملے گا' نا۔ پہلے ایک الزام دیتا تھا۔ بھابھی! مینگو شیک میں پانی ملا لائی ہو۔ آم کی جگہ کدو گرینڈ کر لاتی ہو۔ چائے میں دودھ کی جگہ میٹھا سوڈا ڈالا ہے۔ یا سرف کے جھاگ میں پتی ڈال کر ابال لائی ہو۔ اگر انڈا فرائی کر کے سامنے رکھوں تو کہتا۔ بیچ میں سے آدھا خود اڑا گئی ہو۔ صد شکر کہ اس کی تو بیوی آگئی۔ وہ جانے اور اس کا شوہر جانے۔ خود اٹھائے اپنے نخریلے شوہر کے نخرے۔ نہ کپڑا پسند کرتا ہے۔ نہ کھانا پکا ہوا۔ ہر چیز میں سو سو کیڑے۔" مریم تو خاصی تپی ہوئی بیٹھی تھی۔ لمحہ بھر میں شروع ہو گئی تھی معاً" عون بھی اپنی پکار سن کر آگیا تھا۔ ماہ رو کا دل اسے دیکھ کر دھڑک اٹھا تھا۔ اس نے بے ساختہ گردن گھمالی تھی۔

"مریم بھابھی! خاطر جمع رکھیں۔ دیور کے ساتھ اب دیورانی کے نخرے بھی اٹھائیں گی۔ ہماری بنو کو تو انڈا ابالنا بھی نہیں آتا۔ باقی کاموں کی فہرست تو پھاڑ ہی دیں۔ چائے کے نام پہ اسے چائے پینے کا پتا ہے۔ کھانے کے نام پہ کھانا کھانے کا پتا ہے۔ اگر کھانے کا کہیں گے تو وہ آپ کو کھا کر دکھا دے گی۔ پکوانے کی بات نہ کرنا۔" ماہم اپنی سہیلی کو مشکل میں گرفتار دیکھ کر میدان میں کود پڑی تھی۔ سعدیہ' ہما اور باقی سب نے بھی قہقہہ لگایا تھا۔ ماہم آتے ہوئے یونی ورسٹی فیلوز کو بھی لے آئی تھی۔ سمیرا' فرح اور عمارہ بھی تھیں۔ سو خوب رونق لگ گئی۔

"نکمے پن کے دعوے دارو' ہمیں ٹرینڈ کرنے کے سارے گر آتے ہیں۔" عون نے ماہم کو جواب دیتے ہوئے ماہ رو پہ صاف طنز کیا تھا۔ وہ سمجھ کر لب بھینچ گئی تھی۔

"شرط یہ ہے کہ سکھانے والے آپ ہوں۔" ماہم نے برجستہ کہا۔

"یہ تم مجھ پہ چھوڑ دو۔ ایسا سکھاؤں گا کہ عمر بھر بھلا نہ سکے گی۔" اس نے بظاہر مسکرا کر کہا تھا۔ لیکن ماہ رو کے دل پہ گھونسا پڑا۔ وہ محفل میں بھی کچوکے لگانے سے باز نہیں آرہا تھا۔

"میرا دوسرا راؤنڈ اس کی ٹریننگ کے بعد لگے گا۔ میں بھی تو دیکھوں گی۔ آپ کا دعوا کہاں تک ٹھیک ثابت ہوا۔" ماہم نے جیسے اسے چیلنجنگ انداز میں

چھیڑا تھا۔

"ہم قول کے کچے نہیں' جو کہتے ہیں کر دکھاتے ہیں۔ اپنی سہیلی سے پوچھ سکتی ہو۔" عون نے مسکرا کر کہا۔ گو کہ اس کی باتیں سب انجوائے کر رہے تھے لیکن ماہ رو تو جانتی تھی کہ وہ بات بہ بات طنز کر رہا ہے۔

"کل سے ہماری نئی بھابھی کی کلاسز شروع ہو جائیں گی۔" یاسر نے ٹکڑا لگایا۔

"دیکھتے ہیں' ڈیلی ٹیسٹ' ویکلی کوئز' منتھلی رپورٹس اور فائنل ٹرم میں ماہ رو کتنے کتنے مارکس لیتی ہے۔" ہما بھی ماہ رو کو چھیڑتے ہوئے بولی تھی۔

"بائی دا وے' اس ٹریننگ کی ڈیٹیلز (تفصیلات) بھی بتائی جائیں۔ پکوائی اور دھلائی سے لے کر کہاں تک اس کی لمٹ (حد) ہے؟" ماہم کو ہی اچانک اتنی اہم بات پوچھنے کا خیال آگیا تھا۔ کیونکہ اسے لگ رہا تھا۔ عون کچھ بھی مذاق میں نہیں کہہ رہا۔ وہ ہر بات ماہ رو کو لگا کے کر رہا تھا۔

"لامحدود۔" جواب بھی عون نے دیا۔ ماہم کو جیسے شاک لگا تھا۔ وہ ایک دم چلا اٹھی۔

"عون بھائی! خدا کا خوف کھائیں۔ آپ بیوی کو لے کر آئے ہیں یا ایک باورچن' دھوبن' سوئیپر اور وغیرہ وغیرہ کو۔؟"

"چونکہ میرا میتھ بہت اچھا ہے۔ اور میں جوڑ توڑ' حساب کتاب میں کمال رکھتا ہوں۔ سو سارے پہلوؤں پہ غور کر کے لایا ہوں۔ مجھے لگا تھا' تھوڑی ٹریننگ کے بعد یہ کک میڈ' سوئیپر کے عہدے تک پروموشن لے سکتی ہے۔" اس نے ایک مرتبہ پھر مسکراہٹ دبا کر کہا تھا۔ یوں کہ ہال کمرے میں چھت پھاڑ قسم کا قہقہہ لگا۔ جبکہ ماہ رو نے بڑی زخمی نگاہ سے اسے دیکھا تھا۔

"یہ نہ ہو حساب میں اچھا ہونے کے دعوے کرتے کرتے آپ کا اپنا حساب ہو کر کورٹ مارشل ہو جائے۔" ماہم نے بھی لطیف سا طنز کیا تھا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" اس کی کلف لگی گردن کچھ اور تن گئی تھی۔

"دوسروں میں تبدیلی لاتے لاتے آپ خود سرتاپا بدل گئے تو۔" سمیرا نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ اس کے لہجے میں واضح طنز تھا۔

"کبھی نہیں.... بدلتے تو وہ ہیں جنہیں اپنی کمزوریوں کو چھپانا ہوتا ہے۔ وہ تبدیلی میں خود کو چھپا کر محفوظ کر لیتے ہیں۔ تاکہ ان پہ کوئی انگلی نہ اٹھا سکے۔ تاکہ انہیں۔ ریجیکٹ نہ کر دیا جائے۔ یہ لوگ ریجیکشن سے ڈرنے کے لیے خود میں بدلاؤ لاتے ہیں۔" عون نے گہرے کاٹ دار لہجے میں ماہ رو پہ ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر کہا تھا۔ وہ امی کے کرینکل کریپ دوپٹے کو بمشکل سنبھالتی کچھ اپ سیٹ دکھائی دے رہی تھی۔ بار بار شانوں سے پھسلتا دوپٹا ٹھیک کرتی۔ دوپٹا لینے کی عادت جو نہیں تھی۔ عون کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"نیور مور۔" (کبھی نہیں) ماہم نے بے ساختہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "میں آپ سے ایگری (متفق) نہیں کرتی۔ یعنی اچھی تبدیلی کے عمل کو بھی آپ شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ بات ہضم نہیں ہو رہی۔" یہ ماہم کا ہی جگرا تھا جس نے عون سے منہ پر اختلاف کر لیا تھا۔ مریم اور ثنا ہنسنے لگی تھیں۔

"ان فیکٹ' (دراصل) تم میرے پوائنٹ آف ویو کو نہیں سمجھ رہیں۔ ہر تبدیلی میں فرق ہوتا۔ کوئی تبدیلی اپنے لیے ہوتی ہے اور کوئی دکھلاوے کے لیے۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ کچھ لوگ وقتی طور پہ خود کو تبدیل کر کے' خود کو دوسروں کی نظر میں



اچھا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ بہت بڑے ملمع ساز ہوتے ہیں۔" عون نے ایک مرتبہ پھر ماہ رو پہ اچٹتی سی نگاہ ڈالی تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ اس کی توجہ ان کی باتوں کی طرف نہیں تھی۔ خیالوں میں گم ہونے کی وجہ سے اس کا دوپٹا دونوں شانوں سے پھسل کر گود میں جاگرا تھا اور اسے خیال تک نہیں تھا۔ عون نے استہزائیہ انداز میں سر جھٹکا۔ درپردہ وہ ماہ رو کو ہائپوکرائٹ کا لقب دیتے ہوئے اس وقت خود بہت بڑا ملمع ساز لگ رہا تھا۔ جس نے اپنی شخصیت کو پرت در پرت چھپا رکھا تھا۔ جب دل چاہتا۔ موقع یا حالات کی مناسبت سے پرت اتار کر ویسا ہی خود ظاہر کرتا۔ جیسے وہ اندر باہر سے ایک ہو۔

"اینی وے، آپ سب کا شکریہ۔ چونکہ ولیمہ تو ہے نہیں۔ سو، پھر کبھی ملاقات ہوگی۔" وہ جینز جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ یوں کہ ماہم چائے پیتے ہوئے اسے رکنے کا اشارہ کرتی چیخ پڑی تھی۔

"کہاں چل دیے؟ رکیے ذرا، ہم ماہ رو کو لینے آئے ہیں۔" ماہم بھی کھڑی ہوتی۔ "اپنی مسٹریس (منظور نظر) کو ہمارے ساتھ بھیجیں۔" اس کی پکار پہ عون نے بے ساختہ رکتے ہوئے اک نظر ماہ رو کے خاموش سراپے پہ ڈالی تھی۔

"وہ کس خوشی میں؟" اس کا انداز طنزیہ تھا۔ وہ جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتا رک سا گیا۔ ماہ رو بھی بے چین ہوگئی تھی۔

"یہ دستور زمانہ ہے جناب! ان فیکٹ، ماہ رو کے ڈیڈی بھی اداس ہوگئے ہیں۔" ماہم نے مسکرا کر بتایا۔

"محض ایک ہی رات میں؟" عون کا انداز سابقہ ہی تھا۔ دھیما اور طنز بھرا۔

"وہ اس کے بغیر کبھی رہے نہیں نا۔" ماہم نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ عون نے لمحہ بھر کے لیے ہونٹ سکیڑ لیے تھے۔ پھر بھنویں اچکا کر بولا۔

"تو ماہ رو کے بغیر رہنے کی عادت ڈالیں اب۔ ایسے تو نہیں چلے گا۔ ہر بڑے تہوار پہ ملنے جایا کرے گی۔ ڈیڈی صاحب کو بتادینا۔" اس کا انداز اٹل سا تھا۔

"واٹ؟" ماہم ہکا بکا رہ گئی۔ "یہ تو فاؤل (غلط) ہے۔"

"یہ فاؤل نہیں، ہمارے گھر کا رواج ہے۔ یہاں کی بہوئیں ہر رواج اور اصول کو اپناتی ہیں۔ مریم اور ثنا سے پوچھ لو، یہ عید کے عید بھی نہیں جاتیں۔" اس نے مبالغے کی حد کردی تھی۔ ماہم کی چیخ و پکار پہ تائی کو مداخلت کرنا پڑی۔

"بکواس کر رہا ہے۔ کیوں نہیں جائے گی۔" انہوں نے عون کو ڈپٹ کر کہا۔ وہ لب بھینچ کر چپ ہوگیا تھا۔ پھر اس تاثر کو ختم کرتے ہوئے بولا۔

"آج تو امی کی سپورٹ مل گئی۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" وہ مسکراتے لہجے میں پوشیدہ وارننگ دیتے ہوئے باہر نکل گیا تھا۔ جبکہ ماہ رو بمشکل ہونٹ کاٹتی اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔ اسے عون نے باتوں باتوں میں اچھی طرح سے جتادیا تھا کہ اس کی مرضی کے بغیر آئے دن ڈیڈی سے ملاقاتوں والا سسٹم نہیں چلے گا۔ وہ بھرے دل کے ساتھ ماہم کو اپنے روم میں لے کر جارہی تھی۔ جب سمیرا کی اچانک آواز اس کے کان میں پڑی۔

"ماہا! آؤ ہم ذرا فریحہ سے مل لیں۔ اس بے چاری کے ساتھ جو ہوا برا ہوا۔ ہم تو پرسہ بھی نہیں دے سکے۔ یہ تو ماہم مجھے گھسیٹ لائی تھی۔ ورنہ میں تو کبھی نہ آتی۔ فریحہ کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے لیے۔ ویسے یار! لوگ بھی کیسے بخت آور ہوتے ہیں۔ جسے چاہتے ہیں پالیتے ہیں۔ چاہے کسی کی محبت ہو یا محبوب۔ ماہ رو نے تو دن دہاڑے فریحہ کے ارمانوں پر شب خون مارا اور ذرا بھی شرمندہ نہیں۔" اس کی یونی ورسٹی فیلو بڑے جلے کٹے لہجے میں ماہا سے مخاطب تھی۔ یوں کہ اندر کی طرف جاتے جاتے ماہ رو کے اوپر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

"فریحہ!" اس کے ہونٹ جیسے کپکپا اٹھے تھے۔ عون کے حوالے سے ایک بھولا ہوا قصہ اچانک یاد آگیا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)



نایاب جیلانی

دل لوٹے کے ہار اٹھا

چوتھی قسط

اس کے پیروں میں چکی کے پاٹ بندھ گئے تھے اور ایک ایک قدم اٹھانا محال ہو چکا تھا۔

ماہ رو نے گردن موڑ کر نہیں دیکھا تھا پھر بھی وہ جانتی تھی کہ اس کی نام نہاد سہیلیاں، بہت فرصت میں اس کی ذات کے بخیے ادھیڑ رہی تھیں۔ ایک ایک الجھے دھاگے کو زبردستی کھینچ کھینچ کر اسے تکلیف دے رہی تھیں۔

"اس کے پاس حسن اور دولت کا ہتھیار تھا سو فریحہ بے چاری نے شکست کو تسلیم کرنا ہی تھی۔۔۔ جانے اس کے دل پہ کیا گزری ہو گی؟" ہما نے افسردگی سے کہا۔

"پھر اتنی بڑی بدنامی کے بعد محبت حاصل کرنا، مرجانے کے برابر ہے۔ لیکن ایسے لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ عزت اور بے عزتی ان لوگوں کے لیے برابر ہے۔" ثمیرا تلخی سے بولی تھی۔

"دیکھا نہیں، مہارانی کو ذرا بھی شرمندگی نہیں۔۔۔ جیسے بڑی عزت آبرو اور شان کے ساتھ اس گھر میں لائی گئی ہے۔ میرے شوہر بتا رہے تھے۔ بڑی مجبوری کے عالم میں رحمان چچا کو اس عذاب کی وجہ سے لانا پڑا۔ ورنہ ان کی بدنامی تو دور دور تک ہو چکی تھی۔ لوگوں کے منہ بند کرنے کے لیے نکاح پڑھوایا تھا۔۔۔ ورنہ تو۔۔۔" اگلی بکواس اس نے نسبتاً" ہلکی آواز میں کی تھی پھر بھی ماہ رو کے کانوں میں گرم سیال گرتا چلا گیا تھا۔ اگر پہلی سی صورت حال ہوتی تو ماہ رو پلٹ کر ان سب کا منہ توڑ دیتی۔ لیکن اس وقت وہ ضبط اور برداشت کرنے پہ مجبور تھی۔ پھر وہ سب اٹھ کر فریحہ کے تکون کمرے کی طرف چلی گئی تھیں۔ اسے بھی مزید سلگانے، جلتی پہ تیل ڈالنے۔۔۔ کیونکہ اس دنیا کا یہی وطیرہ تھا۔

اور اگر فریحہ عقل مند ہوتی تو ان کی باتوں میں نہ آتی۔۔۔ اگر پہلے سے حالات ہوتے فریحہ تب بھی کسی کی بات میں نہ آتی۔ لیکن اس وقت وہ چوٹ کھائی ہوئی تھی۔ سو فریحہ کی عقل، سوچ اور فہم تو کب کی ختم ہو چکی تھی۔ سمجھنے کی ہر ہر صلاحیت مفلوج تھی۔ وہ بس وہی سنتی اور سمجھتی تھی جو لوگ اسے بتانا یا سمجھانا چاہتے تھے۔ اس لیے ایک نئی فریحہ جنم لے رہی تھی۔

ماہ رو ان سب کی بکواس کو بھاڑ میں جھونک کر سر جھٹکتی ہوئی اپنے روم میں آ گئی تھی، جہاں ماہم پہلے سے موجود تھی اس کنڈیشن میں کہ ماہ رو کو ایک اور مرحلے سے گزرنا پڑا تھا۔ وہ کب سے تنہائی کی منتظر تھی۔ ماہ رو کو اکیلا آتا دیکھ کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے اٹھ کر دروازہ بھی لاک کر دیا تھا۔ ماہ رو گہرا سانس کھینچ کر سمجھ گئی تھی۔ اس کی تمام تر اداکاری کو ماہم نے جان لیا تھا۔

کچھ دیر اس کا تفصیلی اپنی آنکھوں سے ایکسرے

کرنے کے بعد ماہم نے قریب آتے ہوئے کہا۔

"تم نے مجھے اپنا رونمائی کا گفٹ بھی نہیں دکھایا! وہ کوئی ایسی چھپا دینے والی چیز نہیں تھی جسے تم چھپا کر بیٹھی ہو۔" اس نے اپنا لہجہ حتی المقدور نرم رکھنے کی کوشش کی تھی۔ ماہ رو گہرا سانس بھر کر رہ گئی۔ وہ ساری دنیا کے سامنے خود پہ ملمع چڑھا کر ایکٹ کر سکتی تھی لیکن ماہم کے سامنے جھوٹی بشاشت کا رول پلے کرنا بہت کٹھن تھا۔ وہ بھی اس صورت میں جب ماہم بہت ساری چیزوں کو سمجھ رہی تھی۔ ماہ رو نے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔ پھر اس نے ڈریسنگ سے لوشن اٹھا کر چہرے پہ لگانا شروع کیا۔ کچھ دیر بعد ٹشو کی مدد سے کنسیلر کی تہ اتار کر اس کے بالمقابل آکھڑی ہوئی۔

"یہ میرے چہرے پہ خوب صورت پرنٹ اور ڈیزائن رونمائی کا خوب صورت گفٹ نہیں تو اور کیا ہے۔ ذرا غور فرما کر دیکھو اب دکھائی دیا نا۔" اس کے لہجے میں واضح کھنک اور بشاشت تھی یوں کہ ماہم کو شدید دھچکا لگا تھا۔ اس کی آنکھیں دور تک پھیلتی چلی گئیں۔ حیرانی، صدمہ، دکھ اور دھچکے کی ہر کیفیت ماہم کے چہرے پہ رقم تھی۔

"واٹ ربش کیا مذاق ہے ماہ رو!" وہ جھڑک کر بولی تھی۔ ماہ رو سابقہ انداز میں مسکراتی رہی۔۔۔ ماہم کے چہرے پہ پھیلے ہراس کو دیکھتی رہی۔۔۔ وہ جو ابھی تک



شاک کے عالم میں دنگ کھڑی تھی۔

"مذاق نہیں حقیقت ہے۔" ماہ رو نے لاپروائی سے بتایا۔ جیسے اپنے پھول سے رخساروں کو داغ دار کروا کر بڑی مطمئن اور سرشار تھی۔ گویا کوئی میڈل یا اعزاز ملا ہو۔

اس ماہ رو کو بھی کسی نے پھولوں کی چھڑی سے ٹچ نہیں کیا تھا کجا کہ اتنی بے دردی سے پیٹنا۔ وہ بھی شادی کی پہلی رات' اپنے دولہا کے ہاتھوں؟ ماہم کا دماغ جیسے بند ہونے لگا تھا۔

"عون نے یہ سب کیوں کیا؟ آخر کیوں؟ میں اسے پوچھتی ہوں۔ مزا چکھاتی ہوں۔" بہت دیر بعد سنبھل کر ماہم تنک اٹھی تھی۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ بس نہیں چل رہا تھا۔ اس مہذب وحشی کو تہس نہس کر دے۔

"ہرگز نہیں۔ تم کچھ نہیں کہو گی۔ نہ ڈیڈی کو بتاؤ گی۔ سمجھ لو' وہ حق بجانب تھا۔" ماہ رو نے انتہائی سرعت سے کہتے ہوئے زبردستی ماہم سے وعدہ لیا تھا۔

وہ شدید جھلاہٹ میں پھٹ پڑی۔

"تو کیا' اس وحشی کے ہاتھوں پٹتی رہو گی؟ اس کا دماغ ٹھکانے لگاؤ۔ اسے روکو' اس کے بڑھے ہاتھ کو کنٹرول کرنا تھا۔ آخر اس کی اتنی جرات کیسے ہوئی۔ اس نے تمہیں ہاتھ کیسے لگایا؟"

"میں تو خود اس تمام اپ سیٹ سچویشن پہ ابھی تک ورطہ حیرت میں ہوں۔ ایکچوئلی (دراصل) ہوا کچھ اس طرح سے تھا۔" ماہ رو لگے ہی لمحے دھیرے دھیرے ساری تفصیلات سے ماہم کو آگاہ کرتی رہی تھی۔ وہ ساری باتیں' فریحہ کی شادی کا قصہ' عون کے والد کا اس کے ساتھ شدید قسم کا جھگڑا' ناراضی (جو ابھی تک برقرار تھی) نفرت' حقارت اور ہر قسم کی چھوٹی اور بڑی بات' جو اس نے یہاں آکر سنی تھی۔ جس سے ماہم اور ماہ رو دونوں ہی بے خبر تھیں۔ ماہم کا منہ حیرت سے ایک مرتبہ پھر کھل گیا تھا۔ یہاں تو انکشاف در انکشاف ہو رہے تھے۔ اور انکشاف بھی خاصے گھناؤنے تھے جو فلموں اور ڈراموں میں اتفاقات کے طور پر سامنے آتے تھے۔ مگر حقیقی زندگی میں ان کا تصور بھی نہ تھا۔ لیکن جو کچھ ماہ رو کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ کسی فلم سے کم نہیں تھا۔

ماہم ہکا بکا سی تفصیلات سنتی ہونق بنی بیٹھی رہ گئی تھی۔ جو کچھ بھی ہوا تھا کسی ڈرامے سے کم نہیں تھا۔

اس سارے قصے میں اسے ماہ رو کا کہیں قصور نظر نہیں آ رہا تھا۔ سوائے ان فون کالز یا ملاقاتوں کے جو اس نے زبردستی عون کے ساتھ کی تھیں۔ باقی ہر معاملے میں ماہ رو بے قصور تھی۔ ہاں' فقط محبت کرنا اور محبت کا اظہار کرنا اگر جرم سمجھا جاتا تھا تو وہ اتنے سے فعل کے لیے مجرم ضرور تھی۔

اور اب جو ماہ رو کی زندگی میں محبت کی تکمیل کے بعد ڈرامائی موڑ آیا تھا۔ اس کو کیسے نبھانا تھا اور عون کی بے اعتنائی پلس بے زاری' نفرت کے بعد وہ اپنے لیے کیا فیصلہ کرنا چاہتی تھی؟ وہ عون کے ساتھ کس طرح سے گزارہ کر سکتی تھی؟ وہ بھی اس صورت میں جب عون سرے سے اسے ناپسند کرتا تھا اور دھتکار چکا تھا۔ اگر عون کی محبت اس کے ساتھ ہوتی تب بھی وہ اس ماحول اور سیٹ اپ میں ایڈجسٹ کر سکتی تھی۔ لیکن اب کیسے یہاں رہ پائے گی؟ اس گھر کا ماحول' یہاں کے لوگ' بودوباش' ان کا لائف اسٹائل سب کچھ الگ اور مختلف تھا۔ ماہ رو ایک آزاد دنیا کی باسی تھی جبکہ یہ لوگ ایک حد تک خوشحال اور آزادی کے قائل تھے۔ ان کی روایات' اصول' قواعد زندگی گزارنے کے ڈھب مکمل طور پر اور تھے۔

پھر عون بھی اپنے گھر والوں کی طرح روشن خیال نہیں تھا۔ یہ لوگ ایک حد تک آؤٹ موڈڈ (دقیانوسی) خیالات کے مالک تھے۔ پھر ماہ رو یہاں کیسے رہ سکتی تھی؟ اسے تو ابھی کے ابھی کوئی فیصلہ کر لینا چاہیے تھا۔ اور ماہم اس کے فیصلے کا انتظار کر رہی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی۔ اگر ماہ رو اتنی پرسکون ہے تو اس نے کوئی نہ کوئی فیصلہ کر لیا ہو گا۔ اور وہی اس کا اٹل فیصلہ ہو گا۔ جس سے دنیا کی کوئی طاقت اسے ہٹا نہیں سکتی تھی۔

"کیا تم یہیں رہو گی؟ ایسے حالات میں بھی؟" ماہم

اس کی خاموشی پہ بے چین ہو کر بول پڑی تھی۔ ماہ رو نے بھنویں اچکا کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔

"آف کورس (یقیناً)"۔

"اور عون کا رویہ؟ اس کی بدتمیزیاں' وحشیانہ پن' حیوانیت؟" ماہم کے منہ میں کونئے کڑک گئے تھے۔ دل چاہ رہا تھا۔ عون کا نام تک نہ لے۔ اس کا ذکر تک نہ کرے۔ کچھ ایسا ہی تاؤ اسے عون پہ چڑھ رہا تھا۔

"کیا تم ایسے آدمی کے ساتھ رہ سکتی ہو؟"

"وائے ناٹ (کیوں نہیں؟)۔" ماہ رو سنجیدہ ہوتی چلی گئی تھی۔ "میں نے اس سے محبت کی ہے تب یہ دیکھ کر محبت نہیں کی تھی وہ مہذب ہوگا یا غیر مہذب؟ اکھڑ ہوگا یا نرم؟ محبت کرے گا یا نفرت' ہر چیز سے بالاتر ہو کر میں نے اس سے محبت کی تھی۔ اب اتنی سی بات پہ اسے چھوڑ سکتی ہوں؟ کبھی نہیں۔" اس کا انداز دو ٹوک قسم کا تھا۔

"لیکن وہ تمہیں نہیں چاہتا۔ اس کی فریحہ سے شادی طے تھی۔ کیا پتا' وہ فریحہ سے محبت کرتا ہو۔ تم ایسے حالات میں فریحہ کے ساتھ ایک گھر میں کیسے رہو گی؟ ابھی تک تو فریحہ صدمے میں ہے۔ معمولات زندگی سے الگ تھلگ ہے۔ لیکن چند ہفتوں بعد جب وہ سنبھل جائے گی تو منظر عام پہ بھی آئے گی۔ تب تمہیں فریحہ کی موجودگی میں سروائیو کرنا بہت مشکل ہوگا۔ ابھی تم ان نزاکتوں کو نہیں سمجھ رہی۔" ماہم ایک اچھے دوست کی طرح اسے سمجھا رہی تھی۔

"میں فریحہ کے سامنے کیوں گلٹ فیل کروں گی۔ میں نے اس کے ساتھ کچھ نہیں کیا۔ جو بھی اس کے ساتھ کیا۔ اس کی تقدیر نے کیا۔ میرا کیا قصور ہے۔ گو کہ انسانیت کے ناطے میں اس کی تکلیف کو سمجھ سکتی ہوں۔ تاہم اس کی تکلیف کو کم کرنے کی اتھارٹی (اختیار) نہیں رکھتی۔" اس نے انتہائی گہرے لہجے میں اپنی بات مکمل کی تھی۔

"اور رہی عباس کی فریحہ کے ساتھ کسی سابقہ انگیج منٹ (لگاؤ) کی بات تو مجھے اس چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"لیکن وہ تم سے محبت بھی نہیں کرتا۔" ماہم کی سوئی بس یہیں کہیں اٹک سی گئی تھی۔ وہ اس نادانی کو کیسے سمجھاتی! عون کے ساتھ اس کی زندگی انتہائی کٹھن تھی۔ ایک اس کا سرد' اکھڑ' برفیلا رویہ' دوسری بے اعتنائی اور تیسرا اس کے گھر کا گھٹا گھٹا ماحول (جو ماہم کے نزدیک حبس زدہ تھا) ماہ رو کس کس مقام پہ کمپرومائز کر سکتی تھی؟ اس ماحول پہ' لوگوں پہ' رویوں پہ۔۔۔ یہاں تو پہلا "ایشو" (مسئلہ) اس کی ڈریسنگ پہ ہو سکتا تھا۔ ماہم سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ لوگ اسے من پسند کپڑے پہننے کی اجازت دے سکتے تھے۔

وہ کہاں کہاں اپنا من مار سکتی تھی؟

"ماہم! تمہیں کس طرح سے سمجھاؤں؟ ہم کسی کو اپنی مرضی سے چاہ تو سکتے ہیں۔ لیکن کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ نہیں کہہ سکتے۔ تم بھی مجھ سے محبت کرو۔" وہ جیسے تھک گئی تھی۔ زچ ہو گئی تھی۔ ماہم کو چپ ہونا پڑا۔ جیسے وہ سمجھ گئی تھی کہ ماہ رو کا کچھ بگاڑا نہیں جا سکتا۔ وہ ہر انتہا کو سوچ کر مطمئن تھی۔ اس کے اطمینان کو دیکھ کر ماہم نے گھٹی گھٹی سانس کو سینے کی قید سے باہر نکالا اور بولی۔

"تو گویا تم سب کچھ طے کر چکی ہو۔"

"آج سے نہیں۔۔۔ اس دن سے جب مجھے عباس سے محبت ہوئی تھی۔" اس نے ایک جذب کے ساتھ کہا تھا۔ وہ عون کو ہمیشہ عباس ہی کہا کرتی تھی اس کے اردگرد رہنے والے سب لوگ اسے عون کے نام سے بلاتے تھے۔ ایک واحد ماہ رو تھی جو اس کا سرنیم بلاتی۔ اسے عباس کتنا ہی اچھا لگتا تھا۔

"او کے' میری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ خدا کرے کہ عباس تمہاری محبت کی قدر کر سکے۔ کیونکہ ایسی بے لوث اور دیوانگی کی حدوں کو چھوتی محبتیں ہر روز نہیں ملا کرتیں۔" ماہم نے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا۔ ماہ رو دھیمے انداز میں مسکرا دی تھی۔

"ایک چیز تو ہے ماہ رو!" اب وہ ماحول کی کثافت ختم کرنے کی غرض سے ہلکا پھلکا انداز اپنا رہی تھی۔

"وتمہیں اس جلاد کے سامنے بہت ہمبل (متحمل مزاج) ہونا پڑے گا۔ خاصا مشکل سا الجبرے کا سوال ہے۔" وہ عون کے متعلق اپنی رائے دے رہی تھی کہ اسے سمجھنا اتنا آسان نہیں۔ بہت کٹھن سا گورکھ دھندا تھا۔

"میں اپنے اسٹیمنا (قوت برداشت) کو آخری حد تک آزما ڈالوں گی۔ ماہ رو سرفراز ہوں ... بزنس ٹائیکون کی بیٹی ... وہ حساب دان ہے تو جمع' ضرب' تقسیم سے ہم بھی مبرا نہیں ... سیر اور سوا سیر کی خوب رہے گی۔" ماہ رو بھی اتنے بہت سے غبار زدہ کثیف ماحول میں ہنسی کی پھوار گراتے ہوئے پہلے سے کچھ اطمینان محسوس کر رہی تھی۔

"ویسے تمہاری عقل کے بھی کیا کہنا۔ بندہ محبت کرے تو سوچ سمجھ کے۔ ایسے ہارڈ "ان سول" (سخت دل) بندے سے محبت کر کے عمر بھر ڈپریشن میں رہنے سے بہتر ہے کنوارا ہی مرا جائے۔" ماہم اپنا پرس سنبھالتی کھڑی ہو گئی تھی۔ ماہ رو نے بھی تنقیدی نگاہ سے خود کو آئینے میں دیکھا۔ آخر فریش تو لگنا چاہیے تھا۔ کیونکہ شازمہ کی کلاس سے گزر کر اپنے روم میں جانا تھا۔

ماہم دیوار پہ لگی عون کی شاندار انلارج سائز فوٹو کو دیکھنے کے لیے رک گئی تھی۔

یہ یونی ورسٹی کے کنووکیشن کی فوٹو تھی۔ ڈگری لیے ہوئے' گلے میں گولڈ میڈل پہنے' نیچے بلیک گاؤن اور خوب صورت کیپ ... وہ بہت خوب صورت' زندگی سے بھرپور اور عالی شان لگ رہا تھا۔ کالی آنکھوں سے مسکراتا ہوا۔ ہونٹوں پہ فتح مندی کی مسکراہٹ تھی۔ جیسے سب کچھ پا لیا ہو۔ ماہم نے دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہا۔

"دکان دار کا بیٹا لگتا نہیں۔" اس کا تبصرہ بھی بے ساختہ تھا۔ دو ٹوک اور حتمی ... ماہ رو بھی رک سی گئی۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے ہاتھ بڑھا کر تصویر اتار لی تھی۔

"تم نہ سہی' تمہاری فوٹو ہی سہی ... ایسے تو تم اپنا دیدار کرنے نہیں دیتے۔ چلو یونہی سہی۔" اس نے ماہم کو آنکھ دبا کر چھیڑا تھا۔ وہ اس کے شانے پہ دھموکا جڑ کر باہر نکل گئی تھی۔ ماہ رو نے بھی سانسوں کے کرنکل کے دوپٹے سے خود کو آزاد کیا اور ماہم کے پیچھے نکل گئی تھی کیونکہ عون کی امی نے اسے گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔



بیڈ روم میں فل میوزک بج رہا تھا۔

گلاس ونڈوز پہ پردے گرے تھے۔ روم کا ماحول نیم روشن تھا۔ جبکہ ماہ رو جب سے آئی تھی نیند میں دھت پڑی تھی۔ ماہم اسے دس مرتبہ زبردستی اٹھا کر گئی تھی۔ جیسے ہی وہ نظر سے اوجھل ہوتی' ماہ رو دوبارہ نیند کی وادیوں میں گم ہو جاتی ... یوں لگ رہا تھا۔ پورے سال کی نیند پوری کر کے ہی جائے گی۔

ویسے بھی ماہ رو کو میوزک کے بغیر نیند نہیں آتی تھی۔ فل والیوم میں میوزک بجتا اور ماہ رو دوسرے ہی لمحے میں نیند کے سفر پہ نکل جاتی۔

ڈیڈی سے مل کر چیخ کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے وہ ایسی سوئی کہ پھر شام کی خبر لائی تھی۔ بالآخر ماہم نے ٹھنڈے برف پانی والا مشہور زمانہ حربہ آزمایا تو ماہ رو بی بی نے جھٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔ تاہم نیند کا گلابی پن ابھی تک آنکھوں کی جھیلوں میں موجزن تھا۔

"دی مارننگ بریز (نسیم سحر) ..." اس نے لمبی سی جماہی کو بمشکل روکا تھا۔ شاید وہ سمجھ رہی تھی کہ نئی سویر طلوع ہو چکی ہے ... ماہم نے ناک بھوں چڑھا کر اس کو جتا کے بتایا تھا۔

"نسیم سحر نہیں ... نسیم شام ہو چکی ہے ... اب شہزادی معظمہ اٹھ جائیے ... انکل جائیے پہ انتظار کر رہے ہیں۔" اس نے زبردستی ماہ رو کو گھسیٹ کر اٹھایا تھا۔

"اور یہ لباس فاخرہ بھی بدل لیجیے۔ اب آپ شادی شدہ خاتون ہیں ... کوئی پونی ٹیل لہراتی بچی نہیں۔ کسی بھی وقت آپ کے سسرال والے تشریف لے آئیں

گے۔" اس نے ماہ رو کی مہین نازک ناٹی پہ گہری چوٹ کی تھی۔

"انہوں نے آپ کو اس شاہانہ ڈریس میں دیکھ لیا تو مارے حیا کے ایسے جائیں گے کہ دوبارہ آنا نصیب نہیں ہوگا۔" وہ ناٹی کی کھلی ڈوریوں گریبان اور اس کے لاپروا انداز پہ گھرک رہی تھی۔ گو کہ پہلی ایسی کوئی قدغن نہیں تھی۔ وہ جیسے مرضی اپنے گھر میں گھومتی یا باہر۔ لیکن اب سچویشن (صورت حال) الگ تھی۔ کسی بھی وقت اس کے سسرالی عزیزوں میں سے کوئی لینے آسکتا تھا۔ اسے ان کے آنے تک مہذب ڈریسنگ میں دکھائی دینا چاہیے۔ سو اسی لیے وہ جھڑک رہی تھی۔ لیکن ماہ رو پہ اثر ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تبھی ماہم دیوار کی طرف دیکھ کر بولی۔

"اور کچھ حیا کے ناخن لو۔۔۔ اب تو عون صاحب بھی تمہیں گھور رہے ہیں۔" ماہم نے عون کی چوری شدہ فوٹو کی سمت اشارہ کیا تھا جسے ماہ رو سسرال سے آتے ہوئے اپنی ہینڈ کیری میں چھپا کر لے آئی تھی۔ عون کے نام پر وہ اسپرنگ کی طرح اچھلی۔

"کہاں ہے عون عباس!" ماہ رو نے گھبرا کر پورے روم پہ طائرانہ نگاہ ڈالی تھی۔ اس کی نظریں پھر ماہم کے تعاقب میں دیوار پہ جم گئی تھیں۔ وہ ایک مرتبہ پھر بیڈ پہ اوندھے منہ ڈھے گئی تھی۔

"مائی گاڈ! تم نے تو ڈرا دیا۔"

"ابھی سے یہ حشر ہے۔" ماہم نے دوبارہ طنز اچھالا۔

"وہ تمہارا شوہر ہے کوئی جن نہیں۔"

"شوہر نام کی مخلوق کسی جنات سے کم بھی نہیں۔" ماہ رو نے فلسفہ جھاڑا تھا۔ یعنی ایک ہی رات کے بعد فلاسفر!

"جیسے تمہیں تو بڑے شوہروں کے تجربے ہیں۔" ماہم نے پھر سے طنز کیا۔ وہ ٹھنڈی سی آہ بھر کے رہ گئی تھی۔

"بس ایک ہی تجربہ کافی ہے۔"

"یعنی ابھی سے ہی۔۔۔؟" ماہم کی آنکھیں پھیلی تھیں۔ تب ماہ رو کو سنبھلنا پڑا تھا۔ اس نے گھور کر ماہم کو جواب دیا۔

"جب تمہارا شوہر ہوگا تو پوچھوں گی۔"

"میں تو بھر آئی جب تم جیسی حسین لڑکی سہاگ رات میں کھٹنوں کی رونمائی لے سکتی ہے تو ہمارے جیسے عام چہروں کی کیا حالت ہوگی؟" ماہم نے جیسے جھر جھری لے کر خود کو عام ثابت کرنے میں ایڑھی چوٹی کو زور لگایا تھا۔

"نصیب چہرے اور شکلیں دیکھ کر نہیں بنائے جاتے۔ خدا نہ کرے تم میری جیسی سچویشن سے گزرو۔" ماہ رو نے بڑے جذب سے کہا تھا۔ اس کے چہرے پہ ایک اذیت سی چھا گئی تھی۔ گزشتہ بہت سے منظر آنکھوں میں کرچیاں بھرنے لگے تھے۔ اس نے آنکھوں کو رگڑ کر ماہم سے نظر چرائی۔

"میں تو کہتی ہوں۔ تم عون کو مزہ چکھاتیں۔" ماہ رو کی شکستگی نے اسے پھر سے عون پہ تاؤ چڑھا دیا تھا۔

"کیسے؟" وہ بھونچکی ہوئی۔

"اس سے ناراض ہو کر۔" اپنے تئیں ماہم نے بڑا باکمال باور فل مشورہ دیا تھا۔ ماہ رو اپنا سر پکڑ کے رہ گئی تھی۔

"مطلب میں اس کے گھر نہ جاؤں۔"

"ہاں۔" اس نے ٹھونک بجا کر کہا۔

"اگر وہ مجھے منانے ہی نہ آیا تو؟" ماہ رو نے دوسرے پہلو کا احساس دلایا تھا ماہم کا منہ سوجھ گیا۔

"تم نیگیٹو ہی سوچنا۔۔۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ وہ کچے دھاگے سے بندھا بھاگا بھاگا چلا آئے۔" اس نے چڑتے ہوئے اسے ایک دھپ لگائی تھی۔

"نہ اس کے پاس کچے دھاگے ہیں۔ نہ وہ خود اتنا کچا پکا ہے۔ جتنا میں نے اسے چند گھنٹوں میں جانا۔۔۔ وہ۔۔۔" ماہ رو کے اگلے الفاظ منہ میں ہی دبے رہ گئے تھے۔ کیونکہ ماہم نے بیچ میں ہی اسے ٹوک دیا تھا۔

"وہ انتہائی وحشی ہے، ضدی ہے، غیر مہذب ہے۔" ماہم نے ناک چڑھا کر اس کی ساری خوبیوں کو گنوا دیا تھا۔ اب ماہ رو اسے ساری داستان سنا دینے پہ

سخت پچھتا رہی تھی۔ کیونکہ ماہم نے اچھا بھلا عون کے خلاف محاذ کھول لیا تھا۔ اب یہ ماہ رو کی ہی ذمہ داری تھی وہ کس طرح سے اپنی دوست کے ذہن سے عون کے متعلق جالوں کو ہٹاتی۔ اس کی بدگمانی دور کرتی۔ اور اس کا دل صاف کرتی۔

کچھ سوچ کر ماہ رو نے پینترا بدل لیا تھا۔ اب وہ عون کی جھوٹی تعریفوں کے پل باندھنے کی کوشش میں تھی۔ گو کہ ماہم ایسی نہیں تھی جو ماہ رو کی ذاتی زندگی کو جگہ جگہ موضوع بحث لاتی۔ نہ حالات زندگی کے متعلق لوگوں کو بتا کر گوسپ کے لطف دوبالا کرتی۔ وہ اس کی مخلص اور اچھی دوست تھی۔ اور ماہ رو کی محبت میں ہی عون کے خلاف ہو چکی تھی۔

جو کچھ عون اور فریحہ کے ساتھ ہوا تھا۔ یا ان دونوں کے خاندانوں کے ساتھ ہوا تھا وہ اپر کلاس کی ان دو لڑکیوں کے لیے ایک معمولی سی غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

ان دو خاندانوں کی زندگی میں بھونچال آ گیا تھا۔ رشتے ' ناطے اور رویے بدل گئے تھے۔ دلوں میں دوریاں آ گئی تھیں اور یہ لوگ سمجھتی تھیں کہ ذرا سی غلط فہمی ہی تو ہے جسے دور بھی کیا جا سکتا تھا۔

"اینکچوئیلی ماہم! عباس بہت نائس ہے۔ بہت کول ہے۔ یو نو (تم جانتی ہو) وہ مجھ سے پیار بھی بہت کرتا تھا۔ تمہیں بتایا تو ہے اس کے ذہن میں کچھ ابہام تھے۔ جیسے ہی سب کچھ معمول پہ آیا۔ دیکھنا' عباس بھی پہلے سا لوونگ اینڈ کیئرنگ (محبت اور خیال کرنے والا) ہو جائے گا۔" ماہ رو نے مڈل کلاس اچھی بیویوں کی طرح پہلی مرتبہ ایک خوب صورت ملمع سازی کے تحت سب اچھے کا سگنل دینا شروع کر دیا تھا۔ وہ ساری جھوٹی تعریفیں اسے ازبر کرنا تھیں جو مڈل وومینز (متوسط طبقے کی عورتیں) رات کو شوہروں سے کٹ لگوا کر صبح پڑوسنوں' دیورانیوں' ساسوں وغیرہ کو ہنس ہنس کر بتاتیں۔

"میرے فلاں تو بہت اچھے ہیں۔۔۔ ہر مہینے شاپنگ کے لیے دس دس ہزار دیتے ہیں۔ گھمانے پھرانے کے وعدے الگ۔" چھوں کے نیل چھپا کر دانت نکالنا کتنا مشکل ترین کام ہو گا۔ وہ تو آسکر ڈیزرو کرتی تھیں (حق دار تھیں) بے چاریاں۔۔۔ ماہ رو کو اپنا آپ بھی انہی مڈل وومینز کی کیٹگری میں محسوس ہو رہا تھا۔ اور ادھر ماہم بھی کچھ کچھ اس کے جھوٹ پہ مطمئن ہو رہی تھی۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔۔۔ اور تم ہمیشہ ہنستی مسکراتی' ہنگامہ پرور رہو۔" ماہم نے سچے دل سے دعا دی تھی۔ ماہ رو نے دل ہی دل میں آمین کہا۔ اور اسی لباس فاخرہ کے ساتھ سیڑھیاں اترتی لاؤنج میں آ گئی تھی جہاں ڈیڈی شدت سے اس کے منتظر تھے۔



"مائی لارڈ!" ماہ رو نے ڈیڈی کی کھلی بانہوں میں سماتے ہوئے دلکشی سے جھک کر کورنش بجا لایا تھا۔ ڈیڈی اسے پیار کرتے ماتھا چومتے مسکرا کر ویلکم کہہ رہے تھے۔ گو کہ وہ چند ہی گھنٹوں بعد دوبارہ آ گئی تھی پھر بھی یوں لگ رہا تھا جیسے سالوں بعد ماہ رو کی صورت دکھائی دی ہے۔

جس طرح اچانک' بہت تکلیف دہ حالات کا سامنا کرتے ہوئے اچانک نکاح کرنا پڑا تھا۔ وہ سب سیٹھ سرفراز کے لیے اتنا سہل نہیں تھا۔ لیکن اس وقت حالات کچھ ایسے تھے کہ مزید تاخیر کرنا خسارے کے مترادف تھا۔ انہوں نے شازمہ کے سمجھانے بجھانے' قائل کرنے پہ ذہنی طور پر اس سچویشن کو قبول کر لیا تھا۔

کیونکہ شازمہ نے انہیں واشگاف لفظوں میں بتا دیا تھا کہ ماہ رو کے ہوسپٹلائز ہونے کا پس منظر کیا ہے؟ اور وہ اپنے انجان پن پہ سخت پر ملال بھی تھے اگر ماہ رو عام حالات میں بھی اپنی پسند سے آگاہ کر دیتی تب بھی وہ کوئی آؤٹ موڈ باپ ہرگز نہیں تھے۔ جو بیٹی کی خوشی کے رستوں میں رکاوٹ بن جاتے۔

ماہ رو ایک اچھی' من پسند خوش حال زندگی گزارے۔ یہی تو ان کی خواہش تھی۔

وجہ کہ رحمان صاحب کے اور ان کے اسٹیٹس میں بہت فرق تھا لیکن سرفراز احمد نے کبھی بھی اسٹیٹس کو ایشو بنانے کی کوشش نہیں کی تھی۔"

انہیں ماہ رو کی پسند دل و جان سے پسند آچکی تھی ۔۔۔ داماد خوب صورت بھی تھا۔ ایجوکیٹڈ (تعلیم یافتہ) بھی۔ خاندانی بھی۔۔۔ اور خاصے خوش حال لوگ بھی تھے۔ نہ بھی ہوتے تب بھی سیٹھ سرفراز اپنے داماد کو ضرور سپورٹ کرتے۔ اس وقت بھی وہ ماہ رو سے چھوٹی چھوٹی ہر بات پوچھ کر مطمئن ہونے کے بعد اچانک عون کے مستقبل پر بات کرنے لگے تھے۔

"ماہی! عون کے نیکسٹ (آئندہ) کیا ارادے ہیں؟ کیا وہ اپنا خاندانی کام ہی کرتا رہے گا؟" ماہ رو جو چائے سے لطف اندوز ہوتی آسمان پہ تیرتے بادلوں کو دیکھ رہی تھی لحہ بھر کے لیے چونک گئی۔

"سوری ڈیڈی! آپ نے کیا کہا؟" وہ سن کر بھی ایسے انجان ہوئی کہ ڈیڈی کو اپنی بات دہرانا پڑی تھی۔

"میں عون کے فیوچر کی بات کر رہا ہوں۔۔۔ بہت لائق لڑکا ہے۔ فیوچر بہت برائٹ (روشن) ہوگا۔ اگر وہ اپنے باپ کی دکان داری سے نکل آئے۔"

"آئی ڈونٹ نو (مجھے نہیں معلوم) ڈیڈی! میری اس سے ایسے کسی ٹاپک (موضوع) پہ بات نہیں ہوئی۔" ماہ رو کو یہی مناسب جواب سوجھا تھا۔ ڈیڈی لحہ بھر کے لیے سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ ان کے ماتھے پہ ہلکی سی سوچ کی پرچھائی تھی۔

"تم عون سے ڈسکس (بات) کرو۔ وہ ہماری کمپنی میں کام کرے ۔۔۔ میں اس کے شیئرز بھی دیکھ سکتا ہوں۔" کافی دیر بعد وہ بڑی ملائمت سے بولے تھے۔ یقینی طور پر وہ اپنی بیٹی کے فیوچر کو تابناک کرنا چاہتے تھے۔ بیٹی کا فیوچر اپنے شوہر کے ساتھ وابستہ تھا۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ عون جلد از جلد ان کے بزنس میں آجائے۔

"آئی تھنک (میرے خیال میں) ڈیڈی! وہ نہیں مانے گا۔" ماہ رو نے ڈیڈی کو آسرے میں رکھنے کے بجائے صاف صاف بتا دیا تھا۔ کیونکہ جس خوددار فیملی سے اس کا تعلق تھا اور جتنا وہ ناک والا تھا۔ کبھی سسر کی بیساکھیوں کا سہارا نہ لیتا۔ سو اس نے دو ٹوک ڈیڈی کو بتا دیا تھا تاکہ وہ امیدیں قائم نہ رکھیں۔

"میری کون سی بہت اولاد ہے۔ ایک بس تم اور ایک تم، میرے بعد بھی تو تم لوگوں کو بزنس میں آنا ہوگا۔ تو ابھی میری موجودگی میں سیکھو تاکہ بعد میں تم لوگوں کو پریشانی نہ ہو۔" ڈیڈی نے سنجیدگی سے ماہ رو کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا تب اس نے حامی تو بھرلی تھی لیکن جذباتی انداز میں خفگی سے بولی۔

"آپ ہمیشہ جئیں ڈیڈی! آپ کے بغیر ہم کچھ نہیں ہیں اور سنی۔" ماہ رو کی بے ساختہ آنکھیں بھر آئی تھیں۔ آج کل وہ ویسے بھی خاصی زود رنج ہو رہی تھی۔ بات بہ بات رونا آجاتا تھا۔ آنسو گر پڑتے تھے۔ جنہیں وہ بڑی مہارت سے صاف کر لیتی تھی۔ چھپا لیتی تھی۔ جیسے اس وقت چھپا لیے تھے۔ ماہ رو کو عون کی محبت نے کیا کچھ نہیں سکھا دیا تھا۔

"میری جان۔" ڈیڈی نے اسے پیار کیا اور کسی ضروری کال پہ اٹھ کر چلے گئے تھے۔ تب وہ اور شازمہ اکیلی رہ گئی تھیں۔ ماہ رو جو اپنی سوچوں میں گم تھی شازمہ کے بلانے پہ کچھ چونک گئی۔

"سویٹ ہارٹ! یو لک پریٹی ان پنک نائٹی (تم اس گلابی نائٹی میں بہت خوب صورت لگ رہی ہو) ۔۔۔ وہاں اپنی سسرال میں جا کر کم از کم اپنی ڈریسنگ پہ کمپرومائز (سمجھوتہ) نہ کرنا۔۔۔ ان کے رنگ میں خود کو رنگنے کی بجائے کوشش کرنا کہ اپنے رنگ نہ اتر جائیں ۔۔۔ تم بہت خوب صورت ہو۔ اپنی خوب صورتی کو شوہر سے کیش کراؤ۔ اسے اداؤں میں جکڑو۔ اسے کسی اور سمت مت جانے دو۔ اب دیکھو، اسے تمہارے ساتھ آنا چاہیے تھا مگر نہیں آیا کیا تم نے فورس (مجبور) نہیں کیا؟" شازمہ کچھ دیر پہلے سے لے کر اب تک اسے آبزرو کر رہی تھی۔ اسے ماہ رو پہلے کی طرح شوخ یا چنچل نہیں لگی تھی۔ شاید وہ بھی تھکن کا شکار تھی۔ ماہ رو نے شازمہ کی تمام باتیں سن لی تھیں۔ لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔

"تمہیں کچھ ٹائم لگے گا۔ پھر تم ایڈجسٹ کر جاؤ گی..... میں تمہاری نیچر کو جانتی ہوں۔ تم تبدیلی کو جلدی ایکسیپٹ (قبول) کر لیتی ہو۔" شازمہ نے ملائمت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ تب ماہ رو حیران رہ گئی تھی۔ کیا شازمہ کی آبزرویشن ٹھیک تھی؟ اس نے کب ماہ رو کو فرصت میں جانچنے کی کوشش کی تھی؟ اور واقعی ہی شازمہ نے ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔

ماہ رو تمام تر نخرے ' بے نیازی اور نخوت کے باوجود تبدیلی کو جلدی قبول کر لیتی تھی۔ اور ہر بری یا ڈینجرس سچویشن کو وقتی طور پر نہ سہی تاہم کچھ ہی دیر بعد ذہنی طور پر قبول کر لیتی تھی۔ شاید اسی لیے بھی اس نے عون کے برے رویے کو بھی زیادہ دل پہ نہیں لیا تھا۔ وہ ذہنی طور پر خاصی مضبوط تھی۔ اور برے سے برے حالات میں بھی گھبراتی نہیں تھی۔ کچھ ہی دیر میں وقتی طور پر حواس باختگی کے بعد سچویشن کنٹرول میں کر لیتی تھی۔

"مجھے اندازہ تھا وہ اچھے خاندانی لوگ ہیں۔ تمہیں کسی بھی گزری بات سے ٹارچر نہیں کریں گے۔ تھینک گاڈ (شکر اللہ کا) میرا اندازہ غلط نہیں ہوا..... وہ لوگ اچھے ہیں بٹ (لیکن) تم اتنی ست اور پریشان کیوں دکھائی دے رہی ہو؟" شازمہ نے خاصے تفکر کا مظاہرہ کیا تھا۔ اب ماہم کے بعد شازمہ کی ایکسرے مشین جیسی نظروں کا سامنا کرنا تھا۔ اوف.....

"ایسے ہی ممی! ٹھیک تو ہوں۔" اس نے زبردستی خود کو بشاش کیا تھا۔ شازمہ مطمئن ہوئی یا نہیں تاہم چپ ضرور کر گئی تھی یا شاید کچھ سوچ رہی تھی۔ کافی دیر بعد اس نے کچھ کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

"ماہی! ان سب کا بی ہیویئر (رویہ) تو اچھا ہے نا؟" اس کے انداز میں کھوج کے ساتھ ہلکی سی پریشانی بھی تھی۔ جانے کیوں؟ ماہ رو اس پریشانی کو کچھ سمجھی نہیں تھی۔ اور کم از کم ماہ رو کے لیے اس کی پریشانی کی وجہ سمجھ میں آ بھی نہیں سکتی تھی۔

"سب اچھے ہیں۔" ماہ رو نے مختصر سی تسلی کروا دی تھی۔ تب شازمہ کے چہرے سے تفکر کی وہ ہلکی لہر غائب سی ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پہ بشاشت آ گئی۔

"ویٹس گڈ (یہ اچھا ہے)۔" اس نے مسکراہٹ کو خوب لمبا سا کھینچا تھا۔ پھر قدرے مطمئن کرنے والے انداز میں بولی۔

"ویل..... تمہاری اس ان ایکسپیکٹڈ میرج (غیر متوقع شادی) نے مجھے تو مینٹلی ڈسٹرب (ذہنی پریشانی میں) رکھا۔ تھینک گاڈ ' سب کچھ اچھا رہا۔" شازمہ کے تشکر کی وجہ ماہ رو کو سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ خوش بھی ہوتی تھی تو اپنے ہی انداز میں۔ شکریہ بھی ادا کرتی تو اپنے ہی ڈھنگ سے خاصا مزے دار مزاج رکھتی تھی۔ ماہ رو کو خوامخواہ ہنسی آ گئی۔

"دیکھ لو میری گڈ انٹینشن (اچھی نیت) تمہارے کام آ گئی۔" اب وہ اپنی نیک اندیشی پہ سارا کریڈٹ لینا چاہتی تھی۔ یعنی کرنا ورنا کچھ بھی نہیں۔ بس سارا اعزاز خود سمیٹ لینا ہے۔ ماہ رو اس کی خوش فہمی پہ بمشکل مسکراہٹ چھپا سکی۔

"اور کسی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ گڈ مینجمنٹ سے ہیونگ آ گڈ اینڈ کا ٹاسک ملتا ہے۔" شازمہ کا تفخر قابل دید تھا۔ جانے اب کون سی ایسی نیک تدبیر کر چکی تھی جس کا بہترین نیک انجام اسے غرور کرنے پہ مجبور کر رہا تھا۔ اور وہ سینہ پھلا پھلا کر خوش ہو رہی تھی۔

"اور یہ عون بھی خاصا پراوڈ (مغرور) لگتا ہے۔ دیکھو ذرا ' ایک کال بھی نہیں کی۔" شازمہ کو اچانک خیال آ گیا تھا۔ ماہ رو بھی چونک گئی۔ اب تو یا ہر رات ہو رہی تھی۔ پورے بنگلے کی لائٹس آن تھیں۔ ٹائم بھی بہت گزر چکا تھا۔ اس نے بے ارادہ ہی ٹائم پیس کی طرف دیکھا تھا۔ گھڑی کی سوئیاں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ وہ فطری طور پہ متفکر ہوئی۔

"ماہم تو کہہ رہی تھی۔ وہ لوگ لینے کے لیے آئیں گے۔" اس نے متفکر انداز میں پوچھا اور یہ ماہم بھی جانے کہاں تھی؟ ابھی تک نیچے نہیں آئی تھی۔ ماہ رو کے دل کو جیسے پتنگے لگ گئے تھے۔ کیونکہ گھڑی نو بجا رہی تھی۔ رحمان منزل سے ابھی تک کوئی نہیں آیا تھا۔ وہ بے قرار سی ہو گئی۔ ان کے نہ پہنچنے کا مطلب کیا

تھا۔

"عون کی مدر نے کال کی تو تھی۔ اور یہ بھی کہا تھا عون کو بھیجیں گی۔ اس لیے کہ میں بھی ریلیکس تھی کہ عون آجائے۔ اکٹھے ڈنر کریں گے۔ لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا۔ کیا میں کال بیک کروں؟" شازمہ بولتے ہوئے کارڈلیس اٹھانے لگی تھی جب ماہ رو نے سرعت سے اسے روک دیا تھا۔

"اگر عون کی امی نے کہا تھا تو پھر عون ضرور آجائے گا۔ وہ اپنی ماں سے بہت باؤنڈ ریلیٹڈ ہے۔" ماہ رو کا دل اچانک مطمئن ہو گیا تھا۔ جو کچھ دیر پہلے والی بے قراری تھی۔ اس کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ شازمہ نے اس کی گفتگو کے آخری حصے کو اچک لیا۔

"اور تمہارے لیے بھی کائنڈ اینڈ پولائٹ (مہربان اور نرم) ہے؟" اس کا انداز اب بھی کچھ متفکر تھا۔

"آف کورس۔" ماہ رو نے جیسے جان چھڑوائی تھی۔ ورنہ شازمہ تو کسی بھی طور مطمئن نہیں ہو رہی تھی۔ مخصوص سگی اماؤں والے سوال کر رہی تھی۔ جو اسے بالکل سوٹ نہیں کرتے تھے۔ ابھی شازمہ اس بات پہ بھی کوئی کمنٹ دیتی لیکن حواس باختہ سی ماہم کو دیکھ کر چپ ہو گئی تھی اور ادھر ماہم اسے اسی لباس فاخرہ میں دیکھ کر پھٹ پڑی تھی۔

"وہ تمہارا راحت جاں ڈرائنگ روم میں پہنچ چکا ہے اور تم الو کا ودی۔۔۔ ابھی تک سر جھاڑ منہ پھاڑ بیٹھی ہو۔ جبکہ راحت جاں صاحب تیز گام پہ سوار ہیں۔ ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں رک رہا۔ ہزار منت کی ہے لیکن ایک ہی جواب۔ اس کے پاس وقت نہیں ہے۔" ماہم نے اس کی خوب کھنچائی کرتے ہوئے باہر دھکیلا تھا۔

"اور تم کہاں مری ہوئی تھیں؟" ماہ رو کو بھی ماہم پہ غصہ کرنے کا خیال آگیا تھا۔

"میں مہارانی جی کے لیے کچھ ڈھنگ کی معقول شاپنگ کرنے گئی تھی۔ وہاں پہننے کے لیے کچھ ڈریسز اور اسٹول وغیرہ لائی ہوں۔" ماہم نے اسے گھرک کر بتایا۔

"اب ٹائم ویسٹ (ضائع) نہ کرو۔" وہ اسے اوپر بھیجنا چاہتی تھی جب کریم حواس باختہ بھاگا بھاگا اندر آیا تھا۔

"وہ صاحب تو جا رہے ہیں۔ کہتے ہیں جس نے آنا ہو خود آجائے۔ میں نہیں رک سکتا۔ صاحب کا موڈ بھی آف تھا۔" کریم نے ان سب کے اور بھی حواس اڑا دیے تھے۔ اب اوپر چینج کرنے کے لیے جانے کا بھی ٹائم نہیں تھا۔ ماہم نے اس کا سامان تو پہلے ہی گاڑی میں رکھوا دیا تھا۔ اب اسے دھکا دے کر باہر کی طرف دھکیل رہی تھی۔

"مرو ایسے ہی جاؤ اور بے عزتی کرواؤ۔ وہ چلا گیا تو آئے گا نہیں دوبارہ۔ اب بھی لگ رہا تھا۔ اماں نے کنپٹی پہ پستول رکھ کے بھیجا تھا۔ وہ بھی اس کے نہیں اپنے۔" ماہم پیچھے شعلہ فشانی کر رہی تھی۔ ماہ رو ننگے پیر ڈرائیو وے پہ بھاگنے لگی۔ پیچھے شازمہ کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ اسے الگ ڈنر کا رونا پڑا تھا۔ اتنا اہتمام کیا اور عون ایسے ہی چلا گیا۔ ماہ رو نے بھاگتے بھاگتے وہ "ممی! ماہم کو کھلا دیں۔ یہ تین بندوں کا اضافی کھانا کھا سکتی ہے۔" کہا اور گیٹ سے باہر نکل گئی۔ جبکہ باقی لوگ کریم سمیت وہیں جم کر رہ گئے تھے۔



گیٹ سے باہر ہی وائٹ کرولا کھڑی تھی۔ بلکہ کھڑی کہاں تھی اسٹارٹ تھی اور جانے ہی والی تھی۔ ماہ رو نے موقع اور وقت گنوائے بغیر سرپٹ دوڑ لگا دی تھی۔ پھر دوسرے ہی لمحے وہ بریک ہوتی کرولا کا فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گئی۔ بالکل اچانک اور زبردستی۔

عون کو اس افتاد کی توقع نہیں تھی۔ وہ اسے طوفان کی طرح آتا اور گاڑی میں گھستا دیکھ کر پہلے تو اچنبھے کا شکار ہوا تھا پھر اسے فرنٹ سیٹ کی بیک سے ٹیک لگا کر لمبے لمبے سانس لیتا دیکھ کر چونک گیا۔

اس کا چہرہ بھاگ دوڑ کی وجہ سے بلا کا سرخ تھا۔ بال بکھر کر منہ اور گردن سے چپک رہے تھے۔ کچھ گلے اور پشت پہ بے ترتیب جھول رہے تھے۔

سب سے بڑی بات اس کا حلیہ انتہائی معیوب قسم کا تھا۔

مہین سی نائٹی جس کی ساری ڈوریاں کھلی اور بے ترتیب تھیں۔ آستینوں سرے سے ندارد تھیں۔ پیروں میں ہلکی سی چپل پہنے وہ کسی بھی طور رحمان منزل لے جانے کے قابل نہیں تھی۔ اس وقت بڑے ہال میں سارے موجود تھے۔ ابو ای اس کے سارے بھائی بڑے اور چھوٹے بھابیاں۔ بس چاچا چاچی۔۔۔

اور یہ اس انتہائی بے ہودہ شب خوابی کے لباس میں ساس سسر جوان جیٹھ دیوروں کے سامنے جائے گی؟ مائی فٹ واٹ ربش اسے تو شرم ہی نہیں تھی۔ چھو کے بھی نہیں گزری تھی۔

عون کا دل چاہ رہا تھا ایک اور طمانچہ رکھ کے ماہ رو کی بوتھی پہ مارے۔ بڑی مشکل سے اپنے ابلتے طیش کو دبا کر وہ فرنٹ ڈور کھولتا ہوا نیچے اترا تھا پھر دوسری طرف گھوم کر آیا۔ دروازہ کھولا اور دھیمی آواز میں غراتا ہوا بولا۔

"جاؤ اور جا کے معقول حلیے میں واپس آؤ۔" اس نے بڑے ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے اٹھتے ہاتھ کو روک لیا تھا۔ وہ اس کے گھر میں کوئی تماشا نہیں لگانا چاہتا تھا۔ ایک مرتبہ پہلے وہ ایسا مظاہرہ کر چکا تھا جس کا خمیازہ ابھی تک بھگتنا پڑ رہا تھا۔

اسے وہ وقت بھی یاد آگیا۔ جو بھولا ہی نہیں تھا۔۔۔ محض تین دن پہلے۔۔۔ وہ اسی گھر میں ماہ رو کو طمانچہ مار کے گیا تھا۔ اپنے تئیں اس طمانچے میں اسے ہمیشہ کے لیے دھتکار کے گیا تھا۔ لیکن اسے یہ خبر نہیں تھی۔ اس طمانچے کی گونج کے اثر میں ماہ رو ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی کا وبال بن جائے گی۔ وہ اگر جان جاتا کہ اس گھر میں آنا کیسی قیامت لائے گا۔ تو وہ کبھی بھول کر بھی نہ آتا۔ اس رستے کی طرف بھی نہ دیکھتا۔ لیکن ہونی کو بھلا کون روک سکتا ہے۔ ماہ رو کے جانے اور واپس آنے میں سات منٹ خاموشی سے کھسک گئے تھے۔

اب کہ وہ کچھ معقول دکھائی دے رہی تھی۔ بلیک شرٹ بلیک تنگ سے ٹائٹس بلیک ہیل اور گلے میں بھی کچھ رسی نما دوپٹے کی خانہ پری کے لیے لٹکا رکھا تھا۔

وہ ایک اچٹتی نگاہ میں جائزہ لے کر کچھ مطمئن ہوا تھا۔ ماہ رو بھی اس کے تاثرات بھانپ گئی تھی۔ یعنی عون کے غصے کا گراف کچھ کم ہوا تھا۔ وہ پر سکون سی ہو گئی تھی۔

وائٹ کرولا کا اندرونی ماحول کچھ کثیف سا تھا۔ سکوت اور نرالا سکوت۔ ماہ رو بھی ونڈو سے باہر کے مناظر دیکھتی رہی تھی۔ گو کہ ان میں کچھ کشش تو نہیں تھی پھر ٹائم تو پاس کرنا ہی تھا۔ وہ بھی لب بھینچے اپنے دھیان میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ماہ رو بھی لامتناہی سوچوں میں گم تھی۔

"جانے گھر والوں کے رویے کیسے ہوں گے؟ اور فریحہ؟"

وہ بے چین سی پہلو بدل کر پھر سے باہر جھانکنے لگی۔

معاً سگنل پہ گاڑی رکی تھی۔ "صاحب! گجرے لو نا۔۔۔ بی بی کے لیے لو نا۔۔۔ دیکھو اصلی موتیا اور گلاب ہیں۔ دیکھو باجی کا دل بھی ہے۔" بچے کی دہائیاں عروج پہ تھیں۔ نجانے وہ باجی کے دل تک کیسے پہنچ گیا تھا۔ کیونکہ واقعی ہی باجی کا دل للچا رہا تھا۔

"صاحب!" اس نے وھپ وھپ شیشہ بجایا۔۔۔ "دیکھو باجی کا دل۔۔۔" معاً صاحب کو غصہ آگیا۔ اس نے گاڑی کا شیشہ کھسکا کر نیچے کیا تھا۔ پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر سو روپے نکالے تھے اور وہ سو روپے بچے کی جیب میں گھسا دیے۔

"چل شاباش جا اب۔۔۔ اور دوبارہ باجی کے دل تک مت جانا۔ وڈا ہارٹ اسپیشلسٹ تے ویکھو۔" عون نے شیشہ چڑھایا اور گاڑی آگے بڑھا گیا۔ جبکہ وہ بچہ چیختا ہوا پیچھے بھاگا تھا۔

"ارے صاحب! باجی کے پھول تو لیے نہیں۔" وہ چلاتا ہوا بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ ادھر بچے کی باجی کے چہرے پہ افسردگی چھا گئی تھی۔ آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔

کیا تھا اگر دل رکھنے کے لیے ہی ایک پھولوں کا گجرا لے لیتا۔ وہ زیادہ دیر اپنے جذبات پہ قابو نہیں رکھ سکی تھی۔ اس نے گجرا نہ ملنے کی جلن باہر نکال لی تھی۔

"وہ پھول کیا کاٹ رہے تھے؟ جو پیسے پکڑا کر بھی لیے نہیں۔" ماہ رو نے بڑی یاسیت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ایسی حسرت لہجے میں کرلا رہی تھی جس کا کوئی انت نہیں تھا۔

"وہ بچہ بھی جان گیا تھا کہ میرا دل پھولوں کے لیے مچل رہا ہے۔" ماہ رو نے بھاری آواز میں جتادیا۔ عون اس کی آواز کے بھاری پن پہ ذرا چونک کر سیدھا ہوا۔ پھر اس نے سر کو خفیف سا جھٹکا دیا تھا۔

"پھر دل ــــ؟" اس نے گہرے کٹ دار لب و لہجے میں غرا کر کہا۔ "اس دل کی میرے سامنے بات مت کرو۔ بہت آوارہ مزاج 'خود غرض دل ہے۔" وہ جیسے پھٹ پڑا تھا۔ ماہ رو کی آنکھیں شرقاً غرباً تک پھیل گئی تھیں۔

"کس کا دل؟" اس نے ہونق پن کی انتہا کردی تھی۔ "کیا میرا آوارہ مزاج 'خود غرض دل!" وہ بری طرح سے روہانسی ہو گئی تھی۔

"نہیں میرا۔" وہ خونخوار ہوا۔

"اچھا 'پھر ٹھیک ہے۔" ماہ رو کو تسلی ہو گئی تھی۔ لیکن پھول نہ لینے کا غم تازہ بہ تازہ تھا۔ "پورا گجرا نہ لیتے ایک گلاب ہی لے لیتے۔" وائٹ کرولا جب رحمان منزل کی اونچی سہ منزلہ عمارت کے قریب رکی تب بھی اس نے اترتے ہوئے حسرت زدہ لہجے میں کہا تھا "نہ گھر میں کھانا کھانے دیا اور نہ پھول لینے دیے۔"

"اپنے کمرے کی کھڑکی ہاتھ بڑھا کر کھول کے دیکھنا ـــ وہاں چنبیلی اور موتیے کی ایک نہیں ایک ہزار کلیاں مل جائیں گی۔ میرا میٹر گھمایا تو کسی نرسری میں پھینک آؤں گا۔ رات بھر پھول سونگھتی اور توڑتی رہنا ــــ اور رہی کھانے کی بات تو باورچی خانے میں ہر چیز میسر ہے جو دل چاہے کھانا اور پکانا۔ کیونکہ میں نے اپنا کچن الگ کرلیا ہے۔" عون نے کرولا سے اترتے ہوئے ایسا نور دار دھماکا کیا تھا کہ ماہ رو گجرے 'پھول' کلیوں کے سارے غم بھول کر جیسے چلا اٹھی تھی۔

"واٹ؟"



یہ انکشاف خاصا بھیانک اور دھچکا پہنچا دینے والا تھا۔

عون نے کل رات کوئی مذاق نہیں کیا تھا۔ حقیقی معنی میں اسے ڈیڈی کے گھر سے واپس لے کر آنے سے چار گھنٹے پہلے عون نے اپنے گھر والوں اور خصوصاً" ابو سے جھگڑا کر کے اپنا کچن الگ کروالیا تھا۔

محض شادی کے دوسرے ہی روز۔ جو لوگ عون کے تیور اور باپ بیٹے کے جھگڑے کو جانتے نہیں تھے۔ وہ تو انگلیاں منہ میں دبا کر ماہ رو کو برا بھلا کہنے لگے۔

"دیکھا نا ـــ آتے ہی الگ کروالیا۔ یہ امیرزادی کبھی بھائیوں کو اکٹھا نہیں رہنے دے گی۔ آج کچن الگ ہوا 'کل کو دیکھنا آگے آگے ہوتا کیا ہے۔" غرض جتنے منہ تھے اتنی باتیں تھیں۔ ہر منہ میں ماہ رو کے لیے برے الفاظ تھے۔ وہ تو پہلے بھی کچھ لوگوں کی نگاہ میں بری تھی۔ اب مزید بری ہو چکی تھی۔ بلکہ عون کی جلد بازی نے ماہ رو کو سب کی نظر میں برا ثابت کردیا تھا۔

اور یہ بھی ماہ رو کو بہت جلد پتا چل گیا تھا کہ کچن الگ کرنے میں عون کا کیا فائدہ نکلتا تھا؟ محض ماہ رو کو ستانے 'تنگ کرنے 'ذلیل کرنے اور انتقام لینے کے لیے اس نے پلاننگ بنائی تھی۔

اور صحیح معنوں میں اس کی انتقامی کارروائی کا آغاز اسی رات کو ہو گیا تھا۔ اس نے ماہ رو کے لیے سزا اور انتقام کے بڑے الگ منفرد اور جدا جدا طریقے سوچ رکھے تھے۔

کیونکہ اس نے پر تشدد انتقام کو ایک طرف رکھ کر دوسرا داؤ آزمایا تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ ماہ رو عون کے ساتھ نباہ نہ کرسکے۔ وہ ناک تک اسے عاجز کرے گا' اسے ذلیل کرے گا۔ ستائے گا اور وہ خود حالات کی

سختیوں سے تنگ آکر عون کو چھوڑ دے گی۔ اس گھر سے چلی جائے گی۔ یا پھر اپنا گناہ تسلیم کرلے گی۔

یوں عون کی برات کا اعلان ہو گا۔ وہ اپنے ماں باپ کی نگاہ میں سرخرو ہو جائے گا۔ اپنے خاندان والوں کی نظر میں اعتبار پالے گا۔

اس رات عون نے ماہ رو کو کمرے بلا کر دو کھلے راستے اس کے سامنے رکھے تھے۔

"تمہارے لیے شاید یہ مذاق ہی ہو۔ تمہارے نزدیک شاید یہ کوئی بڑی بات نہ ہو۔ مگر میرے لیے یہ انتہائی شرمناک الزام ہے۔۔۔ اس الزام کی وجہ سے میری زندگی کا چین سکون داؤ پہ لگ گیا ہے۔ میرے خاندان والے مجھے دیکھ کر راستہ بدل لیتے ہیں۔ میں اچھوت سمجھا جانے لگا ہوں۔ ہر ایک مجھ پہ نفرین بھیج رہا ہے۔ مجھے ملامت کی جاتی ہے۔ اور پلازہ میں جو حصہ میرے کنٹرول میں تھا وہاں اچانک گاہکی تک ختم ہو چکی ہے۔ ٹرانسیکشن کے لیے وہاں کوئی آتا ہی نہیں۔۔۔ اس لیے کہ مجھ پر کئی طرح کے گھٹیا الزامات لگ چکے ہیں۔ لوگ مجھ سے سلام لینا اور کلام کرنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ میں تم سے دوٹوک بات کرتا ہوں۔ بہت لمبی چوڑی حکایت میں نہیں پڑتا۔ نہ اس گورکھ دھندے کو مزید الجھاتا ہوں۔ تمہارے سامنے چند راستے ہیں۔ بڑے صاف واضح اور کھلے۔ نمبر ایک، تم کل کا سورج طلوع ہونے سے پہلے اس گھر کو چھوڑ دو۔ میں تمہیں آرام سے طلاق بھیج دوں گا۔ کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں ہو گی۔ کوئی سوال نہیں اٹھے گا۔ جس خاموشی سے نکاح ہوا تھا اسی خاموشی سے طلاق ہو جائے گی۔ نمبر دو، تم میرے باپ کے سامنے اقرار کرو۔ جیسا اقرار میرے سامنے کیا تھا۔ تم میرے باپ کو بتاؤ حقیقت کیا تھی، اور میں تمہارے پیچھے نہیں پڑا تھا۔ میں نے تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا تھا۔ میں تمہارے گھر کسی بری نیت سے نہیں گیا تھا۔ میں نے تمہیں اغوا کرنا نہیں چاہا تھا۔ اگر تم ان کے سامنے اقرار کرو گی تو وہ یقینی طور پر اتنی جلدی تسلیم نہیں کریں گے۔ وہ مجھ پہ ہی الزام رکھیں گے کہ میں نے تم پر دباؤ ڈال کر یہ سب اگلوایا اور کروایا ہے۔ لیکن میرا گلٹ تو دور ہو سکتا ہے۔۔۔ گو کہ پورا نہیں مگر کچھ کچھ تو۔

دوسرے تم میرے باپ کو یہ بھی کہو گی۔ تم نے مجھے نکاح پہ مجبور کیا۔ تم نے فریحہ کی زندگی برباد کی۔ تم میرے پیچھے اندھا دھند پڑی تھی اور تم نے سارے الزامات اپنے سر لیتے ہیں جو مجھ پر لگائے گئے تھے۔

اور تم میرے باپ کے سامنے خود اعلانیہ طور پر مجھ سے طلاق کا مطالبہ کرو گی۔ مجھ پہ کسی بھی قسم کا الزام لگائے بغیر۔ تم کہو گی کہ میرے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ تم طلاق لینا چاہتی ہو۔ اور بغیر دباؤ کے طلاق کا مطالبہ کرتی ہو۔ میرے باپ کو یہ بھی یقین دلانا تمہارا کام ہے کہ میں نے تمہیں طلاق کے لیے مجبور نہیں کیا۔ اور تم اپنی مرضی سے اس گھر کو چھوڑ کے جانا چاہتی ہو۔

آخری آپشن سب سے زیادہ تکلیف دہ، اذیت ناک، کٹھن اور دشوار ہے۔

اگر تم پہلے سب آپشنز کو ریجیکٹ (مسترد) کرتی ہو تو پھر لازمی طور پر تمہیں میرے ساتھ زندگی گزارنا ہو گی اور میرے لیے تو کچھ نہیں۔۔۔ تمہارے لیے میرے ساتھ زندگی گزارنا موت سے بڑھ کر تکلیف دہ اور کرب انگیز ہو گا۔ میں تمہاری زندگی کو انتہا، عذاب ناک بنا دوں گا۔ میں تمہیں ترسا ترسا کے ماروں گا۔ میں تمہیں قید تنہائی کی ماردوں گا۔ تم گھٹ گھٹ کر مرجاؤ گی۔ میری سختیوں، اذیتوں اور تکلیفوں کو جو تمہارے عمل کے بدلے میں تمہیں دوں گا برداشت نہیں کر سکو گی۔۔۔ سہ نہیں پاؤ گی۔

میں اپنے تئیں ظلم کے ہر حربے کو آزماؤں گا جو کہ ظلم تو نہیں ہو گا اولے کا بدلہ ضرور ہو گا۔ اور سب سے بڑی خوف ناک، بھیانک اور کسی حد تک شرم ناک بات۔

میرا تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ نہ ذہنی، نہ روحانی، نہ جسمانی۔۔۔ میں تمہیں ہمیشہ اس حق سے محروم رکھوں گا جو دراصل میری حقیقی بیوی کا جائز شرعی حق ہو گا۔ کیونکہ نہ تو میں زبردستی کے کن

پوائنٹ پہ ہونے والے نکاح کو جائز نکاح مانتا ہوں۔ نہ زبردستی بنا دینے والی بیوی کو بیوی تسلیم کرتا ہوں۔۔۔ میں کل کروں یا ایک سال بعد شادی ضرور کرلوں گا طلاق تمہیں اسی وقت مل سکتی ہے جب تم خود اس کا مطالبہ کرو گی کیونکہ میں اپنے باپ کی وجہ سے اس معاملے میں بے بس ہوں۔

تم ساری زندگی سہاگ رکھتے ہوئے بیوگی کی زندگی گزارو گی۔۔۔ اور یہ تمہاری اپنی چوائس ہوگی۔ ورنہ میں نے تمہارے سامنے سارے آپشن کھول کر بیان کردیے ہیں۔

اگر تم مندرجہ بالا آپشنز کو ریجیکٹ کر کے میرے ساتھ کالا پانی میں قیدیوں سی زندگی گزارنا چاہتی ہو تو بہت شوق اور خوشی کے ساتھ۔ کل صبح تک اپنے کاروبار سلطنت کو سنبھال لینا۔۔۔ اپنا کھانا تمہیں خود پکانا ہوگا۔ اپنا اور میرا بھی کپڑے دھونے' استری کرنے تمہارے ذمے۔ اپنے حصے کی صفائی بھی کرو گی۔۔۔ اور ہر قسم کی گھریلو ذمہ داریاں اٹھاؤ گی جو ایک عورت کی شادی کے بعد ذمہ داری میں شامل ہوتا ہے۔

اور آخری بات اپنے باپ کے گھر والی تمام عیاشیوں کو بھول جاؤ۔ میرے گھر میں میرے اسٹائل (انداز) سے رہو گی۔ میری انکم (تنخواہ) میں گزارا کرو گی۔ اس سب کے باوجود اگر تمہیں پھر بھی مجھ سے محبت کرنا ہو تو بڑے شوق اور چاؤ کے ساتھ۔ امید کرتا ہوں جلد از جلد عشق کا بھوت اتر جائے گا۔" عون نے دھڑا دھڑ اس کے سر پہ ضربیں لگا کر ایک ایک دماغ کی چول کو کھول دیا تھا۔

اول تو وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔ پھر اس کی ایک ایک بات کو سمجھتی اور تولتی رہی۔ وہ بہت سنجیدہ تھا اور قطعاً" مذاق کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ ماہ رو سے مذاق کر بھی کیسے سکتا تھا؟ ان کے درمیان ایسا کوئی رشتہ جو نہیں تھا۔

اس نے عون کی ایک ایک بات کو سوچا تھا۔ ہر انداز سے پرکھا تھا۔ گو کہ وہ نہ بھی پرکھتی تب بھی ایک فیصلہ تو اس نے بہت پہلے کر ہی لیا تھا۔۔۔ جس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ کل بھی اپنے ارادے میں پکی تھی۔ وہ آج بھی اپنے ارادے میں پکی تھی۔

وہ کل بھی اپنے عشق میں سچی تھی۔۔۔ اور وہ آج بھی اپنے عشق میں سچی تھی۔ اسے دوبارہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی نہیں کرنا تھی۔

عون اس کا ہوتا یا نہ ہوتا۔ عون اسے بیوی کا درجہ دیتا یا نہ دیتا۔ عون اس سے محبت کرتا یا نہ کرتا ماہ رو سرفراز کو عمر بھر عون عباس سے محبت کرنا تھی۔ کیونکہ ماہ رو سرفراز کو عون عباس سے عمر بھر کے لیے محبت ہو گئی تھی۔



یوں ماہ رو سرفراز کی زندگی ایک نئے دور میں داخل ہو گئی تھی۔ زندگی کا ایک نیا اور انوکھا باب کھل گیا تھا۔ جو زندگی اس نے طلب کی تھی۔ وہی اسے عنایت کی گئی تھی۔ اسے چاہ سے کچھ کم نہیں ملا تھا۔ بلکہ طلب سے کچھ زیادہ مل گیا تھا۔

اس نے عون عباس کی خواہش' تمنا اور اسے پانے کی چاہ کی تھی۔ اس نے کبھی بھی عون کی محبت طلب نہیں کی تھی۔ اس کی زیست بھر کی خوشی کے لیے عون کا ہو جانا کافی تھا۔ عون کی محبت پانا تو اس کی تمنا کبھی نہیں رہی تھی۔ اسے چاہنا ضروری تھا' بدلے میں چاہت کا ملنا ضروری نہیں تھا۔

اور وہ جانتی تھی کہ عون کا حصول جتنا آسان بنا دیا گیا تھا اس کو پورا حاصل کرنا نہایت مشکل ترین مرحلہ تھا۔ اس کے دل تک پہنچنا اور بھی تکلیف دہ' کٹھن ترین سفر سے اٹا رستہ تھا۔ اور اس نے اپنے دل کی خوشی کے ساتھ' ہر پہلو پہ غور کرنے کے بعد اس مشکل' کٹھن اور پرمشقت رستے کا چناؤ کیا تھا۔ یہ اس کا من پسند انتخاب تھا اور وہ اپنی ہر صلاحیت اور آخری حد تک برداشت کو آزما لینا چاہتی تھی۔

سو کاروبار سلطنت کو سنبھالنے کے لیے تازہ دم ہوتی سویر کو بمشکل خوش آمدید کہتے ہوئے جب اس نے آنکھ مسل مسل کر دھند کے پار دیکھنا چاہا تو ہر عکس

بڑا غبار آلود نظر آیا تھا۔ آنکھوں کے سامنے جالے سے تھے جو ہٹ نہیں رہے تھے۔ بڑی کوشش کے بعد اس نے آنکھیں پوری کھول کر دیکھا تو عون اسے جھنجوڑ کر اٹھا رہا تھا۔

"ملکہ عالیہ! نسیم سحر پکار رہی ہے۔ اٹھ جائیے مجھے بھی تلاش معاش کے لیے خاک دھول ایک کرنا ہے۔" اس کا طنزیہ لب و لہجہ اور کٹیلے الفاظ سن کر ماہ رو کی نیند اڑنچھو ہو چکی تھی۔ وہ لمبی لمبی جمائیاں روکتی جلدی سے اٹھ گئی۔ بکھرے بال کیچر میں سمیٹ کر اس نے بھاں بھاں کرتے کمرے پہ طائرانہ نظر ڈالی تھی۔ وہاں عون کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔

"کہاں ہے نسیم سحر؟ اور کون خاتون ہیں یہ؟" اس نے ہونق پن کی انتہا کرتے ہوئے عون کو اچھا بھلا تپا دیا تھا۔ حالانکہ تپا تپا تو وہ پہلے سے لگ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا باہر والوں سے پھر جھڑپ ہوئی ہے۔ اور وہ یقیناً "تازہ تازہ لڑائی کے بعد اندر آیا تھا۔

"تمہاری سوکن ہے۔" اس نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا تھا۔ ماہ رو کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

"تو وہ راتوں رات آ بھی گئی؟" ماہ رو کی جیسے جان نکل گئی تھی۔ عون جو مرضی کرتا رہے۔ جسے مرضی پسند کرے۔ چاہے یہ دعوا باتوں کی حد تک آسان تھا۔ عملی طور پر اگر ایسی کوئی پچویشن ہوتی تو ماہ رو کا کیا بنتا؟ شاید ہارٹ اٹیک ہو جاتا اور ہارٹ اٹیک تو اسے اب بھی ہونے لگا تھا۔ نسیم سحر کا نام سن کر جیسے جان نکلنے لگی تھی۔

"کہاں ہے وہ؟" اس نے دل پہ پتھر رکھ کر بمشکل پوچھا۔

"باہر۔۔" عون نے غضب ناک انداز میں جواب دیا تھا۔ پھر پاؤں پٹختا باہر نکل گیا۔ ماہ رو کچھ دیر کے لیے ہونق ہوئی تھی۔ پھر وہ عون کی بات کا مفہوم سمجھ کر خود کو ملامت کرنے لگی۔ بعد میں اسے اپنی بے وقوفی پر ہنسی آگئی تھی۔

"یہ عون بھی نا۔۔۔ بہت شوق ہے اسے مجھ پہ سوکن لانے کا۔" وہ بیڈ سے اتر کر واش روم کی طرف چلی گئی تھی پھر جب فریش ہو کر باہر آئی تب تک عون بھی اندر آ چکا تھا۔

"تمہارا ابھی تک اشنان پورا نہیں ہوا اور مجھے نو بجے تک نکلنا تھا۔ حد ہے کاہلی اور سستی کی۔" وہ جیسے دہاڑ کر بولا۔ ماہ رو بیال بناتی کچھ گھبرا گئی۔

"اٹھ تو گئی ہوں اب کیا کروں؟" اس نے بوکھلاہٹ میں ہیئر برش پٹخ کر سلیپر پہنے۔ کیا اسے عون کے ساتھ کہیں جانا تھا؟ کیا پتا ناشتا کرنے؟ اس کا دل بڑا خوش فہم ہوا۔

"میرا منہ دیکھو۔" وہ پھر سے دہاڑا۔

"دیکھ تو رہی ہوں۔ کیا ہوا؟ تازہ شیو بنائی ہے۔ کٹ تو نہیں لگا؟" ماہ رو نے فکر مندی سے کہا۔ اب بھلا وہ اس کے علاوہ کیا کہہ سکتی تھی؟

"جسٹ شٹ اپ۔" وہ پھر سے چیخا تھا۔ ماہ رو منہ بند کر کے کھڑی ہو گئی۔ اب بھلا کیا کرے؟ حد تھی۔ جان بوجھ کر ستائے چلا جا رہا تھا۔ خیر ستانا تو اس نے تھا ہی۔۔۔ بس ماہ رو کو ثابت قدم رہنا تھا اور بالکل بھی گھبرانا نہیں تھا۔ وہ ستم آزمائے گا۔ ماہ رو جگر آزمائے گی۔ دیکھیں گے جیتے گا کون؟

اس کے حوصلے بھی جوان تھے اور ارادے بھی اٹل۔ اتنی آسانی سے ہار تسلیم نہیں کرے گی۔ آخر سیٹھ سرفراز احمد کی بیٹی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ دل الٹی جگہ اٹکا لیا تھا۔

معاً اس کی دہاڑ پہ دروازہ ایک دم کھلا تھا۔ عون کی امی کھانے کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوئی تھیں۔ کمرے میں ناشتے کی اشتہا انگیز خوشبو پھیل گئی تھی۔ رات بھر سے بھوکی ماہ رو کی بھوک انگڑائی لے کر بے دار ہو گئی تھی۔ اسے عون کی امی پہ ٹوٹ کر پیار آ گیا تھا۔

اور ابھی وہ فرط خوشی میں جلدی سے آگے بڑھ کے ٹرے تھامنا چاہتی ہی تھی جب عون کی خفگی بھری آواز اس کے کانوں میں پڑی تھی۔ اس نے ماں کی وجہ سے غرانے سے کچھ پرہیز کیا تھا۔ یقیناً "امی کے احترام میں۔

"آپ پھر ناشتا اٹھا لائی ہیں۔ یہ فاؤل ہے امی! کل کا پورا دن میں نے ابو سے جھگڑا کر کے کچن الگ کروایا تھا اور آپ میرے کیے کرائے پہ پانی پھیر دینا چاہتی ہیں۔ جب میں نے کہہ دیا تھا کہ ہمارا کھانا الگ ہو گا تو الگ ہی ہو گا۔ پھر یہ تکلیف کیوں؟ بلکہ یہ زیادتی کیوں؟"

عون کا لہجہ نرم تھا لیکن الفاظ تلخ۔ وہ ماں کی وجہ سے لہجہ بدل کر بہت دھیمے انداز میں بول رہا تھا۔

"تم حد کرتے ہو عون! اور تمہارے ابو بھی حد کرتے ہیں۔ تمہاری ضد پہ انہیں غصہ آ گیا۔ اور انہوں نے تمہارا کچن الگ کروا دیا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ تم میرے جیتے جی ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے اپنا چولہا الگ کر لو۔ پھر اس صورت حال میں جب بہو کا یہاں نیا قدم ہے۔ نہ اسے پکانے کی سمجھ بوجھ ہے نہ کام کرنے کی۔ ابھی اس کے دلہناپے کے دن ہیں اور تم اسے چولہے میں جھونکنا چاہتے ہو۔ ابھی تو مجھے پہلا پچھتاوا نہیں گیا کہ اپنی بیٹی کا کوئی چاؤ نہیں کر سکی۔ اوپر سے تم اس پہ دہری ذمہ داریاں ڈال دینا چاہتے ہو۔ ایسا بالکل نہیں ہو گا عون! اچھا ہے۔ جس کان سے مرضی ہے سنو۔۔۔ ناشتا کھانا اکٹھے ہو گا اور تم میری بہو پہ کوئی دباؤ نہیں ڈالو گے۔" امی نے اپنے مخصوص دھیمے مگر دو ٹوک لہجے میں حکمیہ انداز اپنا کر کہا تو عون بری طرح سے جزبز ہو گیا تھا۔

"یہ بالکل ٹھیک نہیں امی! آپ مجھے مجبور مت کریں پلیز، پھر اس طرح یہ مہارانی کچھ بھی نہیں سیکھ پائے گی۔" اس نے بڑے محتاط انداز میں ماں کے ساتھ بحث کرنا شروع کر دی تھی۔

"آہستہ آہستہ سب سکھا دوں گی۔ تم ایک ہی دن میں اسے کامیاب ترین کک نہیں بنا سکتے۔" ان کا لہجہ ہنوز وہی تھا۔ دو ٹوک اور حکمیہ۔

"لیکن مجھے یہ منظور نہیں۔" اس نے ضدی انداز میں کہا۔

"تو نہ ہو۔۔۔" امی کے انداز میں لاپروائی تھی۔ "تم سارے مرد گھر میں ٹکتے کب ہو۔ دل چاہا گھر سے کھایا ورنہ باہر سے پیٹ بھر آئے۔ یہ عذاب تم ماہ رو کے لیے بنانا چاہتے ہو کہ وہ اپنی اکیلی کے لیے روٹی پکاتی پھرے۔۔۔ ہمارے لیے شرم کا مقام ہے۔ میری بیٹی کی روٹی مجھ پہ بھاری نہیں۔۔۔ خبردار جو تم نے میرے ساتھ بحث کی۔" انہوں نے عون کو غصے بھری نظروں سے گھور کر چپ کھڑی ماہ رو کو اشارہ کیا تھا۔

"پکڑو بیٹا! خود بھی کھاؤ۔۔۔ اور اسے بھی دو۔۔۔ یوں ہی نعمتوں کو ٹھوکریں مارتا ہے۔ یہ جانے بغیر کہ نعمتوں کو ٹھکرا دینے کے بعد پھر یہ بار بار ہاتھ نہیں آتیں۔" انہوں نے عام لہجے میں بڑی گہری بات کی تھی۔ عون اندر تک سلگ گیا تھا۔ ناک تک غصے میں بھر گیا تھا۔ اور یہ بات تھی کہ ماں کے سامنے بول نہیں سکتا تھا۔

ادھر ماہ رو ماں بیٹے کی بحث میں پنڈولم کی طرح جھول رہی تھی۔ کیا کرے؟ ٹرے پکڑے یا نہیں؟ ناشتے کو ہاتھ لگائے یا نہیں؟ اس نے سہمی نظروں سے عون کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی گھوری پہ ٹرے کی طرف بڑھتے ہاتھ ہوا میں معلق رہ گئے تھے۔ تب امی کو بلا کا غصہ آ گیا تھا۔

"عون! تم ٹھیک نہیں کر رہے۔ اپنے باپ سے اختلاف اپنی جگہ۔۔۔ تم میرا دل نہیں دکھا سکتے۔ پکڑو ماہ رو بیٹی! ناشتا شروع کرو۔۔۔ رات بھی تم نے کچھ نہیں کھایا۔" امی نے عون کو گھر کتے ہوئے گم صم کھڑی ماہ رو کو مخاطب کیا تو اس دفعہ بھوک سے عاجز آئی ماہ رو نے ٹرے پکڑنے میں دیر نہیں کی تھی۔ اور عون نے بھی مزید گھورنے کا تکلف نہیں کیا تھا۔ البتہ وہ ایک سلگتی نگاہ ماہ رو پہ ڈال کر باہر نکل گیا تھا۔ امی اسے پکارتی رہ گئی تھیں۔ پھر سر تھام کر وہیں بیٹھ گئیں۔ ماہ رو جوان کے اصرار پہ بے تکلفی سے گرما گرم ناشتے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ تھوڑا خفیف سی ہو گئی۔

"عون کو غصہ ہے۔" اس نے محض یہاں تک تبصرہ کیا تھا۔ امی جو کسی گہری سوچ میں تھیں ایک دم چونک گئیں پھر گہرا سانس کھینچ کر بولیں۔

"اتر جائے گا۔ تھوڑا غصہ کرے گا پھر رام ہو جائے گا۔ کیونکہ اسے الگ کچن والی اپنی ضد منوانی تھی۔

میں نے اس کی ایک نہیں چلنے دی۔ سو اسی بات پہ برہم ہے... اپنے باپ پہ پڑا ہے' ویسا ہی ضدی اور جذباتی۔" وہ اسے آہستہ آہستہ بتانے لگی تھیں۔

حیرت انگیز طور پر وہ ساری باتیں جو ماہ رو کو ابھی تک نہیں پتا تھیں۔ وہ عون کو اس کے مزاج کو اس کی پسند ناپسند کو جانتی تک نہیں تھی۔ اور اس وقت عون کی امی کے منہ سے سب باتیں سن کر بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اسے عون کے متعلق جاننا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"ہر بچہ اپنی فطرت پہ پیدا ہوتا ہے۔ ہر بچے کا اپنا الگ ہی مزاج ہوتا ہے۔ عون میرے سارے بچوں میں مختلف تھا۔ شروع سے ہی الگ تھلگ مزاج رکھتا تھا۔ اسے بہن بھائیوں کے ساتھ کھیلنا کودنا پسند نہیں تھا۔ دوست بنانے کا شوق بھی نہیں تھا۔ اور جو عون کی طبیعت کے دوست تھے وہ تھوڑے۔ جھگڑالو ٹائپ تھے۔ کچھ غصہ ور تھے عون کی طرح ہی... آپس میں جب لڑتے تو بات ہاتھا پائی سے ہوتی ہوئی مار کٹائی تک پہنچ جاتی تھی۔ اکثر کسی کا سر پھٹ جاتا کسی کی ٹانگ ٹوٹ جاتی۔۔۔ عون کے ابو آئے دن کی اس صورت حال سے تنگ آ چکے تھے۔ انہوں نے اس کے دوستوں کی سنگت تڑوادی تھی۔ کیونکہ جب بھی وہ باہر سے لڑ کے آتا تھا۔ اس کے ابو بجائے سمجھانے کے' پیار کرنے کے الٹا اسے مار مار کر فنا کر ڈالتے تھے۔

بس اس کے مزاج کی تبدیلی کا آغاز اور شروعات وہیں سے ہونا شروع ہوئی تھیں۔ میرے باقی بچے نسبتاً" بے ضرر قسم کے تھے۔ گلے محلے میں بھی نہ جھگڑتے نہ لڑائی کو پسند کرتے۔ لیکن عون کی آئے دن شکایتوں نے ہمیں بہت عاجز کر دیا تھا۔

اس کے ابو نے سمجھانے کے لیے جو ڈنڈا پکڑا تو کالج تک وہ ڈنڈا ساتھ ہی رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ کالج میں پہنچ کر عون میں خاصی تبدیلیاں آگئی تھیں۔ وہ پہلا والا عون نہیں رہا تھا۔ کچھ بدل گیا تھا۔ چونکہ بھائیوں اور کزنز میں وہ گھلتا ملتا نہیں تھا۔ ہمیشہ دور ہی رہتا تھا۔ بس گھر میں فریحہ سے دوستی تھی۔ اور اسی کے ساتھ بات چیت کرتا تھا۔ اسی کو اپنا ہمدرد بھی سمجھتا تھا۔ سو وہ فریحہ تک ہی محدود رہتا تھا۔

فریحہ اس کی اچھی غم گسار تھی۔ ابو سے مار پڑتی تب بھی وہی زخموں کی ٹکوریں کرتی تھی اور اگر باہر سے لڑ کے آتا تب بھی فریحہ ہی زخموں پہ مرہم رکھتی۔ فریحہ اس کے لیے دوست' استاد' کزن سب کچھ تھی۔ وہ فریحہ کے ہی قریب تھا۔ اپنی ہر بات اسے بتاتا تھا۔ اسی سے مشورہ لیتا تھا اور اسی کی مان بھی لیتا تھا۔

باپ کے ساتھ اس کے اختلافات بہت پہلے سے تھے۔ اس وقت جب انہوں نے اسے فوج میں بھرتی نہیں ہونے دیا تھا۔ اس وقت بھی جب انہوں نے اسے انجینئرنگ پڑھنے نہیں دی تھی۔ پھر اس نے لاء کرنا چاہا تب بھی رحمان رکاوٹ بن گئے۔ ان کے نزدیک وکالت کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ کہتے تھے وکیل بھوکے مرتے ہیں۔ یہ رحمان کی ضد تھی کہ وہ میتھس ہی پڑھے۔ گو کہ وہ میتھ میں بہت اچھا تھا۔ اس نے باپ کی ضد مان لی اور میتھس میں ایم ایس سی کیا۔ ایم فل کیا۔ یونیورسٹی نے اسے ہائیر ایجوکیشن کے لیے اسکالرشپ دیا تب بھی رحمان اس کے خوابوں کی راہ میں رکاوٹ بن گئے تھے۔ انہوں نے اسے آسٹریلیا بھیجنے سے صاف انکار کر دیا۔ نہ پیسہ دیا نہ سپورٹ کیا۔ بقول رحمان کے انہوں نے اتنا پیسہ لگا کر اس لیے نہیں پڑھایا کہ وہ گوروں کو فیض دیتا رہے۔ یہ ساری تعلیم انہوں نے اس لیے دلوائی تھی تاکہ عون سے وہ کلن واری کروا سکیں۔

انہوں نے باقی بیٹوں کے ساتھ بھی یہی کیا تھا۔ وہ سب فرمانبرداری سے مان گئے تھے۔ اپنا خاندانی کاروبار سنبھال لیا تھا۔ لیکن عون اس بات پہ بھی ڈٹ گیا۔ اس نے کہا۔

"وہ جاب ہی کرے گا۔" وہ ضد پہ اڑ گیا تھا۔ رحمان نے ایک مرتبہ پھر اس کی خواہش کا گلا دبا ڈالا... ان کے نزدیک دوسروں کی چاکری سے بہتر تھا اپنا کام کیا جائے۔

سو یہاں بھی عون کو من مارنا پڑا۔۔ گو کہ گھر میں کئی مہینے تک جنگ چلی تھی۔ عون ناراض ہو کر ہاسٹل چلا

گیا۔ اس کے باپ کو کوئی پروا نہیں تھی۔ پھر فریحہ کے سمجھانے پہ نہ صرف عون نے اپنی ضد توڑی تھی بلکہ وہ گھر بھی واپس آگیا۔ اور اپنی اتنی شاندار ڈگریوں کو لاک اپ کر کے دوکانداری میں لگ گیا تھا۔ یہاں بھی باپ جیت گیا تھا اور بیٹا ہار گیا تھا۔

رحمان کو اور کیا چاہیے تھا۔ وہ پھر بھی ناخوش تھے۔ کیونکہ پلازہ کی ہر دوکان میں سیل کے حساب سے الیکٹرونکس مصنوعات میں پرافٹ کم آتا تھا۔ اور وہ حصہ یا ڈپارٹمنٹ عون کے سپرد تھا۔ جہاں سے کبھی منافع نہیں ہوا۔ پھر باپ بیٹے کے اختلافات لڑائیاں جھگڑے کی حد نہیں۔۔۔ گھر میں بے سکونی تھی۔ ہر وقت ٹینشن کا سماں رہتا تھا۔ عون نے کئی مرتبہ پلازہ کو لات مارنی چاہی تھی لیکن میرے اور فریحہ کے سمجھانے پہ خاموش ہو جاتا تھا۔

کیونکہ رحمان نے دھمکی دے رکھی تھی جو پلازہ میں برابر آکر کام نہیں کرے گا۔ اسے نہ تو پرافٹ میں حصہ ملے گا۔ نہ وہ جائیداد میں حصہ دیں گے۔ جو نوکری کرے گا۔ وہ بس نوکری سے کمائے اور کھائے گا۔

مجھے کہنے میں کوئی عار نہیں کہ رحمان کی اکثر ضدوں نے عون کو زبردستی اکھڑ، ضدی اور نافرمان بنا دیا حالانکہ میرے بیٹے نے کبھی نافرمانی نہیں کی۔

وہ شروع سے الگ تھلگ رہا۔ بہن بھائیوں سے دور دور۔ اپنے مزاج کی وجہ سے لیکن یہ نہیں تھا کہ اس میں احساس اور خیال نہیں تھا۔ لیکن اس کے ابو کو ہمیشہ اس سے شکایتیں ہی رہی ہیں۔

وہ مزاجاً" اکھڑ سہی ضدی سہی تاہم اس میں کوئی بری عادت نہیں۔ نہ اس نے کبھی سگریٹ پیا نہ کوئی اور بری عادت۔ یونیورسٹی میں بھی ہمیشہ لڑکیوں سے دور ہی رہا۔ میں تو مان ہی نہیں سکتی کہ وہ کسی غیر اخلاقی حدود کو تجاوز کر سکتا ہے۔ وہ سب جو لوگوں نے دور دور تک پھیلایا۔۔۔ مجھے ایک فیصد بھی اس پہ یقین نہیں۔" انہوں نے دھیمی آواز میں عون کی پرت در پرت شخصیت کو کھولنا شروع کیا تھا۔ پھر جب وہ آخر میں لمحہ بھر کے لیے رکیں تو ماہ رو نے جیسے نظر چرالی تھی۔ یوں لگ رہا تھا وہ خاص طور پہ اسے ہی سنا رہی تھیں۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔

"اس کے ابو نے بہت شروع سے ہی اسے دباؤ میں رکھنا چاہا تھا۔ جیسے وہ دوسرے بیٹوں کو رکھتے تھے۔ کسی حد تک وہ لڑنے جھگڑنے کے بعد بھی دباؤ میں ہی رہا تھا۔ وہ ضدی تھا لیکن ایسا بھی نہیں بات نہیں مانتا تھا۔ اپنی مرضی چلاتا تھا۔ لیکن جیسے ہی میں کوئی بات سمجھاتی تھی وہ رام بھی ہو جاتا تھا۔

پھر جب ہم نے اس کی شادی کا ارادہ ظاہر کیا تب بھی اس نے کوئی ڈیمانڈ نہیں رکھی۔ سارا معاملہ مجھ پہ چھوڑ دیا تھا۔ اس کی کوئی پسند ہوتی تو وہ لازمی بتاتا۔ میں نے فریحہ کے لیے خواہش ظاہر کی تو تب بھی اس نے یہی کہا۔

"جو آپ مناسب سمجھیں۔" فریحہ گھر کی بیٹی تھی۔ اسے چھوڑ کر میں باہر سے بہو کبھی نہ لاتی۔ جب میں نے عون کے ابو اور چاچا سے اپنی خواہش کا ذکر کیا تو تب دونوں نے ایک ساتھ ہی مجھے جواب دیا تھا۔ ان کا جواب میرے لیے بڑا حیران کن تھا۔" وہ ایک مرتبہ پھر بولتے بولتے اچانک رک گئی تھیں۔ جیسے کسی سوچ میں پڑ گئی تھیں اور فریحہ کا ذکر ایسا تھا کہ ماہ رو جلد از جلد اس کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ فریحہ کا رشتہ عون کے ساتھ کیسے ہوا؟ اس میں عون کی کتنی پسندیدگی شامل تھی؟ عون فریحہ کو چاہتا تھا یا نہیں؟ وہ ایک گھر میں رہتے تھے یقینی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ قلبی لگاؤ تو ضرور ہو گا۔ یہ رشتہ جڑا کیسے تھا اور ٹوٹا کیسے؟ عون تو اس پہ صاف الزام رکھتا تھا کہ اس کی وجہ سے یہ رشتہ ختم ہوا تھا لیکن ماہ رو کو وجہ کچھ اور معلوم ہوتی تھی۔ بھلا اس کی وجہ سے یہ شادی کیسے ٹوٹ سکتی تھی؟

"انہوں نے کیا جواب دیا؟" عون کی امی کو خاموش دیکھ کر ماہ رو نے بے چینی سے انہیں کچھ یاد کروایا تھا۔ وہ چونک کر گہرا سانس کھینچتی نرمی سے دوبارہ بتانے لگیں۔

"ان دونوں نے کہا۔ وہ تو فریحہ کے لیے عاشر کو فائنل کر چکے تھے۔ فرقان بھی اپنے بھائی کی طرح عون سے زیادہ عاشر کو پسند کرتا تھا۔ اس لیے بھی کہ عون کی نسبت عاشر میں بہت سی اچھی خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ فرقان نے بڑے واضح لفظوں میں کہا تھا۔

"بھابھی! میرا تو عاشر پہ دل تھا۔" اور واقعی فرقان کا عاشر پہ ہی دل تھا۔ لیکن جب میں اڑ گئی اور میرے ساتھ فریحہ کی امی بھی مل گئیں تو ان دونوں کو مانتے ہی بنی تھی۔ دراصل فرقان کو عون کے مزاج' رویے اور طبیعت کے روکھے پن کی وجہ سے بہت تحفظات تھے۔ عون کے مزاج میں تندی تھی اور عاشر کے مزاج میں حلیمی تھی۔

تب بھی رحمان اور فرقان کا دل نہیں تھا کہ ان کی لاڈلی نرم خو فریحہ کی شادی عون سے ہو۔ لیکن میں نے یہاں ایک نہیں چلنے دی تھی۔ اگر عون کو رشتہ نہیں دے رہے تھے تو پھر عاشر بھی کیوں؟" میری ضد پہ فرقان کو چپ ہونا ہی پڑا تھا کیونکہ جو بھی تھا وہ اکلوتی بیٹی کو اپنے کسی بھی بھتیجے سے بیاہنا چاہتا تھا۔ خاندان سے باہر نہیں۔

یوں خوش اسلوبی سے یہ رشتہ طے ہو گیا تھا تاہم تب بھی رحمان خوش نہیں تھے۔ وہ بات بے بات عون کو کچوکے لگاتے' طنز کرتے غصہ ہوتے کہ وہ اس قابل ہی نہیں تھا۔ لیکن اسے فریحہ جیسی لڑکی کا ساتھ مل گیا ہے۔ فریحہ تو عاشر جیسے لڑکے کو ڈیزرو کرتی تھی۔ اس کی قسمت خراب تھی جو غلط جگہ رشتہ جڑ گیا تھا۔

شروع سے ہی جن رشتوں کے درمیان اختلافات کی فصیلیں کھڑی ہونے لگیں وہ رشتے کبھی کامیاب نہیں ہوتے یا پھر سارا ہیر پھیر نصیب کا تھا۔ آسمانوں پہ جوڑیاں لکھے ہی نہیں تھے جو ہم انسانوں نے اپنی مرضی سے بنا دیے تھے۔ ایک ہنستی بستی زندگی' ایک خوشگوار انداز میں شروع ہونے والی شادی اچانک ختم ہو جائے گی۔ وہ بھی اتنی شرم ناک وجوہات کی بنا پر۔ سوچ کی انتہا تک بھی دل تسلیم نہیں کرتا تھا۔ لیکن ہونی کو کون روک سکتا ہے۔۔۔؟" انہوں نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے افسردگی سے کہا تھا۔ ان کے چہرے پہ عجیب سی اذیت پھیل گئی تھی۔

"اور عون کہتا ہے یہ شادی میری وجہ سے ختم ہوئی۔" ماہ رو نے بھی ان کے خاموش ہوتے ہی آہ بھر کے اپنے دل کا پھپھولا پھوڑا تھا اور عون کی امی نے اچانک آنکھیں پوری کھول کر حیرانگی سے اسے دیکھا۔ جیسے کہہ رہی تھیں۔ "تو کیا نہیں ہوئی تھی؟ جہاں سے بھی بات نکلتی وجہ تو تم ہی تھیں۔" انہیں وہ ساری بدنامی یاد آنے لگی۔ استہزا' طنز اور ذلت جو ماہ رو کے توسط سے ہی ان کا نصیب بنی تھی مگر ان کی اعلاظرفی کو یہ گوارا نہیں تھا کہ ماہ رو کو جتا جتا کر شرمندہ کریں۔ کیونکہ جو بھی تھا۔ ماہ رو ان کی عزت بن چکی تھی اور شاید بیٹے کی محبت بھی۔

گو کہ رشتہ ٹوٹنے' شادی رکنے میں جو وجہ سامنے آئی تھی اس کا لب لباب تو یہی تھا عون کو ایک امیر زادی سے محبت ہو گئی تھی اور وہ اسے بھگانے یا اغوا کرنے کے لیے اس کے گھر پہنچ گیا تھا۔ موقع واردات پہ کئی چشم دید گواہ بھی موجود تھے۔ سو عون کسی بھی طرح سے مکر نہیں سکتا تھا۔ وہ اپنے ہی شکنجے میں پھنس گیا تھا۔

لیکن تب سے لے کر اب تک عون کی امی کو ان دونوں نئے نویلے میاں بیوی کے درمیان "محبت" کہیں بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ باقی سب کچھ تو دکھائی دے رہا تھا لیکن وہ عشق دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جس کے پیش نظر اتنی بڑی بدنامی مول لی تھی۔ اور خاک دھول اڑائی تھی۔

اگر یہ لو میرج تھی تو پھر کہاں گیا تھا؟ یہاں تو خالی میرج بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ دونوں شادی کے تیسرے دن ہی بے زار' تلخ' خاموش' روٹھے روٹھے سے نظر آرہے تھے۔

عون کی امی کو دیکھ دیکھ کر ہول اٹھنے لگے تھے۔ پیچھے جو کچھ بھی ہوا تھا اس سب کو بھلا کر وہ چاہتی تھیں کہ عون اور ماہ رو ہمیشہ خوش رہیں۔ ایک ماں ہونے کے ناطے ان کی یہ خواہش بے جا نہیں تھی۔

"آپ یقین کریں آنٹی! عون کسی بڑی غلط فہمی کا شکار ہے۔ میں تو جانتی ہی نہیں تھی کہ عون اور فریحہ کی شادی ہو رہی تھی۔ مجھے فریحہ نے کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ انوائٹ تک نہیں کیا۔" ماہ رو اچانک انہیں سوچوں کے بھنور سے کھینچ لائی تھی۔ اور عون کی امی جیسے ہکابکا رہ گئیں۔

"ایں۔۔۔ یہ ماہ رو کیا ٹھیک کہہ رہی تھی؟" ان کا اچنبھا کسی طور بھی کم نہیں ہو رہا تھا۔

"میرا یہاں آنا جانا تھا۔ اتنا تو آپ مجھے جانتی ہی ہوں گی آنٹی! کہ میں کسی کا برا نہیں سوچ سکتی؟" ماہ رو روہانسی ہو کر بول رہی تھی۔

"اگر میں بری ہوتی تو کبھی بھی فریحہ کے کسی کام نہ آتی۔ یونی سے لے کر بعد تک جب بھی فریحہ نے مجھے چھوٹے سے چھوٹا کام کہا میں نے کبھی انکار نہیں کیا۔ بہت دفعہ میں اس کے ساتھ بلاوجہ گرمی میں چھوٹے چھوٹے بازاروں میں شاپنگ کے لیے گھومتی رہی ہوں۔ یونی میں اس کا ہر کام میرے ذمہ تھا۔ ہر جگہ سے نوٹس اکٹھے کر کے اسے فوٹو سٹیٹ کروا کے دینے' اگر اس کی کسی کے ساتھ تکرار ہو جاتی تب بھی میں ہی پرائی لڑائی میں کود پڑتی۔ اکثر اسے پروفیسرز کی ڈانٹ سے بچاتی تھی۔ مجھ میں بہت بری عادتیں بھی ہوں گی۔ لیکن ایک بات دعوے سے کہہ سکتی ہوں مجھ میں مروت بھی ہے اور میں کسی کا برا کبھی نہیں چاہ سکتی۔" ماہ رو نے ایک ہی سانس میں وہ سب کہہ دیا تھا جو وہ عون کو بتانا چاہتی تھی۔ لیکن عون اسے موقع نہیں دے رہا تھا۔ نہ ہی وہ کچھ صفائی میں سننا چاہتا تھا۔ وہ اسے برے پن کا ٹائٹل دے چکا تھا۔ اب اپنی بات سے کبھی نہ ہٹتا۔ وہ اس کے نزدیک بری تھی اور ہمیشہ بری ہی رہتی۔

"گو کہ فریحہ میری ماہم جیسی بیسٹ نہ سہی' فرینڈ تو تھی۔ میں کیسے اس کے لیے گڑھا کھود سکتی تھی آنٹی! اور عون اس بات کو سمجھتا ہی نہیں۔ اس کے نزدیک میں ہی غلط ہوں۔ اور وہ کہتا ہے میں اس کے ابو کے سامنے اپنی غلطی کا اور اپنے غلط ہونے کا اقرار کروں۔

میں انہیں بتاؤں۔ میں ہی ماسٹر مائنڈ پلانر ہوں۔ چال باز ہوں۔ میری شاطرانہ چال میں عون کا کوئی قصور نہیں۔ جو بھی کیا میں نے کیا۔ میں اسے چاہتی تھی سو گناہ گار بھی میں ہی تھی۔۔۔ اور آنٹی! وہ یہ بھی کہتا ہے۔ میں انکل کے سامنے نہیں بلکہ سارے خاندان کے سامنے اعلان کروں۔ میری گھٹیا سوچ' پلاننگ اور بہتان مجھ تک ہی محدود تھے۔ کیونکہ میں کریکٹرلیس لڑکی تھی۔ میں نے عون پہ ڈورے ڈال کر اسے جان بوجھ کے بدنام کیا ہے۔

اور آنٹی! وہ یہ بھی چاہتا ہے۔ میں پورے خاندان کے سامنے حلف اٹھا کر اسے سچا ثابت کروں۔۔۔ اور بہانگ دہل عون سے طلاق کا مطالبہ کر کے اس کی زندگی سے نکل جاؤں۔" ماہ رو نے آخر میں پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے اپنے دل کا سارا بوجھ اتار پھینکا تھا کہ چاروں ہوا۔۔۔ عون کی امی کا کلیجا تک کانپ گیا۔ وہ اس کے تڑپنے پہ خود بھی تڑپ گئی تھیں۔ ماہ رو اندر سے کس قدر تکلیف میں تھی۔ زخمی تھی اور شاید سچی بھی ہو۔ وہ تو عون کی سن کر اسی پہ ایمان لے آئی تھیں۔ ماہ رو کو تو آج سننے کا موقع ملا تھا۔ عون کی امی کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ وہ اتنی شاکڈ تھیں کہ ہر چیز کو نظرانداز کر کے محض ماہ رو کے آخری الفاظ پہ پتھر ہو گئیں۔ انہیں یقین نہیں آیا تھا عون ایسی بکواس بھی کر سکتا ہے۔ ان کے خاندان میں پہلے کبھی ایسا ہوا تھا؟ پہلے کبھی کسی مرد نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کی بات نہیں کی تھی۔ وہ بھی نئی نویلی تین دن کی بیاہتا بیوی۔

"اس نے ہمت کیسے کی تمہیں طلاق لینے پہ مجبور کرنے کی۔ بے شرم کی غیرت نجانے کہاں سوئی ہے۔ ہم خاندانی لوگ ہیں۔ ایک جگہ جہاں بات پکی کر دی کبھی ہٹے نہیں۔ یہ عون اور فریحہ کا تو معاملہ ہی الگ تھا۔ اس میں فرقان خود پیچھے ہٹ گیا تھا۔ ورنہ یہ شادی بھی ہو کر رہتی۔

اور یہ عون کس قدر کمینہ ہو رہا ہے۔۔۔ طلاق کی بات کرتا ہے۔ بے حیا نہ ہو تو۔ باپ کو پتا چلا تو کھڑے کھڑے گولی سے اڑا دیں گے۔ یہ ذلیل ہمیں اور بھی

ذلیل کرے گا۔ پہلے بدنام کیا کم ہو چکے ہیں جو اب نئی بدنامی مول لینا چاہتا ہے۔ ہر وہ کام آخری انتہا پہ کرے گا جو پہلے ہماری پشتوں میں نہیں ہوا۔ پہلے کیا کم بہتان لگ چکے تھے اور اب الزامات لگوانے پہ تلا بیٹھا ہے۔ بے شرم' بددماغ نہ ہو تو۔

اور یہ تم کیوں روتی ہو؟ میں تمہاری ماں ہوں۔۔۔ صرف عون کی ماں نہیں ہوں۔ تمہارے ساتھ کچھ برا نہیں ہونے دوں گی اور عون کے ابو تو کبھی اسے کسی بھی انتہائی فعل کا مرتکب نہیں ہونے دیں گے۔۔۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔ وہ اپنی جلن' غصہ اور زہر نکالتا ہے۔ باپ کے سامنے بول بال کر بھڑاس ضرور نکالتا ہے۔ لیکن ان کے فیصلوں کی نفی کبھی نہیں کر سکتا۔ مخالفت ضرور کر لیتا ہے۔ جھگڑا بھی' تاہم ان کی کسی بات کو ٹھوکر سے اڑا کر من مانی کی جرات نہیں اس میں۔"

انہوں نے روتی ہوئی ماہ رو کو سینے سے چمٹا کر ڈھیر سارا پیار کیا۔ ڈھیر سارا اعتماد بخشا تو ماہ رو اندر تک اور بھی مضبوط اور بھی مستحکم ہوتی چلی گئی تھی۔ عون کی امی کے سینے سے لگی ماہ رو کے اندر ٹھنڈک اتر آئی تھی۔ زندگی میں شازمہ کے ہوتے ہوئے بھی پہلی مرتبہ اسے ممتا کا صحیح احساس ہوا تھا۔ اس نے ممتا کی گرمی اور نرمی' ٹھنڈک اور سرشاری کو بیک وقت محسوس کیا تھا۔ اس کا دل اور آنکھیں دونوں بھر بھر آئی تھیں۔

"اور آئندہ تم آنٹی نہیں کہو گی۔۔۔ میں تمہاری ماں ہوں اور رحمان باپ' ہمارے ہوتے ہوئے تمہیں کبھی کوئی میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ اس کی گیدڑ بھبکیوں پہ مت جانا۔ غصے کا تیز ہے دل کا برا نہیں۔" انہوں نے دونوں ہاتھوں کے کٹوروں میں اس کا حسین چہرہ تھاما اور پھر انہیں ٹوٹ کر پیار آ گیا تھا۔ ان کی محبت محسوس کر کے ماہ رو کو کچھ اور بھی یاد آ گیا۔

"امی!" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "عون! کہتا ہے میں زبردستی اس کی زندگی میں گھسی ہوں۔ آپ کا عون عباس بڑا بے رحم ہے۔" امی نے اسے بھی امی ہونے کا احساس کیا دلایا تھا وہ عون کی شکایتیں کھول کر بیٹھ گئی۔

"رہنے دو اس فضول آدمی کو۔۔۔ خواہ مخواہ بکواس کرتا ہے۔ تم اب نہ آتیں تو میں کسی اور طریقے سے تمہیں لے آتی۔ جب تم فریحہ سے ملنے آتی تھیں میں نے تب سے ہی دل میں سوچ لیا تھا کہ تمہیں اپنی بہو بنا کر رہوں گی۔" امی نے بڑی محبت سے اپنے شروع شروع والے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ تب ماہ رو تھوڑا حیران ہو کر چونک گئی تھی۔

"لیکن تب تو عون عباس فریحہ سے انگیجڈ تھا۔" اس کی آنکھوں میں تحیر در آیا۔ گو کہ تب وہ ٹوٹلی بے خبر تھی۔

"ضروری تھا عون کے ساتھ ہی شادی ہوتی۔ میں عاشر کے لیے تمہیں لے آتی۔" امی کے سادگی بھرے انداز پہ ماہ رو کو جھٹکا لگا تھا۔ وہ بے ساختہ ان کے سینے میں گھس کر چیخ پڑی تھی۔

"نہیں امی! عاشر نہیں بس عون ہی۔۔۔ میں عاشر کے لیے کبھی نہ آتی۔" اس کے بے ساختہ پن اور لمبی سی چیخ پہ پہلے تو امی حیران ہو کر ڈر گئیں تھیں پھر جب بات سمجھ میں آئی تو ایک دم ہنس پڑیں۔

"اچھا۔۔۔ تو معاملہ پہلے سے یہی تھا۔" ان کا انداز پر سوچ سا نا قابل فہم ہو گیا تھا۔



اس نے درختوں پہ خزاں کو منڈلاتے دیکھا اور حیران رہ گئی۔ گو کہ یہ خزاں کا موسم نہیں تھا پھر بھی درختوں کے پتے چرمرا کر گر رہے تھے۔ ٹوٹ ٹوٹ کر بے جان ہو رہے تھے بالکل اس کے دل کی طرح روکھے' خشک اور ویران تھے۔ یا پھر اس کے اپنے احساسات اور محسوسات ایسے تھے ہر چیز میں خود بخود ویرانی دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے پودوں' پھولوں' کلیوں کا رنگ روپ کملا گیا ہو۔

اس کی آنکھوں میں ریت سی بھر گئی تھی۔ آج پانچواں دن تھا۔ ہر روز ایک نیا دن نکلتا اور غروب ہو جاتا۔ ہر نئی صبح چڑھتی اور پھر ڈھل جاتی تھی۔ دن پہ

دن گزر رہے تھے۔ لیکن اس کے اندر کا موسم ہنوز وہی تھا۔ اور فریحہ کی امی کہتی تھیں تم بزدلوں کی طرح منہ چھپا کر بیٹھ گئی ہو۔ اور وہ زمانہ ساز چالاک لڑکی اس کی ایک ایک چیز پہ قبضہ جما کر پورے گھر میں دندناتی پھر رہی تھی۔ اس حال میں کہ عون تک بیچ چنگھاڑ کر بے بس ہو رہا تھا اور وہ لڑکی اپنی ہوشیاری چالاکی، خوش مزاجی سے تایا کی پوری فیملی کو مٹھی میں کر رہی تھی۔ امی نے یہ صورت حال دیکھی اور انگشت بدنداں سی فریحہ پہ چڑھ دوڑی تھیں۔

"تم اسی دڑبے میں سوگ مناتی رہو۔ اور اوپر سے آئے لوگ تمہارے ہی گھر میں اپنا سکہ جما رہے ہیں۔" امی کا غصہ اور دکھ چھلک رہا تھا۔ اور بے بسی بھی اپنی جگہ قائم دائم تھی۔ فریحہ نے تلخی سے امی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"تو میں کیا کر سکتی ہوں میرے اختیار میں کیا ہے؟ وہ ڈنکے کی چوٹ پہ عون کو چھین چکی۔ میری شادی تڑوا چکی اور اب ان لوگوں کے دلوں پہ بھی قبضہ جما رہی ہے تو پھر میں کیا کروں؟ میں کیا کر سکتی ہوں؟"

"حد ہے فریحہ! تم سا بزدل کوئی نہیں۔ بس رو دھو کر خاموش ہو گئی۔ ایک کمرے میں بند ہونے سے حقیقت نہیں بدلتی۔ آنکھیں کھول کر حالات کا جائزہ لو۔ اس کیفیت سے نکلو۔ معمولات زندگی کا حصہ بنو۔ اپنی پرانی روٹین میں آؤ۔ گھر والوں میں پہلے کی طرح گھلو ملو۔ اپنا کچن دیکھو، کوکنگ کرو۔ پہلے کی طرح تایا اور ابا کے لیے ڈشز بنایا کرو۔ جس طرح تم ہر چیز سے الگ ہو چکی ہو۔ بہت جلد تمہیں لوگ بھی بھول کر قنوطی سمجھ کے گھاس نہیں ڈالیں گے۔ ابھی سب کو تمہاری فکر ہے۔ تایا، تائی، قاسم، عاصم اور سب سے بڑھ کر عاشر۔ جو ہزار مرتبہ تمہیں سمجھا چکا ہے۔ اس فیز سے نکالنے کی ہر کوشش کر چکا ہے۔ تم بھی کچھ ہمت پکڑو اور بزدلی کا چولا اتار پھینکو۔" امی نے اس کے الجھے بالوں کو سہلا کر کنگا اٹھایا اور نہ نہ کرنے کے باوجود فریحہ کے بال سلجھانا شروع کر دیے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ اسے سمجھانے اور گھر کنے کی کوشش بھی کر رہی تھیں۔

"تایا تائی کی تو بات ہی رہنے دیں۔ ہونہہ نام نہاد محبت تھی اور نام نہاد احساس تھا۔" وہ جیسے زہر خند ہوئی۔ امی اچنبھے سے اسے دیکھنے لگی تھیں جیسے بات سمجھنا چاہتی ہوں۔

"یہ محبت تھی.... جو میرا دل اجاڑنے میں پیش پیش رہے؟ یہ احساس تھا کہ میری ہی سیج پہ کسی اور کو لا کر بٹھایا۔ اس عیاش اور غاصب لڑکی کو نہ صرف گھر لائے بلکہ سر آنکھوں پہ رکھا کسی تمغے کی طرح سجا کر تائی سینے سے لگائے پھرتی ہیں۔ اس کی حمایت میں تایا اور تائی پیش پیش رہتے ہیں۔ یہ ان دونوں کی متفقہ چال تھی۔ آپ کو نہیں لگتا ماہ رو کی دولت، حشمت کے سامنے ان کی نیتیں بدل گئی تھیں اور جو لڑکی خود ہی پکے ہوئے پھل کی طرح گود میں گر رہی تھی اسے بہت آسانی سے انہوں نے حاصل کر لیا.... دونوں اپنی اپنی گیم میں تھے۔ دونوں ہی جیت گئے بیچ میں نقصان کس کا ہوا؟ کس کا؟" شدت غم سے فریحہ چلا اٹھی تھی۔

"میرا نا؟ اور صرف میرا ہی نہیں عون کا بھی...." اس کی غرائی آواز میں شدید صدمے کی انتہاؤں کا ٹوٹ پڑتا اثر تھا۔

"عون کا؟" امی نے دھیمی آواز میں دہرایا۔

"تو کیا عون کا نقصان نہیں ہوا؟" وہ جیسے چیخ پڑی تھی۔ "وہ جو اس دن سے چلا چلا کر آپ سب کو یقین دلا رہا ہے کہ وہ بے قصور ہے۔ اس کا کوئی جرم نہیں۔ یہ تمام سازش ہے۔ آپ میں سے کسی تک عون کی آواز نہیں پہنچ رہی؟ یہ لوگ عون کی کیوں نہیں سنتے؟ کیوں نہیں سمجھتے؟ وہ باؤلا ہے؟ کیا وہ پاگل ہے؟ نہیں نا تو پھر اس کی بات کوئی کیوں نہیں سنتا اس لیے نا کہ وہ سچا ہے اور سب جانتے ہیں وہ سچا ہے۔ وہ سچ بول رہا ہے۔ اس کا ماہ رو تو کیا کسی سے بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ جھوٹی بکواس تھی۔ بہتان تھا۔ سراسر الزام تھا۔

لیکن تایا ہرگز نہیں مانے۔ کیونکہ وہ ماننا ہی نہیں چاہتے تھے۔ وہ عون کو نیچا دکھانا چاہتے تھے۔ انہیں عون کو نیچا دکھانے کا موقع مل گیا تھا۔ کیونکہ اس نے

کہا تھا۔

"فریحہ سے شادی کے بعد میں ابراڈ چلا جاؤں گا۔ وہاں پی ایچ ڈی کروں گا۔ اور کوئی ڈھنگ کی باعزت جاب کروں گا۔" تب تایا کو لگا۔ وہ واقعی ہی ایسا کرلے گا۔ دکان داری چھوڑ جائے گا۔ باپ بیٹے میں اختلافات تو شروع سے تھے۔ مزید بھی بڑھتے جارہے تھے۔ پھر تایا کو موقع مل گیا۔ عون کو ڈیل کرنے کا۔ اسے اپنے زیردست رکھنے' دباؤ میں کرنے کے لیے انہوں نے ہمیشہ اس پہ چڑھائی کی تھی۔ انہوں نے تب بھی چڑھائی کردی اور اسے ہر طرح سے ٹارچر کرکے اپنا مطلب پورا کرلیا۔

ماہ رو کا ان تک آنا ایک بہانہ تھا۔ دراصل وہ چاہتے تھے کہ ماہ رو جیسی امیر لڑکی کو عون سے بیاہ دیں۔ تاکہ اس کی دولت ان کے ہاتھ آجائے۔ ساری نہ سہی آدھی تو آجاتی۔ پھر عون کے عشق میں وہ مری بھی جارہی تھی۔ تایا' تائی کی پلاننگ خود بخود کامیاب ہوگئی تھی۔ انہیں تردد ہی نہیں کرنا پڑا تھا۔

بس یہ تھا کہ عون کو منانا مشکل تھا۔ اس کے لیے ماہ رو کا شاطرانہ ذہن بہترین چال چل سکتا تھا۔ سو ماہ رو نے اپنی گندی اور سطحی سوچ کے مطابق اپنے اوپر ہی بے ہودہ الزام لگا کر عون کو حاصل کرلیا تھا۔ کیونکہ ایسے لوگ محبت اور جنگ میں سب جائز سمجھتے ہیں۔

تو پھر بتائیں۔ اس میں عون کا کیا قصور نکلتا ہے؟ میرا دل گواہی دیتا ہے وہ سچا تھا اور سچا ہے؟ اس نے کچھ غلط نہیں کیا۔" فریحہ بات کے اختتام پہ لمبے لمبے گہرے گہرے سانس لینے لگی تھی۔ اتنی سی کوشش میں وہ تھک چکی تھی۔ ساری بھڑاس نکال دینے کے بعد "اندر" بھی خالی ہوگیا تھا۔ یوں لگا' وہ دور دور تک ہر بوجھ سے آزاد ہوچکی ہے۔ ہر غبار سے نجات مل گئی ہے۔ اور ادھر فریحہ کی امی ہکابکا رہ گئی تھیں۔ انہیں سمجھ آگئی تھی۔ ان کی ذہین بیٹی اتنے دنوں سے تکون کمرے میں بیٹھ کر سوگ منانے کے ساتھ ساتھ پوری باریکی اور گہرائی سے مشاہدہ کررہی تھی۔ سارے حالات کو ازسرنو دیکھتے ہوئے اور بھابھی بھائی جی کے ماہ رو کے ساتھ مشفقانہ رویے کو مدنظر رکھ کے انہیں سو فیصد فریحہ کی باتوں پہ یقین آگیا تھا۔ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ان کا دل تسلیم کرگیا تھا۔

"اگر آپ عون کا رویہ دیکھیں تو سمجھ جائیں۔ اس کے ماہ رو ساتھ چوری چھپے کے تعلقات ہوتے تو وہ جائز طریقے سے ماہ رو کے مل جانے پہ شادیانے بجاتا۔۔۔ خوش ہوتا' سرشار ہوتا۔ لیکن میں عون کو اندر تک سے جانتی ہوں۔ وہ حسن سے زیر ہونے والا نہیں۔ وہ دولت کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے والا بھی نہیں۔۔۔ نہ وہ ذہانت سے متاثر ہوتا ہے۔ اسے ہر چیز کو ایک طرف رکھ کر شرافت اور کردار کی پختگی سے محبت ہے۔ اسے متاثر کرنے کے لیے شرافت' نجابت' اخلاق' کردار اور سگھڑاپے کی ضرورت ہے۔

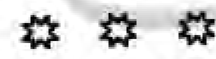
اور ماہ رو سرفراز میں یہ تمام خوبیاں سرے سے موجود نہیں ہیں۔ وہ ان چیزوں میں کوری ہے۔ تو پھر۔۔۔" وہ لمحہ بھر کے لیے رک گئی تھی۔ اس کی آواز سے آنسوؤں کی نمی کا اثر ختم ہوگیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا تاثر تھا۔ ایک عجیب سی چمک۔ فریحہ کی امی کچھ چونک گئی تھیں۔ جیسے اس چمک کو سمجھنے کے بعد بولنا چاہتی تھیں۔ پھر انہوں نے اس تاثر کو کھوج لیا تھا۔

"تو پھر یہ کہ ماہ رو کو یہاں سے کک آؤٹ ہونے میں چار مہینے بھی نہیں لگیں گے۔۔۔ وہ جیسے طوفانی انداز میں آئی تھی۔ ایسے ہی طوفانی انداز میں اڑتے ہوئے بگولوں میں لپٹتی ہوئی دفع ہوجائے گی۔ کیونکہ جہاں تک میں عون عباس کو جانتی ہوں۔۔۔ وہ اپنی ذلت کو عمر بھر بھلانے والا نہیں ہے۔ اور نہ وہ ماہ رو سے رشتہ نبھانے والا ہے۔ ماہ رو کو جانا تھا۔ جانا ہے اور وہ جاکر رہے گی۔ وہ۔ جس طرح سے میری ہر چیز پہ قبضہ جما کر بیٹھی ہے۔ میں اس کا قبضہ اکھاڑنے میں لمحہ بھی نہیں لگاؤں گی۔ چاہے مجھے جس حد تک بھی جانا پڑے۔ اور یہ اس کے اوئے کا بدلہ ہوگا۔ برابری کا حساب نہ ظلم' نہ گناہ اور نہ زیادتی۔" فریحہ کے ارادے پختہ تھے۔ انداز اٹل تھے۔ لہجہ مستحکم تھا اور آنکھوں میں کچھ کر

دکھانے کی۔۔۔ اپنی توہین کا بدلہ لینے کی چمک سانپ کی طرح پھنکارتی نظر آرہی تھی۔ فریحہ کی امی بھی دنگ رہ گئی تھیں۔ وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں پائی تھیں۔

"کیسے ہوگا؟ تم کیا کرو گی؟" ان کی آنکھوں کا سوال فریحہ کی آنکھوں تک پہنچ چکا تھا۔

"عون بے اعتبار ہو چکا ہے۔ اس کا اپنے گھر والوں پہ بھی اعتماد نہیں رہا۔ وہ خود کو اکیلا اور تنہا سمجھ رہا ہے۔ میں اس کا اعتبار واپس لاؤں گی۔ اس کا اعتماد واپس لاؤں گی۔ میں اسے یقین دلاؤں گی۔ وہ غلط نہیں۔۔۔ جھوٹا نہیں۔ برا نہیں۔ بے کردار نہیں۔ اس کے ساتھ دھوکا ہوا۔ دھوکا کیا گیا۔ میں اس کا اعتبار بحال کروں گی اور تب وہ کسی بھی ماہ رو کو بھول جائے گا۔ چھوڑ دے گا اور دیکھیے گا۔ ایسے ہی ہوگا میں ایسا ہی کروں گی۔" فریحہ کی آواز دھیمی ہو کر معدوم ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پہ سکون کی لکیر کھنچ رہی تھی۔ ایسا سکون جو فریحہ سے گم چکا تھا۔ غائب ہو چکا تھا۔ کھو چکا تھا۔ وہ اب واپس آرہا تھا۔ لوٹ رہا تھا۔



اور پھر ناموافق ہواؤں کو فریحہ نے اپنی ذہانت سے موافق کر لیا تھا۔ اب کہ مقابلہ بڑا سخت تھا۔ اگر ماہ رو کے پاس حسن کی فراوانی تھی تو فریحہ کے پاس ذہانت کا خزانہ تھا۔ گیم سخت بھی تھی مشکل بھی تھی۔ ذہانت اور حسن کا کوئی جوڑ نہیں بنتا تھا۔ لیکن یہاں دونوں کا تصادم ہونے والا تھا۔ ٹکراؤ ہونے والا تھا۔

دنیا کے کسی بھی میزان پہ حسن اور ذہانت کو اکٹھا رکھ کے تولا جاتا تو یقینی طور پر ذہانت جیت جاتی۔ حسن ہار جاتا اور یہاں حسن اور ذہانت کی آپس میں ٹھن گئی تھی۔ جیت کس کی ہوتی؟ یہ وقت پہ فیصلہ چھوڑ دیا گیا تھا۔

کیونکہ صبح بنارس جیسی ایک سویر میں فریحہ نے موتیے اور چنبیلی کی کلیاں چنتے ہوئے جاگنگ ٹریک سے لوٹتے عون کا رستہ روک لیا تھا۔

عون بالکل ایسے ہی منجمد ہو گیا تھا۔ جیسے اپنے نکاح کے وقت منجمد ہو گیا تھا۔ یا باپ کے الزامات پہ منجمد ہو گیا تھا۔ اسے یقین نہیں آیا تھا کہ فریحہ اس کے سامنے تھی اور بالکل پہلے والی فریحہ کے روپ میں سامنے تھی۔ اس کی آنکھوں میں کوئی غصہ، کوئی بے زاری، کوئی شکوہ، کوئی سوال یا کوئی نفرت نہیں تھی۔

اور اس کی حیرانگی، تعجب اور شاک کی کیفیت کو از خود فریحہ نے توڑ دیا تھا۔ وہ مسکرائی تو عون کو لگا، نسیم سحر بھی مسکرا دی تھی۔

اس نے اپنے ازلی دلکش، ٹھہرے ہوئے پرسکون لہجے میں بات کی تو یوں لگا سارے کلام ان الفاظ کے سامنے ہیچ ہیں۔ پھر اس نے اپنے لفظوں کی جادوگری کا سحر پھونکا تھا اس انداز میں کہ عون کا رواں رواں اس کا مشکور ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں مسرت اور یقین کا پہلا دیا ٹمٹمایا تھا۔

گویا خود بھی ایقان نہیں تھا کہ فریحہ اس کا اعتبار کرے گی۔ اس کا یقین کرے گی۔ اسے سچا سمجھے گی۔ اور جب فریحہ نے اپنے یقین کی سحر انگیزی سے اسے مسحور کر دیا تو عون عباس کی سرخ آنکھوں کے ڈوروں میں خوشی کی ننھی لکیر ابھر کر سامنے آگئی تھی۔

اس کے وجیہہ، سفید، بے انتہا سفید چہرے پہ حرارت اتر آئی تھی۔ خوشی، اعتبار اور اعتماد کی تپش سے اس کے رخسار پر حدت ہو چکے تھے۔ کیونکہ فریحہ کے ان الفاظ کا دنیا میں کوئی مول نہیں تھا۔ کوئی قیمت نہیں تھی۔

"میں جانتی ہوں عون! تم کیا تھے! کیا ہو! کتنے سچے تھے، کتنے سچے ہو۔ میں کل بھی تم پہ اعتبار کرتی تھی آج بھی کرتی ہوں۔" اسے اچانک ہی فریحہ کے اعتبار کا سہارا مل گیا تھا۔

پھر وہ اسے ہر گلٹ سے نکالتی گئی تھی۔ اس کے کرب، تکلیف، اذیت اور بے اعتباری کے لگے ہر ہر گھاؤ اور ہر ہر زخم پہ اعتبار، نرمی، اعتماد، بھروسے کے پھاہے رکھتی گئی تھی اور پھر چند ہی لمحوں میں وہ پرانے عون اور فریحہ بن گئے تھے۔ جیسے بیچ میں کچھ ہوا ہی نا ہو۔ پھر بہت سے لمحے سرک گئے تھے۔ وہ باتوں باتوں میں

پرانا وقت لوٹا لائی تھی۔ وہی باتیں، وہی قصے۔ معاً فریحہ کو کھٹرے کھٹرے خیال آیا۔ اور یہ خیال محض خیال نہیں تھا۔ وہ لائحہ عمل تھا جو اس کے ذہن نے تیار کر رکھا تھا۔

"عون! میں جانتی ہوں تم پچھلے بہت دن سے کھانا ناشتا باہر سے کرتے ہو۔ گھر والوں سے ناراضی ہے۔ کھانے سے نہیں آئندہ تم ہر گز ہر گز کھانا باہر نہیں کھاؤ گے۔ وعدہ کرو۔" فریحہ کے دھونس بھرے لہجے سے خائف ہو کر وہ ایسے ہی رام ہو گیا تھا جیسے کبھی بہت پہلے ہو جایا کرتا تھا۔

"وعدہ۔" عون نے بڑے تلخ ترین دنوں کی تمام تر تلخی کو جھٹک کر مسکراتے ہوئے وعدہ کر لیا تھا۔ گو کہ مسکرانا بہت مشکل مرحلہ تھا۔ اتنے دنوں کی کشیدگی کے بعد مسکراہٹ کی واپسی کچھ اجنبی بھی لگ رہی تھی لیکن پھر بھی فریحہ نے جو اسے ہفت اقلیم کی دولت دے کر۔ اسے اس کی اپنی نظروں میں سرخرو کر کے خوشی سے نوازا تھا اس مسرت اور زمانے بھر کی خوشی کے سامنے ہر چیز ہیچ اور ہیچ تھی۔

"لیکن ایک شرط بھی ہے۔" عون نے دبے دبے جوش اور سرخوشی سے کہا۔

"کون سی شرط؟" فریحہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹک گئی تھی۔

"پہلے کی طرح ناشتا اور کھانا تم بناؤ گی۔"

"صرف بناؤں گی نہیں، تمہیں کھلاؤں گی بھی۔"

اس نے اپنی بات پہ زور دیا تھا۔ عون نے کچھ کہ اثبات میں سر ہلایا تھا۔ پھر وہ مسکراتی ہوئی فریحہ کو دیکھنے لگا۔ جو ہاتھ میں موجود کلیوں کو اس کی سمت بڑھا رہی تھی۔

"اپنے کمرے میں رکھ لینا۔" اس نے یاد دہانی کروائی۔

"تم خود رکھ دینا۔ پہلے بھی تو رکھتی تھیں۔ اور اس بات کو کوئی لمبا عرصہ بھی نہیں گزرا۔" عون نے سادگی بھری دھونس سے کہا تھا۔ فریحہ نے کچھ سوچ کر جاتی بھری تھی۔ پھر اک نظر سبز دریچے پہ ڈالی۔ جس کی کھڑکی پہ سفید پھولوں کی بیلیں لدی تھیں۔ اور وہاں پہ ایک جھکتا وہ دھیا چہرہ بھی جھانک رہا تھا۔ اور اس چہرے پر تعجب، حیرانی اور دبے دبے غصے کے آثار واضح دکھائی دے رہے تھے۔ فریحہ نے ہونٹوں کے کناروں سے چھلک پڑتی مسکراہٹ کو دبا کر عون کی طرف دیکھا تھا۔ وہ تھوڑا سا گھٹنوں کے بل جھکتا ہوا فریحہ کے ہاتھ سے سفید کلی کو تھام کر بڑی عقیدت مندانہ اور تشکرانہ نظر کے ساتھ اس کی طرف موتیے کی کلی بڑھاتا بہت ملائمت سے بولا۔

"مجھ پہ اعتبار کرنے کا شکریہ فریحہ!"



سبز دریچے سے جھانکتے اس چہرے کی آنکھوں میں غصے اور ناگواری کے شعلے اڑ اڑ کر نکل رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سارے کا سارا غیض ابلتا ہوا باہر نکل آئے گا۔

اس کے چہرے پہ خفیف سی سرخی چھا رہی تھی جو پرحدت کراہٹ میں بدلتی چلی گئی تھی۔ اس نے زور دار دھماکے کے ساتھ کھڑکی کے دونوں پٹ بند کر دیے تھے۔ وہ مٹھیاں بھینچتی روم میں ٹہلنے لگی۔ رہ رہ کر وہی منظر آنکھوں کے سامنے عکس بنا رہا تھا۔ جس نے اچانک ماہ رو کو چابک مارنے جیسی تکلیف اور اذیت سے گزارا تھا۔

ٹہل ٹہل کر وہ اپنا غصہ نکال رہی تھی۔

"میرے ساتھ ایک دن بھی مسکرا کر بات نہیں کی۔ ہنس کے نہیں دیکھا۔ نرمی سے نہیں بولا۔ اور اس سابقہ منگیتر سے کیسے ہنس ہنس کر بات کر رہا تھا جیسے عمر بھر کے لیے ساری مسکراہٹیں اسے دے دینا چاہتا ہو۔ مجھ سے تو بات کرنا بھی گوارا نہیں۔" وہ چلتے چلتے اونچی آواز میں بڑبڑا رہی تھی۔

"اور اسے پھول دے رہا تھا۔ اور مجھے ایک گجرا نہیں لے کر دیا۔ ایک پتی تک نہیں دی گلاب کی اور اسے مسکرا کر موتیے کی کلیاں دے رہا تھا۔ اس قدر تعظیم کے ساتھ جیسے وہ دیوی ہو۔ اس کے چرنوں میں بیٹھنے کی کسر رہ گئی تھی۔" وہ کلس کلس کر خاک ہو رہی

تھی۔ بار بار غصے کے عالم میں بالوں کو جھٹکتی تو لمبے بالوں میں لہریں سی اٹھنے لگتیں۔

"میرے سامنے ہنستے ہوئے آگ لگ جاتی ہے کنجوس' بھوکا۔ ہنس بھی نہیں سکتا۔" اس نے آنکھوں کو مسل مسل کر بمشکل دیکھا۔ پھر بھی کچھ گیلا گیلا محسوس ہو رہا تھا۔ معاً" دروازہ کھلا اور عون گنگناتا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔ اس کے چہرے پہ ایک الوہی سی مسکراہٹ تھی۔ جسے دیکھ کر وہ اندر تک جل گئی۔

"اتنے دن سے سڑا سامنہ بنا رکھا تھا۔ آج فریحہ کیا نظر آگئی۔ منہ سے پھول گر پڑے۔" وہ اب بھی گنگنا رہا تھا اور مقام حیرت یہ تھا' ماہ رو کو دیکھ کر بھی اس کی گنگناہٹ ختم نہیں ہوئی تھی۔ ورنہ تو اس کی شکل پہ نظر پڑتے ہی عون کی تیوریاں چڑھ جاتی تھیں۔ اور آج یقیناً" یہ مسکراہٹیں اور گنگناہٹیں فریحہ کے طفیل نظر آ رہی تھیں۔ فریحہ کو دیکھ کر تاثرات خوشگوار ہو گئے تھے جیسے موسم بہار آیا ہو۔ یا صحرا میں پھول کھل گئے ہوں۔ جانے فریحہ نے کانوں میں کیا اسم پھونکا تھا۔ عون تو لمحوں میں سراپا خوشگواریت کا مرقع بن چکا تھا۔ آخر فریحہ کے سوگواریت اور غم کے دن تمام ہو گئے تھے۔ پھر گوشہ نشینی بھی ختم ہو گئی۔ اب وہ فارم میں آ رہی تھی اور یہ ماہ رو کے لیے خوشگوار عمل نہیں تھا۔

اتنے دنوں کے غیض و غضب کے بعد یہ انداز قاتلانہ دل دھڑکانے کے مترادف تھے۔ وہ جو ایک ٹک عون کو دیکھے جا رہی تھی اچانک اس کے رخ روشن کو اپنی طرف مڑتا دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ پھر ذرا گڑبڑا کر اس نے نگاہیں پھیری تھیں۔

"نظر لگانی تھی کیا؟" اس نے ٹھنک کر پوچھا۔

"نہیں تو۔" وہ گڑبڑائی۔

"تو پھر مجھے گھورنے کا مطلب؟" وہ بال کی کھال اتار رہا تھا۔ ماہ رو نے بھی چند لمحے سوچا تھا۔ پھر جیسے دل کی جلن زبان پر آگئی تھی۔

"میں تو اس مسکراہٹ کی وجہ معلوم کرنا چاہ رہی تھی۔" اس نے کچھ دیر پہلے والے منظر پہ چوٹ کرتے ہوئے کہا تھا۔ تولیے سے پسینہ پونچھتا گردن اور چہرہ رگڑتا عون کچھ چونک گیا۔

"جیسے میں تو بڑا تمہیں بتا دوں گا۔" اس نے گہرا طنز کیا۔

"بتانے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ جو کچھ آنکھوں سے خود دیکھ لیا جائے۔" وہ بھی نہ چاہتے ہوئے تلخ سی ہو گئی تھی۔ ابھی تک وہی منظر آنکھوں میں چبھ رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا۔ عون کی وہی مسکراہٹ نوچ کھسوٹ لے۔ جو کچھ دیر پہلے ماہ رو کو جلا کسلا رہی تھی۔

"او۔ تو کیا دیکھا تم نے۔" وہ کپڑے اٹھا کر واش روم کی طرف جاتے جاتے مڑ آیا تھا۔ دل تو نہیں چاہ رہا تھا صبح صبح اسے منہ لگانے کو لیکن پھر بھی۔ جواب لینا ضروری تھا۔

"جو تم دکھانا چاہ رہے تھے بلکہ خاص طور پہ فریحہ۔" اس نے چبا چبا کر کہا تھا۔ عون کی آنکھوں میں ترشی سی ابھر آئی تھی۔

"فریحہ کا کیا ذکر؟" اس نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"اور تمہیں شرم نہیں آتی فریحہ کا نام لیتے ہوئے۔"

"تمہیں شرم آتی فریحہ کو موتیے کی کلیاں دیتے ہوئے اتنے رومانٹک ہو رہے تھے۔ میرے ساتھ تو کبھی رومانس نہیں کیا۔" وہ غصے کی انتہا پہ الٹا سیدھا بولنے لگی تھی۔ یوں کہ عون کے غصے کا گراف کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ پھر اچانک پارہ چڑھتے چڑھتے نیچے آگیا۔ پہلے تو اس نے ماہ رو کے الفاظ پہ غور کیا تھا۔ پھر بلند آواز میں لاحول پڑھا۔

"او۔ تو تمہیں رومانس چاہیے۔" لحظہ بھر میں ہی اس کی تیوریوں کے سارے بل کھل گئے تھے۔ بھنویں نارمل ہوئیں۔ غصے کا گراف گرتا بالکل ختم ہو گیا تھا۔ پہلی مرتبہ ماہ رو کو یوں لگا تھا جیسے عون نے اس کی بات کو انجوائے کیا ہے۔

"میں نے یہ کب کہا میں تو۔" ماہ رو گڑبڑا گئی تھی۔ عون نے بے ساختہ اس کی بات کاٹ دی۔ وہ اسے بولنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔

"مکرنے کی کوشش نہ کرو۔ میں تمہارے الفاظ

دہرا بھی سکتا ہوں۔" وہ بھی عون عباس تھا۔ اپنے نام کا ایک ہی نکتے اور لفظ تک پکڑ لیتا تھا۔ ماہ رو کو تو اندازہ ہی نہیں تھا۔ کس ٹیڑھے بندے کے ساتھ اس کا پالا پڑا ہے۔

"اور تم میرے الفاظ کو مت پکڑو۔ جملے کے پہلے حصے پہ غور کرو۔" ماہ رو بھی موقع گنواتی نہیں تھی۔ فوراً جتا کر بولی۔

"تم فریحہ کے ساتھ اتنے رومانٹک کس خوشی میں ہو رہے تھے؟" اس کے دوبارہ دہرانے پہ عون کا موڈ پھر سے بگڑ گیا۔

"میں تمہیں جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔"

"کیوں جواب نہیں دو گے۔ میں بیوی ہوں تمہاری۔" ماہ رو کا ازلی غصہ اور اعتماد عود آیا تھا۔ حالانکہ اس نے سوچ رکھا تھا وہ عون سے کبھی لمبی بحث میں نہیں پڑے گی مگر صبح سویرے کے اس منظر نے اس کے اندر آگ بھر دی تھی۔ وہ ذرا بھی برداشت نہیں کر سکی۔

"نام نہاد۔" عون نے اس کی اوقات یاد دلائی۔

"زبردستی کی بیوی۔"

"چاہے جو بھی سمجھ لو۔ دنیا والوں کی نظر میں تو ہوں۔" ماہ رو نے اپنی بات پہ زور دے کر کہا۔

"تمہاری بیوی۔"

"تو پھر دنیا والوں کی نظر میں ہی رہو۔ مجھ سے کیا پوچھتی ہو؟ انہی سے سوال کرو، جن کی نظر میں تم میری بیوی ہو۔" اس نے اطمینان سے بالوں میں ہاتھ پھیرے تھے۔ جیسے ماہ رو کو جلا کر بہت لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسے تو اندازہ ہی نہیں تھا۔ ماہ رو کو اس انداز میں ٹارچر کرنے کا الگ ہی مزا تھا۔ اسے اذیت دینے کے نئے نئے طریقے تو اب سامنے آرہے تھے۔

"تم بات کو گھماؤ مت۔ میں فریحہ کی بات کر رہی ہوں۔" ماہ رو نے چڑ کر صوفے کے کشن اٹھا اٹھا کر نیچے مارے تھے۔ وہ اپنا غصہ کسی طرح سے باہر نکالنا چاہتی تھی۔ تب واش روم کی طرف بڑھتا عون اس کی طرف دیکھے بغیر انتہائی سرد لہجے میں بولتا اندر چلا گیا تھا۔

"فریحہ کا نام بھی مت لو۔" اس کی آواز دھیمی مگر لہجہ برف کی طرح سے ٹھنڈا تھا۔ ماہ رو کے تکیہ دبوچتے ہاتھ لحہ بھر کے لیے رکے تھے پھر اس نے تکیہ اٹھا کر غصے کے عالم میں واش روم کے دروازے سے دے مارا تھا۔

☆ ☆ ☆

اور پھر ناموافق ہواؤں کی ایسی پون چلی کی رکی ہی نا... دنوں اور ہفتوں میں ایک مرتبہ پھر فریحہ کا طوطی بولنے لگا تھا۔ ہر جگہ فریحہ فریحہ ہونے لگی۔ ہر کام کے لیے فریحہ کو آواز دی جاتی۔ اور فریحہ بھی بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو جاتی تھی۔ ہر ایک کے لیے ہر دم تیار۔ ہر ایک کی خدمت کے لیے کمربستہ جیسے سارے زمانے کے کام اسی کے ذمے ہوں۔ گھر والوں نے فریحہ کو نارمل کنڈیشن میں دیکھا تو اندر ہی اندر مطمئن ہو گئے تھے۔ ایک مرتبہ پھر گھر کے حالات معمول پہ آچکے تھے۔ اور پھر فریحہ کے مزاج بھی۔ وہ سب کے ساتھ نارمل ہو گئی۔ ہنستی کھیلتی، مسکراتی، محفل میں حصہ لیتی۔

اور ایک نہ رکنے والی روٹین لائف کی شروعات نے ہر ایک کو خاصا مصروف کر دیا تھا۔ پھر بھی رات کو دیوان عام میں لمبی محفل سجتی تھی۔ قہقہے، ہنسی، بیت بازی، شغل، ہنگامہ۔

فریحہ کو چھوڑ کر ماہ رو کے سب سے اچھے تعلقات تھے۔ بس فریحہ اور اس کی امی کے علاوہ۔ یہ دونوں ماہ رو کو گھاس نہیں ڈالتی تھیں اور ماہ رو بھی چونکہ گھاس چرتی نہیں تھی۔ اسی لیے ان کی پروا بھی نہیں کرتی تھی۔ وہ جیسے مرضی رہتیں اس کی بلا سے۔ لیکن یہ کہنے کی حد تک آسان تھا۔ وہ تب تک ہی لاپروا رہ سکی تھی جب تک فریحہ اپنے تایا، تائی اور کزنز تک محدود تھی۔ جب اس کی عنایات کا دائرہ کچھ اور پھیل کر بڑھا تب ماہ رو کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اور وہ تھی ہمہ وقت ہر ایک کی خدمت کے لیے تیار... کبھی تایا کی

آواز پڑتی۔
"فری! اٹرک سی چائے لاؤ۔ اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی ۔۔۔ مزہ آجائے۔" اور فریحہ صاحب کسی جن کی طرح فٹافٹ مزے دار قسم کی چائے لے آتی تھیں۔ ایسی خوشبودار کہ حلق سے مہک تک آنے لگتی۔ لاکھ عداوت کے باوجود ماہ رو کو تسلیم کرنا ہی پڑا تھا کہ فریحہ کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا۔

گو کہ کھانا ثنا اور مریم بھی بہت اچھا پکاتی تھیں مگر جس دن فریحہ کوکنگ کرتی اس دن گھر کا کوئی بھی مرد تین ٹائم کا کھانا مس نہیں کرتا تھا اور باہر کے کھانے سے زیادہ گھر کے کھانے کو ترجیح دیتا۔ کیونکہ صحیح معنوں میں فریحہ کے ہاتھ کا کھانا کھا کر انگلیاں چاٹ لینے کو دل کرتا تھا۔

پھر ماہ رو کو اندازہ ہوا تھا کہ فریحہ پہ گھر کی بہت ذمہ داریاں تھیں جو اس نے بخوشی اٹھار کھی تھیں۔ اس کے امی' ابا کا کام اتنا ہوتا نہیں تھا۔ زیادہ پھیلاوا تایا تائی کا ہوتا اور فریحہ بھی زیادہ وقت انہی کے ساتھ بتاتی۔ جس میں بہت سے تائی کے کام نمٹا دیتی۔

صفائی ستھرائی سے لے کر دھلائی' پکوائی سارے کام فریحہ کے ذمہ تھے۔ گو کہ کھانا پکانے سے لے کر دیگر کاموں تک باریاں بنی ہوئی تھیں۔ ہر کام باری سے ہوتا۔ ثنا' مریم اور فریحہ ہر روز باری سے کوکنگ کرتی تھیں۔ جس دن فریحہ کی باری کوکنگ کی ہوتی تھی۔ اس دن مریم صفائی کرتی' ثنا مشین لگاتی۔ جس دن ثنا کی باری کوکنگ کی ہوتی اس دن بھی باقی کام مریم اور فریحہ میں تقسیم ہو جاتے تھے۔

کیونکہ نوکر کا اس گھر میں رواج نہیں تھا۔ اور نوکرانی اس لیے نہیں رکھی جاتی تھی کہ گھر کی باتیں باہر نوکروں کے ذریعے نکلتی تھیں سو تایا کو پسند نہیں تھا گھر میں کوئی ملازمہ رکھی جائے۔

چونکہ گھر کی مستورات کافی ایکٹو تھیں اس لیے کاموں کا کبھی مسئلہ نہیں ہوا تھا۔ اوپر سے فریحہ جیسی چست اور سگھڑ لڑکی کے ہوتے پرابلم کیا تھی۔

وہ تایا کے گھر کا ہر ہر کام اپنا سمجھ کے کرتی تھی۔

چونکہ ایک جگہ رہائش تھی سو صفائی تک اکٹھی ہو جاتی۔ اور اوپر کے کام فریحہ کے ذمے تھے۔

ثنا اور مریم اپنے اپنے شوہروں کا کام احسن طریقے سے انجام دے لیتی تھیں۔ تائی کے باقی بیٹوں کا ہر کام فریحہ کے کندھوں پہ تھا۔ عون' عاشر' یاسر' عامر کے کپڑوں کی دھلائی' ان کے کمرے کی صفائی۔ کپڑوں کو استری کرنا الماریوں میں پہنچانا۔ یہ سب کام فریحہ کرتی تھی۔ کائنات کے اوپر ابھی کوئی بوجھ نہیں تھا۔ اور نہ فریحہ کائنات کو کسی کام کے لیے بلوانے دیتی تھی۔ وہ خود جو آگے آگے تھی۔

یہاں تک کہ اس کی خدمات کو دیکھ کر تایا یہ تک کہنے پہ مجبور ہو جاتے۔

"عون میری فریحہ کے قابل ہی نہیں تھا۔ اس کے لیے تو میں نے کچھ اور سوچا تھا۔" اور جب وہ فریحہ کی سر پہ ہاتھ رکھ کر یہ الفاظ دہراتے تب وہ تکلیف کی شدت سے آنکھیں میچ لیتی تھی۔

"آپ کو کیا خبر تایا! عون ہی تو میرے قابل تھا۔ مجھے کسی اور کی چاہ نہیں تھی۔" فریحہ کے اندر تک اذیت کا زہر بھر جاتا تھا۔ اور وہ دانت پیس کے ہونٹ چبا چبا کر ماہ رو کو دیکھتی اور گھورتی تھی۔ کبھی کبھی ماہ رو نیل فائل کرتی' میگزین دیکھتی' فیشن شو انجوائے کرتی اس کی نظروں سے سخت خائف بھی ہو جاتی تھی۔

"اف کیسی تیکھی نظریں ہیں۔ پہلے تو ایسے نہیں دیکھتی تھی۔" ماہ رو گھبرا سی جاتی تھی۔ اسے یہ پتا ہونا چاہیے تھا کہ پہلے حالات ایسے نہیں تھے اور نہ وہ اس کی جگہ یہاں موجود تھی۔ نہ تب اس نے فریحہ کی شادی تڑوائی تھی۔ یوں ہی فریحہ نے ایک مرتبہ پھر اپنی پوزیشن اس گھر میں بلکہ اپنے ہی گھر میں مضبوط کر لی تھی۔ جس طرح شادی ٹوٹنے سے پہلے مستحکم تھی۔

اب بھی صبح صبح فریحہ کے نام کی پکار کانوں میں پڑتی تو دل چاہتا کانوں میں روئی ٹھونس لے۔ تکیہ سر کے اوپر رکھ لے۔ منہ کسی گدے میں گھسا لے۔

یاسر' عاشر' عامر چیخ چیخ کر فریحہ کو صبح صبح آواز لگاتے۔

"فریحہ! میری ٹائی؟"
"فریحہ! میرا بیگ؟"
"فریحہ! میری بکس؟"

پھر جب ان آوازوں میں ایک اور آواز بھی شامل ہونے لگی تب صحیح معنوں میں ماہ رو کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ دماغ تیز ہوا تھا اور ہاتھوں پیروں میں حرکت آ گئی تھی۔

وہ جو گھر کے ہر کام ہر مصروفیت اور ہر قسم کے معمولات سے الگ تھلگ تھی ایک دم چونک سی گئی گو کہ عون کی امی خود اسے ہر کام سے دور رکھتی تھیں لیکن ماہ رو کو لگ رہا تھا۔ یہ دوری کسی لمبی دوری کا شکار نہ ہو جائے۔ کیونکہ فریحہ نے ہر ایک کی روٹین پہ اپنے نام کا سکہ جما لیا تھا۔

پھر جاب چھوڑ کر تو اس نے تایا اور تایا زاد (عون) کا دل جیت لیا تھا۔ وہ آتے جاتے کئی مرتبہ جتاتا۔ خوش بھی ہوتا۔ اور فریحہ اس کی توجہ پا کر کھل کھل کے گلاب ہو جاتی تھی۔ اور تب ماہ رو کا دل جل جل کے خاک ہو جاتا۔ ایسی ہی کئی طرح کی انتہائی قابل اعتراض (ماہ رو کی نگاہ میں) صورت حال پہ ماہ رو اپنے صبر اور برداشت کی حد کراس کر کے عون سے لمبی لمبی لڑائیاں کر چکی تھی اور بجائے عون وضاحت دینے کے شرمندہ ہونے کے الٹا شیر بن کر اسے دہاڑتا اور بھگو بھگو کر مارتا۔

"بقول تمہارے ڈیڈ کے میں تو ہوں ہی برا' بد' بدنام ... سو' مجھے اپنی خوبیوں پہ بڑا ناز ہے۔ اور یہ الفاظ میرے لیے اعزاز ہیں... میں جو ہوں جیسا ہوں۔ اچھا ہوں تم جو مرضی کہو۔"

"میں تمہارے ابو کو بتاؤں گی۔" وہ زچ ہو کر چڑ کر اسے دھمکاتی تھی۔

"بڑے شوق سے۔ وہ آل ریڈی مجھے' کمینہ کہتے ہیں۔" عون کو جیسے پروا ہی نہیں تھی۔ فریحہ نے اسے نہ کیا لگا لیا تھا وہ پہلا والا سارا غصہ لڑائی' غیض' ناراضی سب کچھ بھول بھال کے محض طنز کے تیر چلاتا ۔ اسے جلاتا' کلساتا' طعنے مارتا سب کے سامنے ذلیل کرتا تھا۔

اور یہ تو ماہ رو کو بہت بعد میں پتا چلا تھا۔ شادی کے اولین دنوں کا غیض غضب' دکھ' غصہ محض فریحہ کے سمجھانے' بجھانے اور "برین واشنگ" کرنے کے بعد ذرا ہلکا پڑ گیا تھا۔ کیونکہ کسی اور کی بات سمجھتا یا نہ سمجھتا' فریحہ کی بات ضرور سمجھ لیتا تھا۔ مان بھی لیتا تھا اور عمل بھی کر لیتا تھا۔

اور ابھی تو اسے یہی خماری بہت تھی کہ فریحہ نے اسے ناکردہ جرم کی سزا نہیں دی تھی۔ اس پہ اعتبار کیا تھا۔ اس کا اعتماد بحال کیا تھا۔ اور وہ ایک مرتبہ پھر اپنے گھر والوں کے سامنے گردن تان کے چل سکتا تھا۔



جو کام دماغ کر سکتا تھا اس کے لیے ہتھیار کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

اور جو کام ذہن کر سکتا تھا۔ ذہانت کر سکتی تھی اس کے لیے حسن کی بھی قطعاً" ضرورت نہیں تھی۔ سو فریحہ نے اپنی ذہانت سے وہ کام کر لیا تھا جو ماہ رو کا شعلہ بیاں' ضو فشاں حسن بھی نہیں کر سکا۔ فریحہ نے بڑے طریقے سے' عقل مندی سے' سمجھ داری سے عون کے گرد اپنا حصار کھینچ لیا تھا۔ ایسا حصار جو عام لوگوں کو کبھی دکھائی نہ دیتا اور شاید ماہ رو کو بھی کبھی دکھائی نہ دیتا۔ اگر اسے ثنا متوجہ نہ کرتی۔ ورنہ ماہ رو میں ایسی سمجھ بوجھ ہرگز نہیں تھی۔ اپنی عقل سے وہ کام نہیں لیتی تھی اور سمجھ داری اس میں سرے سے تھی ہی نہیں۔

عون کے معمولات اور زندگی پہ فریحہ کی بڑھتی ہوئی اجارہ داری کو دیکھ کر کوئی اور چونکتا یا نہ چونکتا ثنا ضرور چونک گئی تھی۔ کیونکہ اس سویر بھی ماہ رو ابھی اپنی روٹین کے مطابق گھوڑے گدھے بیچ کر سو رہی تھی جب ثنا اس کے روم میں آ گئی۔ گو کہ وہ اتنی صبح کبھی اس کے کمرے میں نہیں آئی تھی۔ لیکن اس دن الگ بات تھی۔

پھر ثنا کو ماہ رو کی نیند توڑتے ہوئے دانتوں پسینہ آ گیا

تھا۔ ایسی ڈھیٹ نیند اس نے عمر بھر کبھی کی نہیں دیکھی تھی۔ اور واقعی اسے عون کی بات پہ یقین آگیا تھا۔ جو وہ امی کو اونچی آواز میں بتا رہا تھا۔

"اسے جگا لینے کا کارنامہ سرانجام دینے والا ایوارڈ کا حق دار ہے۔۔۔ اس ڈھیٹ کی ڈھیٹوں جیسی نیند ہے۔" اور ابھی ثنا کو واقعی عون کے تبصرے پہ یقین آ گیا۔

جب وہ اس کو جگانے میں ناکام ہو گئی تب اس کے بجتے سیل کو اٹھانا پڑا تھا۔ ماہم کالنگ لکھا آ رہا تھا۔ ثنا نے کال پک کر لی تھی۔ پھر حال احوال پوچھ کر اس نے ماہ رو کا پوچھا۔ ثنا کی پریشانی کو سن کر ماہم بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔ پھر اس نے ماہ رو کو جگانے والا ٹرک بتا دیا تھا جسے اپلائی کرتے ہی ماہ رو بے ساختہ اٹھ گئی تھی۔ اس کے پیروں پہ ٹھنڈا پانی ڈالنے کی دیر تھی وہ اسپرنگ کی طرح اچھل پڑی تھی۔ پھر جیسے ہی حواس ٹھکانے آئے ثنا نے مزید اس کے طبق روشن کیے تھے۔

"اٹھو اور باہر آؤ۔ اپنے شوہر کو ناشتا کراؤ۔۔۔ وہ پھر کسی مہم پہ نکلنے والا ہے۔۔۔ اور ابو کو سخت غصہ تھا۔ کیونکہ عون آج کل پلازہ بالکل نہیں جا رہا۔" ثنا نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اسے اور بھی تفصیلات بتائی تھیں جنہیں وہ با آسانی سمجھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ بالکل سیدھی، پریشان اور کچھ کچھ گھبرائی۔

"عون کہاں جاتا ہے؟"

"یہ تو تمہیں پتا ہونا چاہیے۔ آخر تم اس کی بیوی ہو۔" ثنا نے اسے گھرک کر کہا۔

"لیکن مجھے نہیں پتا۔" وہ گھبرائی تھی۔

"تو پھر فریحہ سے پوچھ لو۔ اسے تو پوری خبر ہو گی۔" ثنا نے طنز کیا۔

"وہ فریحہ کو بتاتا ہے مجھے نہیں۔" وہ اداس ہوئی تھی۔ ثنا نے جیسے سر پیٹ لیا۔

"اور یہ تمہاری کمزوری ہے۔"

"پھر میں کیا کروں؟" ماہ رو ہونق سی ہو گئی تھی۔

"ایک بیوی کو کیا کرنا چاہیے؟" ثنا نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ تب وہ تھوڑا جھینپ کر مسکرائی تھی۔

"مجھے نہیں پتا؟ پہلا تجربہ ہے۔"

"اور ہمارے تو چوتھے چوتھے تجربے ہیں نا گھامڑ! محبت کر لی۔ اسے سنبھالنا نہ آیا۔" ثنا نے اس کی اچھی خاصی کلاس لے لی تھی۔

"تو پھر کیا کروں؟" ماہ رو کوئی مخلصانہ مشورہ چاہتی تھی اور ثنا نے اسے بڑے کام کے اچھے اچھے مشوروں سے نوازا تھا۔ جس میں شوہر کو سمجھانا، محبت سے گھائل کرنا اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے بہت سے طریقے تھے۔

ماہ رو نے ایک ایک بات سمجھ لی تھی۔ لیکن لبھانے اور گھائل کرنے کی نوبت آنے سے پہلے ہی عون نے اس کی لمبی سی کلاس لگائی۔ جس میں اسے ہڈ حرام، کام چور، کاہل، سست اور نجانے کیا کیا کہا گیا تھا۔ عون نے اپنی امی سے کہا۔

"آپ اس کو کچن میں گھسائیں۔ کھانا پکوائیں۔ کام سے لگائیں اسے۔ اگر آپ یہ کام نہیں کر سکتیں تو میں بہت اچھی طرح سے کام کروانا جانتا ہوں۔ یہ مہارانی پلنگ توڑ توڑ کر نہیں تھکتی۔ اور اس کے حصے والے کام فریحہ کو کرنے پڑتے ہیں۔ اور مجھے بہت برا لگتا ہے۔"

اس وقت فریحہ بھی وہاں موجود تھی اس نے فوراً بھرائی آواز میں سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"تمہیں کیوں برا لگتا ہے؟ کیا میں پہلے تمہارے، عاشر یاسر کے کوئی کام نہیں کرتی تھی۔" اس کی جذباتی بلیک میلنگ نے عون اور تائی کو شرمندہ کر دیا تھا۔

"میری بات کا یہ مطلب نہیں۔" عون گڑبڑا گیا۔

"مطلب جو بھی ہو۔ کیا میرا حق تم پہ ختم ہو گیا۔" وہ رو رہی تھی۔ تائی اور عون گھبراتے رہے۔

"ہرگز نہیں۔" عون نے بوکھلا کر کہا۔

"تو پھر مجھے مت روکو۔ مجھے تمہارا اور یاسر سب کا کام کر کے دلی سکون ملتا ہے۔" فریحہ کے سوں سوں کرتے لہجے پہ ماہ رو کو اس کی ڈرامہ بازی اور ایکٹنگ پہ یقین آ گیا۔

"کیا پتا وہ خود کو مصروف رکھنے کے لیے کام کرتی ہو۔ مجھے غلط نہیں سوچنا چاہیے۔"

✡ ✡ ✡

"تمہارے کام کا کیا بنا؟" عون کے سامنے کھانے کی ٹرے رکھتے ہوئے فریحہ نے بڑی ملائمت اور کسی حد تک تفکر سے پوچھا تھا۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ پلانہ نہیں جارہا تھا۔ وہ کہاں جارہا تھا؟ صرف فریحہ کو پتا تھا۔ گھر میں کوئی اور نہیں جانتا تھا۔ اور نہ ہی عون نے کسی اور کو بتایا تھا۔ وہ پہلے کی طرح بس فریحہ تک محدود ہو چکا تھا۔

تایا بھی عون کے نہ آنے پہ شدید غصے میں تھے اور اسی بات پہ گھر میں خوب لڑائی ہو رہی تھی۔ تایا نے اعلان کردیا تھا۔

"تم نے اپنے حصے کا کام نہ کیا تو ایک دھیلا بھی نہیں دوں گا۔ جو کام کرے گا وہی پیسے لے گا۔" اور تب عون نے انہیں بڑے ٹھوس انداز میں بتایا۔

"تو نہ دیں۔ مجھے ضرورت بھی نہیں۔۔۔ میں جاب ڈھونڈ رہا ہوں۔"

اس وقت تایا اور عون کی پھر لڑائی ہوئی تھی اور جو بڑھتے بڑھتے اس نوبت تک بھی لے گئی تھی جس تک فریحہ کا تصور بھی نہیں تھا۔ لیکن اس سے پہلے یوں ہوا۔

فریحہ بڑی بے چینی سے عون کی جاب کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ روزانہ جاتا اور روزانہ ناکام لوٹتا تھا۔ لیکن اس دن عون کا چمکتا چہرہ اس کی کامیابی کا پیغام دے رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اور اپنی خوشی سب سے پہلے فریحہ تک پہنچا رہا تھا۔ سب سے پہلے فریحہ کو بتا رہا تھا۔

"جاب مل گئی اور بہت اچھی مل گئی۔۔۔ میری توقع سے بھی بڑھ کے۔" عون نے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا تھا۔

"دیکھ لو' میری دعاؤں کا نتیجہ۔" فریحہ یہاں بھی کریڈٹ لیے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ عون نے بھی اسے پورا کریڈٹ دے دیا تھا۔

"آف کورس۔" وہ مسکرا دیا تھا۔ اور اس دن عون نے بڑی ہی رغبت سے کھانا کھایا۔ ہال کے دروازے میں اچانک آتی ماہ رو ٹھٹک گئی تھی۔ عون کی مسکراہٹ اور فریحہ کے فدویانہ انداز اس کے اندر جلاپا سالگا گئے تھے۔ اس کا دماغ جیسے گھوم گیا تھا۔ وہ الٹے قدموں بھاگتی ہوئی واپس چلی گئی تھی۔ اور اس کے دماغ میں سوچوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔

"یہ فریحہ بھی نا ہر جگہ' ہروقت' ہر لمحے۔۔۔ کیا یہ عون کو پھر سے تو نہیں لبھا رہی؟" شک کا کانٹے دار ناگ پھن پھیلاتا آیا تھا۔ اور ماہ رو کو پوری شدت کے ساتھ ڈس گیا۔ وہ جیسے نیل نیل ہو گئی تھی۔ اسے کیا کرنا چاہیے تھا؟ اسے فریحہ کو کیسے روکنا چاہیے؟ صبح تک وہ پوری پلاننگ کر چکی تھی۔

اگلی صبح الارم نے نہیں بلکہ ثنا نے اسے پانی کے ٹھنڈے چھینٹوں والے حربے سے جگا لیا تھا۔ پھر اشارے سے اسے باہر کھینچ کر لے آئی۔ عون برابر ہی بیڈ پہ سو رہا تھا۔ کیونکہ اب وہ صوفے سے بیڈ پہ منتقل ہو چکا تھا۔ ماہ رو آنکھیں مسلتی ثنا کے ساتھ ہی کچن میں آ گئی تھی۔ کچن میں گرما گرم ناشتا تیاری کے آخری مراحل میں تھا۔ چنے پک چکے تھے۔ پراٹھے بیلنے تھے اور آملیٹ کا آمیزہ بھی بنا ہوا تھا۔

رات کو ماہ رو کے رونے دھونے سے متاثر ہو کر ثنا نے بڑی اچھی سی تجویز دی تھی جو ماہ رو کو بھی پسند آ گئی۔ چونکہ پکانا تو اسے آتا نہیں تھا۔ البتہ وہ سرو ضرور کر سکتی تھی۔ ثنا نے اسے یہی کہا تھا کہ وہ احتیاط سے سرو کرے اور عون کو کھانے پہ مجبور بھی کرے۔

کچھ ہی دیر میں چنے بھی تیار ہو گئے تھے۔ ماہ رو نے انہیں شیشے کی رکابی میں ڈال لیا تھا۔ ثنا پراٹھے تل رہی تھی۔ اور ساتھ ساتھ ماہ رو کو سمجھا رہی تھی۔

"اب لگ رہی ہو عون کی بیوی۔۔۔ جب تک بیوی بن کر نہیں دکھاؤ گی وہ تمہیں بیوی نہیں سمجھے گا۔" ثنا کی ہر نصیحت ماہ رو دھیان سے سنتی تھی اور اب عمل کرنے کا بھی پکا ارادہ کر لیا تھا۔ کیونکہ اب اسے لگ رہا تھا کہ ناؤ کسی بھی لمحے طوفانی موجوں کی زد میں آکر غرق

ہو سکتی تھی۔

فریحہ کا عون کی طرف بڑھتا حصار اور عون کا نظر آتا چونکا تا التفات ماہ رو کا دل بری طرح سے دھڑکا گیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اسے ہاتھ پیر ہلا لینے چاہییں۔ اس کے لیے وہ کیا کر سکتی تھی؟ وہی کچھ جو فریحہ کر رہی تھی؟ اور جس سے فریحہ نے گھر کے ایک ایک فرد کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ عون کو بھی باندھ رکھا تھا۔ عون کو سگھڑ لڑکیاں پسند تھیں۔ ماہ رو نے سگھڑ بننے کا عہد کر لیا تھا۔ کام مشکل تھا۔ لیکن اتنا بھی نہیں۔ اور جب انسان کچھ بھی کرنے کا ارادہ کر لیتا تھا۔ پھر تو کوئی رکاوٹ، رکاوٹ نہ رہتی۔

اور اس وقت تنا ایک اچھی سی ٹرے سجا کر اسے روم کی طرف بھیج رہی تھی۔ ٹرے میں عون کا من پسند ناشتا سجا تھا۔ چنے، پراٹھے اور چیز آملیٹ۔

ماہ رو جب کمرے میں آئی تو عون نہ صرف اٹھ چکا تھا بلکہ جاب پہ جانے کے لیے تیار بھی ہو چکا تھا۔ اب یقیناً" وہ ناشتا کرنے باہر جاتا۔ لیکن آج کچھ انوکھا ہو گیا تھا۔ عون کا ناشتا کمرے میں آگیا۔ وہ ناشتے کو دیکھ کر تو نہیں البتہ لانے والی کو دیکھ کر ایسا دنگ ہوا کہ کیا ہی کہنے۔۔۔ اس کا منہ بھی تھوڑا کھل گیا۔۔۔ اور پھر اس نے۔

"او میرے اللہ! میرے معدے پہ رحم کرنا" جیسے الفاظ کہہ کر ماہ رو کو ذرا خفا کر دیا تھا۔

"بہت اچھا ناشتا لائی ہوں۔" اس نے ٹرے سینٹرل ٹیبل پہ رکھ دی تھی۔ عون نے کھڑے کھڑے ہی ٹرے پہ نگاہ ڈالی۔

"اچھا۔۔۔ تو رومانس کے حصول کی خاطر اب یہ حربے آزمائیں جائیں گے؟" اس نے بڑی معصومیت سے پچھلی بات کا حوالہ دے کر طنز کیا تھا۔ بڑا لطیف سا طنز تھا۔ ایسا دل جلانے والا لہجہ نہیں تھا۔ ماہ رو نے لمبی سی جمائی کو بمشکل عون کے سامنے روکا تھا۔ پھر ذرا خفگی سے کہا۔

"اگر رقیب یہ کام کر سکتے ہیں۔۔۔ التفات کے حصول کے لیے تو پھر میں کیوں نا کروں؟" عون اس

کے جواب پہ بڑا متاثر ہوتا دکھائی دیا تھا۔ جیسے ماہ رو سے ایسی ہی کسی جواب کی توقع رکھتا تھا۔

"اچھا۔۔۔ تو اب رقیبوں کا مقابلہ کرو گی؟ پھر بھی ویسا بن نہیں سکو گی۔" اس نے پھر سے ماہ رو کو کلسانا چاہا۔

"میں ویسا بننا بھی نہیں چاہتی میری الگ پہچان ہے۔" ماہ رو نے خاصے ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ صبح صبح لڑائی کا موڈ نہیں رکھتی تھی۔

"پہچان تو بہت ہے۔ ابھی خاندان کی کسی شادی میں چلی جاؤ۔۔۔ لوگ انگلیاں اٹھا اٹھا کر اشارے کریں گے۔ ارے یہ وہی تھی۔۔۔ عون کی محبوبہ۔ اس کی عاشق۔" عون کے لہجے میں تلخی بھرتی چلی گئی تھی۔ ماہ رو کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"میری طرح کے لوگ بھی کوئی کوئی ہوتے ہیں۔" اس نے بکھرتے اعتماد کو بمشکل بحال کرتے ہوئے کہا۔ عون کے لبوں پہ طنزیہ ہنسی پھیل گئی تھی۔

"یہ تو بالکل ٹھیک کہا۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ تم اپنی طرز کا پہلا اور آخری پیس ہو۔"

"اور تمہاری قسمت اچھی تھی جو تمہارے نصیب میں آگئی۔" ماہ رو نے بڑے ہی انداز میں جتایا تھا۔ جیسے وہ عون کو نہ ملتی تو بے چارے کی زندگی میں بہت بڑا خلا رہ جاتا۔

"بڑی خوش فہمی ہے تمہیں اپنے بارے میں۔" عون مصنوعی قسم کا متاثر ہوا تھا۔

"بالکل ٹھیک فہمی ہے۔ اسے خود آگاہی کہتے ہیں۔" ماہ رو نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔

"بائی دا وے 'اس تردد کی کیا ضرورت تھی؟" اس کا اشارہ ٹرے کی طرف تھا۔ ماہ رو نے کندھے اچکائے۔

"یہ میرا فرض تھا۔"

"بڑی جلدی فرائض یاد آگئے؟" عون نے ناک بھوں چڑھا کے ٹرے کا جائزہ لیا تھا۔ گرما گرم چنے چھول 'خستہ بل دار پراٹھے' چیز آملیٹ۔۔۔ لگتا نہیں تھا کسی کے اناڑی ہاتھوں کی محنت ہے۔ ادھر وہ ٹرے کا پوسٹ مارٹم کر رہا تھا۔ ادھر ماہ رو نے بڑے ہی انداز میں سوچتے ہوئے کراکٹ دار طنز کیا۔ یوں کہ پہلی مرتبہ ماہ رو کو لگا تھا عون لاجواب ہو گیا ہے۔ اس نے خاصے جارحانہ لہجے میں کہا۔

"اور تمہیں حقوق اب بھی یاد نہ آئے۔" تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ بات کر لینے کے بعد اسے خیال گزرا کہ اس نے کون سی بات کہہ دی ہے۔ کیونکہ عون نے ایسے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا تھا جیسے ماہ رو سے ایسی برجستگی کی توقع نہ ہو۔ اب وہ یہاں سے بھاگنے کے پر تول رہی تھی۔ جوں ہی الٹے قدموں اس نے پلٹنا چاہا تھا پیچھے سے عون کی آواز آئی۔

"بائی دا وے میں تمہاری اس کاوش کو رائیگاں نہیں کروں گا۔ ناشتا بہت اچھا ہے لیکن تمہارے ہاتھ کا نہیں۔ اگر اٹھا کر میرے تک لانے کا کریڈٹ لینا چاہتی ہو تو بخوشی لے سکتی ہو۔" عون لمحہ بھر کے لیے طنز کرتے کرتے رکا۔

"اور یہ بھی کہ جب ثنا تمہاری ڈھیٹ نیند کو توڑنے کے لیے ٹھنڈا پانی ڈال رہی تھی۔ اور تم اسپرنگ کی طرح اچھل کر اس کے ساتھ چلی گئی تھیں میں تب ہی سمجھ گیا تھا تم کسی سازش کے لیے جا رہی ہو۔ کیونکہ سازشوں میں واقعی ہی تمہاری ٹکر کا دوسرا کوئی نہیں۔" اس نے حقوق اور فرائض والی بات کو گول کر کے ماہ رو پہ چڑھائی کر دی تھی۔

اور ماہ رو پہ جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ وہ خوامخواہ دروازے پہ غصہ اتارتی زوردار دھماکے سے بند کرتی باہر نکلتے ہوئے زیر لب بڑبڑائی تھی۔

"چالاک نہ ہو تو۔"

اور جب فریحہ ناشتا بنا کے راہداری تک پہنچی اور اپنے مخصوص لہجے میں۔

"عون 'عاشر' یاسر ناشتا کر لو" کہا تو داخلی دروازے سے آفس کے لیے باہر نکلتا عون ٹھٹک کر رک گیا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر پلٹ آیا تھا۔ اخلاق کا تقاضا تھا کہ فریحہ کو بتا کر جاتا۔ آج اس نے ذرا ٹائم سے پہلے ہی ناشتا کر لیا تھا کیونکہ آج اس نے تھوڑا جلدی آفس پہنچنا تھا۔

اور یہ تو نجانے ماہ رو کو کیا خیال آیا تھا جو ثنا سے ناشتا بنوا لائی تھی ورنہ وہ آج شاید بھوکا ہی آفس جاتا۔

کیونکہ فریحہ تو اپنے ٹائم پہ ناشتے کے لیے آتی تھی۔ اور اسے اندازہ ہوتا تھا کس نے کس وقت پہ جانا ہوتا ہے۔ عون کو لش پش دیکھ کر فریحہ حیران ہو گئی۔

"تم جلدی جا رہے ہو؟ وہ بھی ناشتا کیے بغیر؟" اس کا تفکر قابل دید تھا۔ اور جو ماہ رو بھاگم بھاگ عون کو خدا حافظ کہنے کے لیے پورچ تک جانا چاہتی تھی ان کی گفتگو سننے کے لیے رک گئی تھی۔ تھوڑا اوٹ میں ہو کر اس نے کان لگا لیے تھے۔

"میں ناشتا کر چکا ہوں۔" عون نے مسکرا کر بتایا تھا۔

"اس کمینی کے لیے عون کے پاس ہنسی کا پورا خزانہ محفوظ تھا۔" ماہ رو کو بے پناہ جلن ہوئی تھی۔ "میرے لیے تو موتا بھی نہیں مسکراتا۔"

"کس نے کرایا؟" فریحہ کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ سوچ کا بھی بڑا شدید قسم کا تھا۔

وہ ماہ رو کا نام لیتے لیتے لمحہ بھر کے لیے رک گیا تھا۔ وہ بھی دل ہی دل میں خوش ہوئی تھی ابھی وہ اس کا نام لے گا اور فریحہ جل بھن کے کوئلہ ہو جائے گی۔ پھر خود بخود عقل مند ہوئی تو ہٹ جائے گی۔

"ثنا نے بنا دیا تھا۔" عون کے بتانے پہ فریحہ نے لمحہ بھر کے لیے بھنویں سکیڑیں تھیں پھر ذرا سا مطمئن ہو کر مسکرا دی۔

"ٹھیک ہے، لیکن شام کو جلدی آ جانا۔ باہر سے کچھ مت کھانا۔ میں اچاری بریانی بناؤں گی۔" عون کو یاد دہانی کروا کے وہ مسکراتی ہوئی داخلی دروازے تک اسے چھوڑنے کے لیے چلی گئی تھی۔ جبکہ ماہ رو وہیں اوٹ میں لمحہ بھر کے لیے فریز ہو گئی۔ اسے رہ رہ کر عون کے الفاظ پہ تاؤ چڑھ رہا تھا۔

"ثنا نے بنا دیا تھا۔" وہ عون کے لہجے کی نقل اتارتی شدید غصے کا شکار تھی۔

"میرا نام لیتے ہوئے موت آتی تھی یا پھر مہارانی کی ناراضی کا خدشہ ہو گا۔ مر مرا کے تو صلح ہوئی تھی۔ سوچتا ہو گا۔ شہزادی صاحبہ پھر نہ ناراض ہو جائے۔ فریحہ تو سوگ میں ہی بہتر تھی۔ سوگ سے نکل کر مجھے سوگوار کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑاتی تن فن کرتی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

شام تک ماہ رو کا صبح والا غصہ اتر چکا تھا۔ وہ ایک لمبی، میٹھی اور پرسکون نیند لے کر اٹھی اور ٹھنڈے پانی سے باتھ لے کر فریش ہو گئی تھی۔ معاً ماہم کی فون کال آ گئی تھی۔ وہ اسے ہرجائی، بے وفا اور نجانے کیا کیا لقب دیتی گالیوں سے نواز رہی تھی۔ ماہم کو غصہ تھا اس نے ایک کال تک کرنا گوارا نہیں کی تھی۔ اب وہ ماہم کو کیا بتاتی؟ وہ عون کے پیار میں گم شدہ ہرگز نہیں تھی بلکہ عون کو فریحہ کے چنگل سے آزاد کروانے میں ڈیڈی تک سے لاپروا ہو چکی تھی۔

ماہم کو اندرونی صورت حال سے آگاہ کیے بغیر اس نے مصروفیات کا فضول سا رونا رو کر کچھ دیر مزید بات کرنے کے بعد فون بند کر دیا تھا۔ خدا حافظ کہنے سے پہلے اس نے یہ بھی کہا تھا اگر عون مان گیا تو وہ آج ہی چکر لگائے گی۔ اب وہ وارڈ روب کھول کے ایک ایک

ڈریس کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کے بڑے خوب صورت شیفون کے امبرائیڈڈ سوٹ بھی لٹک رہے تھے۔ کچھ سوچ کر اس نے ڈارک بلیو کلر کا سوٹ نکال لیا تھا۔

اور پھر شادی کے بعد پہلی مرتبہ وہ بھرپور انداز میں تیار ہوئی تھی۔

بہت دفعہ عون کی امی کے کہنے پہ بھی وہ افسردہ سا جواب دے دیتی۔

"کیا فائدہ امی! جب کسی نے دیکھنا ہی نہیں۔" تب امی اسے ڈپٹ کر خفگی سے کہتیں۔

"عون تو دیکھے گا۔ کسی اور کو دکھانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔" وہ شاید سمجھی نہیں تھیں۔ اسی لیے سادگی سے بولیں۔ اب ماہ رو کیا وضاحت دیتی کہ عون ہی نے تو دیکھنا نہیں تھا۔ بلکہ ہو سکتا عین گمان تھا۔ طنز کے تیر چلانے لگتا۔

"بن سنور کر کسے دکھانا چاہتی ہو؟ مجھ سے امید مت رکھنا۔ فضول میں جھوٹی تعریفیں نہیں کر سکتا۔"

عون سے ایسے الفاظ کی توقع تھی۔ پھر وہ کیوں اتنا تردد کرتی۔ گھر میں کرتے ٹائٹس پہنتی تھی۔ گلے میں اسٹول وغیرہ لٹکا لیتی۔ جو اکثر کندھوں سے پھسلتا ہوا زمین کو سلامی دے رہا ہوتا تھا۔

عون کو اس کی ہر قسم کی ڈریسنگ پہ اعتراض رہتا تھا۔ وہ اس کے کسی بھی لباس کو شریفانہ لباس نہ سمجھتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ امی کے سامنے ٹوکتا نہیں تھا اور نہ آج کل ابو کے سامنے ماہ رو سے جھگڑا کر رہا تھا۔ نہ اسے برا بھلا کہتا تھا۔ نہ دوبارہ طلاق لینے پہ مجبور کیا تھا۔ اور نہ ہی طلاق دینے کی دھمکی دی تھی۔

اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ وہ سدھر گیا تھا۔ یا اس نے ماہ رو کو ذہنی طور پر قبول کر لیا تھا۔ یا وہ اپنی توہین اور ذلت کو بھول چکا تھا۔ نہ ہی اسے کمپرومائز کرنے کا سلیقہ آگیا تھا۔

ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے ایک ایک بات یاد تھی۔ نہ وہ بھول سکتا تھا اور نہ ہی بھلا سکتا تھا۔ وہ محض وقت کی کروٹ کے انتظار میں تھا۔

اس دن ماہ رو نے اچانک عون اور فریحہ کی باتیں سن لی تھیں۔ تب وہ ایک قطار میں رکھے گملوں سے گیندے کے پھول توڑ کر اندر آرہی تھی جب عون اور فریحہ برآمدے میں بیٹھے دکھائی دیے تھے۔

ماہ رو بھی دبے قدموں چلتی ہوئی برآمدے کے پہلو کی اوٹ میں کھڑی ہوگئی تھی۔ پھر اس نے ترچھی نظر سے ذرا آگے ہو کر دیکھا۔ فریحہ اپنی ذہین نظروں کو عون پہ جما کے بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں عون کی شرٹ تھی جس کے بٹن ٹانک رہی تھی۔ اور عون شاید شرٹ لینے کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ پھر وہ عون سے اچانک مخاطب ہوئی تھی۔

"تم نے کیا سوچا ہے عون!" جانے وہ کس سوچ کے متعلق بات کر رہی تھی۔ ماہ رو کو کھدبد ہوئی۔ عون نے بھی اس کا سوال سمجھ لیا تھا اسی لیے کچھ سوچ کر بولا۔

"میں تمہیں بتا تو چکا ہوں۔ تھوڑے انتظار کے بعد دیکھنا میں کرتا کیا ہوں۔" اس کے ارادے خاصے خطرناک لگتے تھے۔ ماہ رو کا دل ذرا سہم گیا۔

"اور جو میرا تماشا لگایا گیا؟" فریحہ کی آنکھیں سرخ ہو کر بہنے لگیں۔ ذہین آنکھوں کو رام کرنے کے سارے گر آتے تھے۔

"میں تمہارا ایک ایک بدلہ لوں گا۔ اتنی آسانی سے معاف نہیں کروں گا۔" عون کا لہجہ پتھریلا ہو گیا۔

"لیکن میں اس کی صورت تک نہیں دیکھ سکتی۔ یہ میرے لیے بہت بڑی سزا ہے۔" فریحہ شدت غم سے چیخ کر بولی۔

"میرا وعدہ رہا۔ دو دن بعد تمہیں اس کی صورت دکھائی نہیں دے گی اور تم جانتی ہو میں بات کا کتنا پکا ہوں۔" عون کے اگلے الفاظ نے ماہ رو کو چکرا دینے پہ مجبور کر دیا تھا۔ وہ پلر کا سہارا نہ لیتی تو اچانک گر پڑتی۔

(آخری قسط آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

✲ ✲

نایاب جیلانی

دل ٹوٹ کے ہار اٹھا

پانچویں اور آخری قسط

سبز دریچے کے پار "شام اودھ" پھیل رہی تھی۔ کھڑکی کے کونوں سے لٹکتی بیلوں کی ہر ہر شاخ پھول' کلیوں اور خوشبوؤں سے لدی تھی۔ اس خوب صورت شام ماہ رو کا موڈ بڑا ہی خوش گوار تھا۔ وہ بڑے دنوں بعد اس قدر فریش نظر آرہی تھی۔ اس نے ڈارک بلیو شیفون کا امبر ائیڈ سوٹ نکالا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر ڈارک بلیو امبر ائیڈڈ ساڑھی نکال لی۔ جس کے بلاؤز پہ ہلکا سا نفیس سلور کام تھا۔ سلیویز بھی اتنے قابل اعتراض نہیں تھے۔ ماہ رو نے کچھ سوچ کر ساڑھی کو زیب تن کرلیا تھا۔ پھر ہلکا سا میک اپ کیا تو یوں لگا جیسے وہ کوئی اور ہی ماہ رو کا روپ دھار گئی تھی۔ عون سے شادی کے صرف ایک ماہ میں ہی وہ خاصی ڈل' افسردہ اور بوجھل دکھائی دیتی تھی۔ جسے پہننے اوڑھنے کا سلیقہ بھی بھول گیا تھا۔ حتی کہ ہنسنا بھی بھول گیا تھا۔ وہ اپنے سراپے کو آئینے میں دیکھ کر خود بھی مسحور رہ گئی تھی۔

ایک ماہ پہلے وہ کس قدر ہنگامہ پرور' خوش مزاج' چلبلی ہوا کرتی تھی۔ صرف ایک مہینے میں اس میں ایسی تبدیلی آئی تھی' اگر شازمہ دیکھ لیتی تو چیخ پڑتی۔ اور آج اس نے کلینڈر پہ نظر ڈالی تو اندازہ ہوا تھا ماہ رو کو اس گھر میں رہتے ہوئے عون کا غصہ' طنز اور عتاب سہتے ہوئے پورا ایک مہینہ ہوچکا تھا۔ اور یہ ایک مہینہ بس مہینہ ہی تھا۔ تیس دن' تیس سال تو نہیں ہوئے تھے' لیکن ماہ رو کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ صدیوں سے اسی گھر میں رہتی آرہی ہے۔ ماہ رو کا یہاں اس گھر کے ایک حد تک آؤٹ موڈڈ (دقیانوسی) ماحول میں دل لگ گیا تھا۔ جہاں سب لوگ ایک ہی چھت تلے بڑی محبت سے رہتے تھے۔ ایک دوسرے کی تکلیف کو سمجھتے تھے۔ احساس کرتے تھے۔ خیال رکھتے تھے۔ کبھی کبھی ہلکی سی چپقلش بھی ہوجاتی۔ رنجش کی لکیر بھی کھنچ جاتی تھی۔ پھر بھی یہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے اور تایا رحمان کی ہمیشہ سے یہی خواہش رہی تھی کہ ان دونوں بھائیوں کے بچے' تایا رحمان کے اپنے بیٹے ہمیشہ اسی چھت تلے اکٹھے رہیں اور ان کا کاروبار بھی کبھی الگ الگ نہ ہو اور یہ خواہش کوئی بے جا ہرگز نہیں تھی۔ اور یوں وہ لوگ ابھی تک اس سایہ دار قسم کی رحمان منزل میں بخوشی رہ رہے تھے۔

ماہ رو کو اس گھر میں ایک دن بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ ابو سے لے کر کائنات تک سب ماہ رو کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ بہت پیار اور عزت دیتے تھے اور جس سے پیار اور عزت کی ماہ رو کو توقع تھی بس وہیں سے نولفٹ کا سائن بورڈ منہ چڑھاتا تھا اور جب اسے پورا ایک مہینہ ڈیڈی سے ملے ہوئے ہوگیا تھا اور ڈیڈی اور شازمہ کے کئی ایک فون آچکے تو ابو نے عون کو پھر سے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

"تمہیں عشق فرمانے کا شوق تھا' نبھانے کا نہیں۔" وہ ابھی کے ابھی تھکا ہارا ڈائریکٹر سے منہ ماری کے بعد گھر پہنچا ہی تھا' جب ابو نے اسے اپنے کمرے میں جانے ہی نہیں دیا' بلکہ رستے میں ہی کائنات اسے بڑے ہال کی طرف لے گئی تھی۔ یہ کہتے ہوئے کہ۔۔۔

"ابو! یاد فرمارہے ہیں۔" عون کچھ حیران ہوا تھا۔

"کہیں انہیں میری پلاننگ کی بھنک تو نہیں پڑ

گئی۔" اس کے دل میں خیال جاگا تھا، کیونکہ ابو عام طور پر اسے بہت کم کم ہی یاد فرماتے تھے اور ان کا یاد فرمانا ایک لمبے جھگڑے کی شروعات کا شاخسانہ ہوا کرتا تھا۔ پھر باپ بیٹا لڑتے لڑتے طعنوں پہ اتر آتے تھے۔ وہ کچھ سوچتا ہوا اندر آگیا تھا۔ ابو شام کا اخبار دیکھ رہے تھے۔ عون کو آتا دیکھ کر کچھ چونک گئے تھے۔ پھر اخبار ایک طرف رکھ کے عون کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ دوسرے معنوں میں فارم میں آچکے تھے۔ عون ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا وہیں دیوان پہ بیٹھ گیا تھا۔ قریب ہی عاشر بھی موجود تھا۔ ان دونوں کو آمنے سامنے بیٹھا دیکھ کر حساب کتاب کا کھاتہ اٹھاتا باہر نکل گیا تھا۔ جانتا تھا کہ ہال کا ماحول اب گرم ہوا چاہتا ہے۔ عون کے نشست سنبھالتے ہی ابو نے گلا کھنکار کے گولہ باری کا آغاز کیا۔

"کر آئے ہو چاکری! اپنا کام تو کاٹتا تھا۔ اب دوسروں کے رعب میں رہ کر کام کرنے کا مزا آئے



گا۔" ان کا لہجہ کہرا طنزیہ تھا۔ عون نے بھی گہرا سانس خارج کیا۔ پھر بڑے سرد لہجے میں بولا۔

"کم از کم وہاں کوئی میرے تازہ بہ تازہ ماضی کو نہیں جانتا۔ پلازہ میں تو دو دو ٹکے کے سیل بوائے تک مجھے دیکھ دیکھ کر ہنسی اڑاتے تھے۔ آخر آپ نے میری کم بے عزتی تو نہیں کی تھی۔" عون کو بہت کچھ یاد آ تا رہا' جو بھولتا تو پہلے بھی نہیں تھا اس وقت زخم پھر تازہ ہو گئے تھے۔ وہ بھولنا چاہتا بھی تو بھول نہیں سکتا تھا اور نہ ہی ابو' فریحہ اسے کچھ بھولنے دیتے۔

"اسی لیے تو انسان کو پھونک پھونک کر قدم اٹھانے چاہیے۔ تاکہ اپنا ہی ماضی سوال نہ بن جائے....." ابو نے پھر سے دھیمے لہجے میں چابک مارنے کی کوشش کی تھی۔

"یہ تو میں تمہارا باپ تھا جو ساری صورت حال کو سمجھ کر تمہیں بڑی ذلت سے بچا گیا تھا۔ ورنہ تو سیٹھ سرفراز تمہیں جیل بھجوانے کا پکا ارادہ رکھتے تھے۔ اغوا اور دہشت گردی کے کیس میں.... جس کی ضمانت بھی نہ ہوتی.... اور تم ابھی تک جیل میں سڑتے رہتے۔"

"پھر اغوا....." عون کا دماغ تپ اٹھا تھا۔ اعصاب جھنجھنا گئے تھے۔ اسے بے طرح سے غصہ آیا اور شاید وہ بھڑک ہی اٹھتا اگر بیچ میں اچانک فریحہ مداخلت نہ کر لیتی۔ فریحہ کے آتے ہی عون نے اپنا غصہ پی لیا تھا اور بمشکل ضبط کر کے چپ رہا تھا۔ کیونکہ اب فریحہ بول رہی تھی اور بڑی ذہانت سے ابو کو لاجواب کر رہی تھی' عون بھی چونک گیا۔ فریحہ کی باتیں رد کرنے والی نہیں تھیں۔ اگر ابو کے دماغ سے ماورا تر جاتی تو.....؟

"حیرت کی بات ہے تایا جی! سیٹھ سرفراز نے آپ کو دھمکی دی' وہ عون کو اغوا کے کیس میں جیل بھجوائیں گے اور آپ نے بڑی فہم و فراست کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے سامنے اپنا بیٹا پیش کر دیا۔ تاکہ جو مرضی سزا سنائیں اور انہوں نے بجائے عون کو جیل بھجوانے کے اپنی بیٹی سے نکاح کی سزا تجویز کر دی۔ جسے آپ نے فوراً" تسلیم کر لیا۔ آپ نے اس تمام سیٹ اپ کی وجوہات پہ غور نہیں کیا تھا۔" فریحہ کا

دھیما ٹھوس سلگتا ہوا لہجہ ایسا تھا جس نے عون کو تو ڈھارس پہنچائی ہی تھی۔ تاہم تایا کو بھی خاصا لحہ فکر عنایت کر دیا تھا' لیکن یہ ان پہ لمحاتی کیفیت تھی۔ وہ جلد ہی اس کیفیت سے آزاد ہو گئے تھے۔

"بیٹی! اس وقت کے حالات کچھ اور تھے۔ ایک شرمسار باپ بھلا کیا کرتا۔ میں تو اسی بات پہ شکر ادا کر رہا تھا کہ سیٹھ سرفراز نے بات نہیں بڑھائی اپنی اور ہماری عزت رکھ لی۔" تایا جی بڑے پراذیت لہجے میں بات کر رہے تھے' جیسے اس وقت کی تکلیف ابھی تک چبھن دے رہی تھی۔ عون کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔

"تو پھر سیٹھ سرفراز نے ایک اغوا کار کو اپنی بیٹی کا رشتہ کیوں دیا؟" فریحہ کے اگلے سوال نے تایا کو بھونچکا کر دیا تھا۔ چند لمحے وہ کچھ بول نہیں پائے تھے۔

"انہوں نے خود نکاح کی تجویز رکھی تھی آخر کیوں؟" فریحہ جیسے زہر خند ہوئی تھی۔

"تو کیا کرتے؟" اس ذلیل نے کچھ تو ان کی بیٹی کے ساتھ کیا تھا جو وہ اس قدر مجبور ہو چکے تھے۔ کوئی باپ کس وجہ سے اس قدر مجبور ہو کر اپنی بیٹی کا رشتہ اپنی زبان سے دیتا ہے۔ یہ میں جانتا ہوں.... اور تم کچھ نہیں جانتیں۔ اس لیے عون کی بے جا حمایت نہ کرو۔" انہوں نے ایک تلخ نگاہ عون کے سراپے پہ ڈال کر فریحہ سے کہا تھا۔ تب وہ دل میں اٹھتے اشتعال کے ساتھ تن فن کرتی چلی گئی تھی' لیکن جانے سے پہلے وہ اتنا ضرور بڑبڑائی تھی۔

"اس ساحرہ نے آپ سب ہی پہ جادو چلا رکھا ہے۔ بڑی جادوگرنی بنی پھرتی ہے۔ اس کا جادو نہ توڑ دیا تو فریحہ نام نہیں میرا۔" اس کے انگ انگ سے شرارے پھوٹ رہے تھے' لیکن وہ اپنے دماغ کو حاضر رکھتے ہوئے ذہین دماغ سے اگلے لائحہ عمل کی بریفنگ لے رہی تھی۔ فریحہ کو آگے کیا کرنا تھا؟ اس بات سے سب بے خبر تھے۔ بڑے ہال میں ابھی تک عون کی کلاس چل رہی تھی اور ابو بڑے ریاضی دان بنے سوال کر رہے تھے۔

"اب تم مجھے بتاؤ کہ اونچی' ٹیڑھی میڑھی..... سطح

سے ایک دم سطح مستوی (ہموار سطح) پہ کیسے آؤ گے؟"

"میں آل ریڈی، ہموار سطح پہ ہوں۔۔۔ مجھ میں طول و عرض تو ہوگا عمق بالکل نہیں۔۔۔" اس نے بھی حساب دانہ جواب دیا تھا۔ ابو لمحہ بھر کے لیے تیوری پہ بل ڈال کر سوچتے رہ گئے تھے۔ پھر گلا کھنکار کر دھیمی آواز میں غرائے۔

"عون۔۔۔! تم سمجھ رہے ہو۔ میں کیا بکواس کر رہا ہوں۔" وہ زچ نہیں ہوئے تھے، لیکن عون ہی سنبھل کر سیدھا ہوا۔

"اب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" اسے باپ کے سامنے لہجہ نرم اور الفاظ سخت رکھنے پڑے تھے۔

"اس بچی کے ساتھ تمہارا رویہ بہت برا ہے۔ میں آنکھیں بھی رکھتا ہوں اور دماغ بھی۔۔۔ وہ اس گھر میں قید ہونے نہیں آئی۔" انہوں نے خاصے سخت انداز میں اسے گھر کا تھا۔

"تو نہ آتی؟ میں باجوں گاجوں کے ساتھ لایا ہوں اس کو۔۔۔" وہ ایک دم تلخ ہو گیا۔ ابو اسے خاصے تاسف سے دیکھتے رہ گئے تھے۔

"بار بار اس بات کو جتا کر تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟"

"صرف یہ ہی کہ وہ خود یہاں آنا چاہتی تھی، سوپری پلاننگ سے آئی۔ مزید مجھ سے توقع نہ رکھے کوئی۔" اس نے قدرے دھیمے لہجے میں کہا، لیکن اکڑ برقرار تھی ہنوز۔۔۔

"وہ بیوی ہے تمہاری۔۔۔ تم اپنے حقوق پہچانو۔۔۔ اور ماہ رو کو خوش رکھنے کی کوشش کرو۔۔۔ اسے اس کے باپ سے ملوا کر لاؤ۔۔۔ اس بات کا تمہیں احساس ہونا چاہیے۔" اب کہ ان کی آواز تیز ہو گئی تھی۔ کیونکہ اس کی اکڑ انہیں مشتعل کر رہی تھی۔

"میں نے اسے خوش رکھنے کا ایگری منٹ سائن نہیں کیا تھا اور نہ ہی نکاح نامے میں ایسی کوئی شرط منظور کی تھی۔ باقی رہی اس کو باپ سے ملوانے والی بات، تو میں نے اسے روکا نہیں۔ جب چاہے جا سکتی ہے۔" وہ تلخ لہجے میں بولتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ابو بھی مشتعل سے اخبار پٹخ کر اٹھے تھے۔

"بدھو! وہ کیسے اکیلی جائے۔۔۔؟ کیا قاسم اور عاصم اپنی بیویوں کو ان کے میکے ملوانے نہیں لے کر جاتے۔ تم دستور سے نرالا کچھ کرو گے؟" ان کو غیض چڑھ گیا تھا۔ "آپ کے لیے اطلاعاً" عرض ہے۔ وہ اکیلی شتر بے مہار گاڑی بھگاتی، سڑکیں روندتی جگہ جگہ دندناتی پھرا کرتی تھی۔ اسے ثنا اور مریم سے کمپیری زن (مشابہت) نہ ہی کریں۔ وہ کوئی انیس سو ساٹھ کی مخلوق نہیں۔ جسے شوہر کی انگلی پکڑ کے گھر سے باہر نکلنا ہوتا ہے۔ اگر باپ سے ملنا ہوا تو خود چلی جائے گی۔ کسی سے پوچھنا گوارا نہیں کرے گی۔" عون نے بھی انہیں چار سنا کر خوب ٹھنڈا کرنا چاہا تھا۔

"وہ تمہاری طرح خودسر، بدتمیز یا بدتہذیب نہیں۔۔۔ جو منہ اٹھا کر کسی بزرگ کو گھاس تک نہ ڈالے اور چلتی بنے۔ اتنے دنوں سے میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ وہ سب سے گھل مل گئی ہے۔ ہم سب کی بہت عزت کرتی ہے۔ اس گھر میں ایسے رہ رہی ہے جیسے سالوں سے یہیں ہو۔ اسی گھر میں آنکھ کھولی۔ تم اس کی خودسری اور آوارہ مزاجی کی جھوٹی کہانیاں مت سنایا کرو اپنی ماں کو۔ ہم میں سے کوئی بھی یقین نہیں کرتا۔" وہ خاصے جارحانہ انداز میں بولتے ہوئے لمحہ بھر کے لیے رکے تھے۔

"اور تم اپنے گریبان میں جھانکو۔ خود میں کوئی اچھائی پیدا کرو اور خاص طور پہ اپنا رویہ یہ ماہ رو کے ساتھ بدلو۔۔۔ میں اس کے باپ کے سامنے دوسری مرتبہ شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔" انہوں نے جیسے عون کو وارننگ دینے والے انداز میں کہا تھا۔ عون کی تیوری پہ بل پڑ گئے تھے۔

"رویہ بدلتی ہے میری جوتی۔" اس نے تنک کر سوچا۔ ابو بھی اٹھتے اٹھتے لمحہ بھر کے لیے کچھ سوچ کر بیٹھ گئے تھے۔

"سنو عون! جو ہو چکا ہے وہ پلٹ نہیں سکتا، لیکن بھولا تو جا سکتا ہے۔ بہتر زندگی کے لیے کچھ چیزوں کو نظر انداز کرنے میں ہی عقل مندی ہے۔" ابو کے الفاظ

عون کو کسی چابک کی طرح لگے تھے۔ وہ ہال کے دروازے تک جاتے جاتے پلٹ آیا تھا۔

"جو ذلت میں نے پلازہ میں اٹھائی تھی ابو! میں عمر بھر اسے بھلا نہیں سکتا۔" اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اور یہ بھی کہ وہ ذلت کس کے توسط سے آئی تھی۔ وہ زہر خند ہوا۔

"اگر بھلاؤ گے نہیں تو کیا کرو گے؟" ابو کے تیور بھی جارحانہ ہو گئے تھے۔ ایسے ہی ان دونوں کا جھگڑا اسٹارٹ ہوتا تھا جو بڑھتا بڑھتا عون کو انتہائی بدتمیزی پہ مجبور کر دیتا تھا۔ پھر دونوں باپ بیٹا کئی کئی دن ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھتے تھے۔ ایک دوسرے سے بولتے نہیں تھے۔ تاوقتیکہ دوسرے جھگڑے کا آغاز نہ ہو جاتا۔

"میں اس فساد کی جڑ کو ختم کر دوں گا۔ اکھاڑ پھینکوں گا۔ بس اس دن کے انتظار میں ہوں، جب وہ خود سب کچھ اگل کر آپ کے سامنے اقرار کرے گی۔" عون نے اپنے خطرناک ارادے ظاہر کر دیے تھے۔ جنہیں سن کر ان کا سارا جلال آنکھوں اور چہرے پہ سمٹ آیا تھا۔ وہ خون رنگ آنکھوں سے بھڑک اٹھے تھے۔

"کیا تم آخری حد سے گزرنا چاہتے ہو۔ کیا تم ماہ رو کو طلاق دینا چاہتے ہو؟" بے غیرت! تم وہ کام کرنا چاہتے ہو جو میرے نسب، نسل، خاندان میں نہیں ہوا۔" وہ دہاڑتے ہوئے اس قدر ہانپ چکے تھے کہ چیخ و پکار اور غراہٹوں کی آواز سن کر عاشر اور امی کو حواس باختہ ہو کر آنا پڑا تھا۔ وہ بمشکل ابو کو کنٹرول کرتے واپس دیوان پر بیٹھا رہے تھے۔ ورنہ ابو کسی بپھرے ہوئے شیر کی طرح عون پہ حملہ آور ہونا چاہتے تھے۔ اس کا گریبان پکڑ کر طمانچے لگانا چاہتے تھے۔

پورا گھر ایک دم اکٹھا ہو گیا تھا۔ کائنات اور امی رو رہی تھیں۔ ثنا، مریم حواس باختہ تھیں۔ باقی سب الگ پریشان اور متوحش نظر آ رہے تھے۔ بس ایک کردار بڑا پرسکون اور خاموش تھا۔ جس کے چہرے پہ اطمینان بھرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ چہرے پہ عجیب سا تاثر تھا۔ ادھر ابو ابھی تک چلا رہے تھے۔

"اس سے پوچھو، یہ کیا کرنا چاہتا ہے؟ اس کی جرات کیسے ہوئی میرے نسب کو داغ دار کرنے کی؟ میری پشتوں میں آج تک کسی نے طلاق کا لفظ نہیں سنا۔" ان کی شریان جیسے پھٹنے لگی تھی۔۔۔ عون نے ہونٹ بھینچتے ہوئے بمشکل اپنے غصے کو قابو کیا تھا۔ اس کی لہو رنگ آنکھوں میں اک تیز چمک ابھر آئی تھی۔ پھر اس نے دھیرے دھیرے سارے غصے کو پینا شروع کر دیا۔ چند لمحوں بعد وہ نارمل کیفیت میں آ گیا تھا۔ اس کا غصہ ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ بڑے سکون میں کھڑا تھا۔ انتہائی مطمئن حالت میں۔ ٹائی کو گلے سے اتارتا ہوا۔ بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہوا۔ وہ بڑے خوش گوار، دھیمے، مگر اک خاص انداز میں چونکا دینے والے انداز و لب و لہجے میں بولا۔

"آپ کو کس نے کہا، میں ماہ رو کو طلاق دوں گا؟" اس کی آواز پہ لمحہ بھر کے لیے پورے ہال میں سکوت چھا گیا تھا۔ اس قدر سکوت کہ سوئی بھی گرتی تو آواز آ جاتی۔ بھانت بھانت کی بولیوں میں ایک سناٹا اچانک ابھر کر سامنے آ گیا تھا۔ ہر کوئی آنکھیں پھاڑے عون کو دیکھنے لگا۔

"طلاق کے بعد تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ طلاق کے بعد تو میرا انتقام بھی ختم ہو جائے گا۔" اب اس کے چہرے پہ بڑی دل آویز مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس نے جھک کر شوز اتارے۔ کوٹ کندھے پہ ڈالا، جوتے اٹھائے، ہر ایک کی آنکھ میں سوال اتر آیا۔ تجسس اتر آیا۔ ہر کوئی اس کے اگلے الفاظ کا انتظار کرنے لگا۔ عون نے بھی اس انداز میں پراسراریت کے وقفے کو مزید طویل کرتے ہوئے بالاخر اس تجسس کا خاتمہ کر دیا تھا۔ یوں کہ ہر کوئی ہکا بکا اور ششدر رہ گیا۔

"اطلاعاً" عرض ہے والد صاحب! میں آپ کی نقلی بہو کو طلاق ہرگز نہیں دوں گا۔ کسی قیمت پہ بھی نہیں دوں گا۔ میں بس آپ کی نقلی بہو پہ اصلی سوکن لاؤں گا، تاکہ وہ بھی ذلت کا مزا چکھ سکے۔" سب کے خوف

ناک حد تک عجیب تاثرات کو انجوائے کرتا' مسکراتا گنگناتا اپنے بیڈ روم کی طرف جارہا تھا۔ اس حالت میں کہ کوٹ کندھے پہ جھول رہا تھا۔ ٹائی گلے میں لٹک رہی تھی۔ جوتے ہاتھ میں اٹھا رکھے تھے۔ ننگے پیر فرش پہ چلتا وہ بڑے دل فریب انداز میں انگلش سونگ گنگنارہا تھا۔ پھر جیسے ہی اس نے اپنے بیڈ روم کا دروازہ کھولا تھا۔ خوشبو کا معطر' دلنشین' حسین' روح میں اتر جانے والا جھونکا نتھنوں سے ٹکراتا ہوا ایک الوہی' عجیب اور ان چھوا سا احساس بخش گیا۔ ایک ایسا احساس جس سے کبھی بھی عون کی آشنائی نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت بھی نہیں' جب باقاعدہ طور پہ فریحہ سے اس کا رشتہ طے ہوا تھا۔ اس وقت بھی نہیں' جب اس کی فریحہ سے شادی ہورہی تھی۔ یہ ایک ان چھوا احساس تھا۔ اس احساس کا کیا نام تھا۔ کیا احساسات کے نام بھی ہوتے تھے؟ اگر ہوتے تھے تو کیا؟ وہ اپنے ہی کمرے کے دریچے سے پگھلتی شام اودھ کو دیکھتا لمحہ بھر کے لیے اپنے آپ میں بھی نہیں رہا تھا۔



اور عون عباس شام اودھ کی دل فریبی کو زندگی میں پہلی مرتبہ محسوس کرتے ہوئے واقعی ہی اپنے آپ میں نہیں رہا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے مبہوت ہوگیا۔ اس نے زندگی میں رنگوں کو اس قدر کسی پہ کھلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ قوس و قزح میں لہریں سی اٹھ رہی تھیں۔ اس نے بائیں پہلو میں ہلچل سی محسوس کی تھی۔ جیسے کوئی گڑبڑاہٹ تھی۔ کسی کے قدموں کی آہٹ تھی۔ کیا "شہر دل" میں کوئی آرہا تھا؟ اس کی دھڑکنوں میں طلاطم سا اترا۔ بے ترتیبی سی ابھری' ہلچل سی مچی۔

اس کی آنکھوں میں خمار بھر گیا تھا۔ وہ کسی خواب کی کیفیت میں اس کے سامنے کھڑا ہوا بالکل مقابل دلنشین انداز میں دیکھتا ہوا ماہ رو کا دل جیسے کانوں میں دھڑکنے لگا۔ عون کے قدموں میں گرنے لگا اور وہ کسی بھیگے لمحے میں بڑا بے بس ہوکر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ماہ رو' سرفراز کے خم و چم سے زیر ہوتا' اس نے کسی فرشتوں سے معصوم لمحے کے زیر اثر ماہ رو کے شفق گال کو چھوا تو اس کی گرم انگلیوں کا لمس اس کے شفق گالوں کی ساری ملائمت میں اترنے لگا۔ ایک لمحاتی سی سحرانگیز کیفیت تھی۔ جس نے دونوں کو بے بس کیا' عون نے جیسے قید محبت کی کھنکھناتی زنجیروں کا حصار کھینچا اور وہ ایک حسین خواب کی طرح اس کے مضبوط بازوؤں میں زنجیر ہوگئی۔

اس نے عون کی دھڑکنوں کو سنا۔ بہت غور سے سنا۔ وہاں ایک پکار مچی تھی۔ عون نے ایک دل نشین ملائمت سے اس کے شفق گالوں پہ زلفوں کے پردے کو ہٹا کر لب و انداز سے چھوا تو ماہ رو سرفراز کو لگا وہ عمر بھر کے لیے سرفراز ہوگئی ہے۔ عون عباس اسے عطا کردیا گیا تھا۔ ماہ رو سرفراز کو بامراد کردیا تھا۔ اس نے خود سپردگی کی ہر کیفیت کو دل کی پاگل ہوتی دھڑکنوں سے سنا تھا اور دونوں ہاتھوں کا ہلکا سا دباؤ عون کے سینے پہ ڈالا تھا۔ جیسے دھیرے سے پیچھے کو دھکیلا تھا۔ اس کے لب و انداز کی شدت اور تپش نے ماہ رو کے گال بے انتہا سرخ اور پرحدت کردیے تھے۔ اس نے بے ارادہ ہی اپنا نازک دودھیا ہاتھ عون کے لبوں پہ رکھا تھا۔ اور جیسے سارا عالم انت انت ہوگیا تھا۔ ہر خواب جیسے آنکھوں سے اتر کر حقیقت بن گیا تھا۔ ہر گرد آلود آئینہ ٹوٹ گیا تھا اور کوئی دھیرے سے کان میں گنگنا رہا تھا۔ شہد امرت اتار رہا تھا۔

نہ خیال ہوں
نہ قیاس ہوں
میں بولتا احساس ہوں

اور پھر نازک سایہ حسین فسوں' لمحوں میں ٹوٹ گیا۔ بولتا ہوا ان کہا احساس دونوں کے دلوں کو متزلزل کرتا شام اودھ کے ساتھ ہی رواں دواں ہوگیا تھا اور کوئی لمحوں میں اتنا قریب آرہا تھا۔ عون اس سحر طراز کیفیت کو نہ سمجھتے ہوئے جیسے اس فسوں خیزی سے نظر چراتا پیچھے ہٹا اور سنبھل گیا۔ کچھ دیر پہلے کمزور لمحات کی عنایت سے نظر چراتا بالوں میں انگلیاں پھیرتا

دھپ دھپ کرتا واش روم میں گھس گیا تھا۔ یوں کہ دروازہ زوردار دھماکے سے بند ہوا۔ جیسے ساری جھنجلاہٹ دروازے پہ اتاری ہو۔ اور پھر گھنٹہ بھر بعد بمشکل ہی باہر نکلا۔ ماہ رو کو دو مرتبہ ساڑھی سنبھال کر دستک دینا پڑی تھی۔ بالآخر عون کا اشنان مکمل ہوا اور وہ باہر آگیا تھا۔ ماہ رو تولیہ پکڑ کر کھڑی تھی۔ جسے تھام کر بال اور گردن رگڑتا وہ یوں ڈریسنگ کی طرف مڑ گیا تھا کہ ماہ رو کی طرف اس کی پشت نظر آرہی تھی۔ وہ گہرا سانس کھینچتی عون کو دیکھتی رہی۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو بھی ہوا تھا۔ وقتی طور پر ہی سہی۔ عون کو ماہ رو کے بہت قریب لے آیا تھا اور ماہ رو ان لمحات کی سرشاری کو عمر بھر نہ بھلا پاتی۔ وہ لمحات جو غیر دانستہ ان کی زندگی میں دبے قدموں آئے تھے اور چپکے سے نکل گئے تھے اور ابھی ابھی تو سرشاری کی کیفیت ہی الگ تھی۔ وہ عون کی پشت کو بے خودی کے عالم میں دیکھتی رہی تھی۔ دیکھتی رہی تھی، یہاں تک کہ اس ارتکاز سے الجھ کر وہ کنگھا ڈریسنگ پہ پھینکتا اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ لیکن ماہ رو کو غور سے اپنی طرف دیکھتا پا کر ذرا جھنجلایا۔

"اور اب اس کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ میں بھی کیسا کمزور نکلا۔ حد ہوگئی آج تو...." اسے خود پہ شدید ہی غصہ آیا تھا اور ماہ رو اس کے کیسلے خیالات سے مبرا بڑی مخمور نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اس کی تو زبان بھی بہت لمبی ہے۔ موقع پا کر جتائے گی اور طنز بھی کرے گی۔" عون بے طرح سے چڑا تھا۔ "بندے کو اتنا بھی بے حواس نہیں ہونا چاہیے۔ اب ہو گیا ہے تو کیا کروں؟ دیکھوں گا کیا کہتی اور کرتی ہے؟ ویسے بھی کون سا گناہ کیا ہے۔ زبردستی کی ہی سہی، تاہم اپنی چیز تو ہے نا۔" وہ خود کو دلاسا دیتا قدرے مطمئن ہوا تھا۔ پھر بال خوب خوب سنوار کر خاصا سنبھل کے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کافی دیر کے بعد اس نے کچھ دیر پہلے والے لمحات کے تاثر اور اثر کو زائل کرنے کے لیے بڑا ٹھوس سا مائنڈ ورک کر لیا تھا۔ اسی لیے کچھ دیر قبل چھانے والی جھنجلاہٹ ختم ہو چکی تھی اور بوکھلاہٹ بھی ختم ہو چکی تھی۔ وہ جم کر صوفے پہ بیٹھ گیا اور بڑی دیدہ دلیری سے ماہ رو کا آنکھوں سے ایکسرے کرنے لگا۔

ایک مرتبہ پھر گل فام کے رنگوں سے سجی ماہ رو کو نظر بھر کے دیکھتے ہوئے دل کی سابقہ کیفیات سے ایک دم وہ بوکھلاہٹ کا شکار ہوا تھا۔ دھڑکنوں میں ویسا ہی طلاطم آیا تھا اور اس ستاروں کے رنگوں میں لپٹی شوکیس میں سجا کر بس دیکھ دیکھ کر دل بہلانے والی گڑیا کی کنفیوژن دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا چہرہ پھر سے گل رنگ ہونے لگا۔ پلکیں بار حیا سے جھکنے لگیں۔ تو گویا عون کے دل کا بدلتا موسم ماہ رو کے اندر بہاراں کر رہا تھا؟ عون نے بمشکل دل کو سنبھالا دیا۔ پھر وہ بے سبب اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ جب کچھ اور نہ سوجھا تو خواہ مخواہ ہی ماہ رو پہ چڑھائی کر دی تھی۔ ظاہر ہے، بھڑاس تو نکالنی تھی۔ کچھ دیر پہلے ابو سے جھگڑ کر آیا تھا اور اب ماہ رو کے ساتھ بلاوجہ ہی لڑ رہا تھا۔ جیسے چند لمحے پہلی والی جھلاہٹ کو ختم کرنا چاہتا تھا۔

"یہ تم اتنا بیر بہوٹی بن کے کہاں جا رہی ہو؟" اس نے خاصے برہم لہجے میں پوچھا تھا، لیکن چاہ کر بھی اپنے الفاظ کو سخت نہیں کر سکا تھا۔ ورنہ تو ماہ رو سے بولتے ہوئے وہ کبھی الفاظ کی سنگینی پہ غور نہیں کرتا تھا۔ اس وقت پہلی مرتبہ اس نے بے ہودہ کہنے سے پرہیز کیا تھا اور نہ ہی اشتہاری ماڈل کہا تھا۔ آج واقعی کچھ انہونا ہو گیا تھا۔ ماہ رو جیسے سنبھل کر سیدھی ہوئی تھی۔

"ایسے ہی موڈ ہوا تو ساڑھی پہن لی۔"

"کیا کہنے تمہارے شاہانہ موڈ کے.... ایسے تیار ہوئی ہو جیسے ولیمے پہ جانا ہو.... بندہ گھر میں رہتے ہوئے کوئی گھریلو مناسب سوٹ پہنتا ہے۔ جس میں ایزی فیل بھی کرے۔" بڑے حیران کن انداز میں وہ مشورہ دیتا ماہ رو کو سخت بے ہوش کرنے پہ تلا ہوا تھا۔ اللہ خیر، کوئی طنز نہیں تھا، کوئی طعنہ نہیں تھا۔ کوئی سڑا بسا جملہ نہیں تھا۔

"میں عادی ہوں اور ایزی فیل کر رہی ہوں۔" ماہ رو نے جیسے اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔ وہ بھنویں سکیڑ کر بولا۔

"عادی تو تم بہت سی چیزوں کی ہو اور شوقین بھی۔۔۔" "مثلاً" "کیا۔۔۔کیا۔۔۔اس نے دلچسپی سے پوچھا' تو گویا وہ اسے آبزرو کرتا تھا اور زیادہ نہ سہی اسے کچھ کچھ جانتا تھا۔ ماہ رو کے لیے بڑا پر مسرت یہ مقام تھا۔

"یہ ہی کہ لوگوں کو الو بنانا۔۔۔ اپنی مرضی چلانا' ایکٹنگ۔۔۔ جوتوں سمیت آنکھوں میں گھسنا۔۔۔" وہ جو انگلیوں پر گنوانے لگا تو ماہ رو کا منہ اتر گیا۔ وہ نہ جانے کس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئی تھی' لیکن یہ عون بھی نا' کبھی خوش نہیں کر سکتا تھا۔

"میں نے کسے الو بنایا؟ کسی کی آنکھوں میں جوتوں سمیت گھسی ہوں؟" اس نے برے دل کے ساتھ پوچھنا چاہا تھا۔

"میری۔۔۔" عون نے آہ بھر کے کہا۔ "اور صرف آنکھوں میں نہیں۔۔۔ دل میں بھی۔۔۔" اگلے الفاظ کہہ کے پچھتایا تھا۔

"آنکھوں میں کیا فائدہ؟ دل ہو تا تو بات بنتی بھی۔" اس نے شاید اگلے عون کے الفاظ سنے نہیں تھے۔ اگر سنے بھی تھے تو مذاق ہی سمجھا تھا۔ کیونکہ عون کو بھیانک مذاق کرنے کی عادت تھی۔ یہ ابھی ابھی ماہ رو پہ انکشاف ہوا تھا۔

"اگر دل بھی ہو تو۔۔۔؟" عون نے لفظ پکڑ لیے تھے۔ ماہ رو کا خوش فہم دل خوش ہو گیا۔ "کیا واقعی۔۔۔؟" اس نے ایک سرور بھری کیفیت میں پوچھا۔ عون نے فوراً" پینترا بدل لیا تھا اور بڑے ہی روکھے انداز میں کہا تھا۔ اب وہ آرام صوفے پہ نیم دراز ہو رہا تھا۔

"لوگ مذاق پہ بھی سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔" اس نے ماہ رو کی خوب خوش فہمی کا بھرکس نکالا تھا۔ ماہ رو بھی تھوڑا سا تلخ ہو گئی تھی۔

"میرے ساتھ تمہارا مذاق کا رشتہ بنتا ہے؟" اپنے تئیں اس نے عون کو لاجواب کرنا چاہا تھا۔ عون نے ذرا استہزائیہ انداز میں اسے دیکھا اور بولا۔

"مذاق کا نہ سہی۔۔۔ ایک دوسرا رشتہ تو بنتا ہے۔" عون نے گہری نگاہ اس کے بھرپور ایمان ڈول دینے والے سراپے پہ ڈالی تھی۔ بلیو ساڑھی میں اس کا جگمگاتا حسن آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ لمبے کھلے حسین بال۔۔۔ دلنشین آنکھیں۔۔۔ دودھیا سراپا۔۔۔ وہ ایک مکمل حسن رکھتی تھی۔ اگر کوئی اور صورت حال ہوتی تو وہ ماہ رو کو شاید کبھی نظرانداز نہ کر سکتا۔ لیکن اب بیچ میں بہت لمبی بدگمانیوں کی خلیج کھڑی تھی۔ ماہ رو کو عون تک آتے آتے بڑا لمبا سفر کرنا تھا۔

"تم نے کب اس رشتے کو سمجھا؟" وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے زخمی لہجے میں بولی۔

"اور کیا تم نے کوشش کی؟" عون نے الٹا تیوری چڑھا کر پوچھا تھا۔

"تم نے مجھے موقع دیا؟" ماہ رو کے منہ سے بے ارادہ ہی پھسل گیا تھا۔ پھر وہ بات کر کے پچھتائی تھی۔ کیوں کہ عون صوفے سے لیٹا لیٹا اٹھ گیا تھا۔ پھر اس کا کچھ دیر پہلے والا موڈ بدل گیا۔ چڑھتا غصہ ڈھل گیا۔ اور طنزیہ انداز بھی بدل گیا۔ گو کہ ہوتی یہ لمحاتی کیفیت تھی۔ وہ لمحہ بہ لمحہ روپ بدلنے والا تھا۔ پل میں نرم ہو جاتا۔ پل میں گرم ہو جاتا۔ پل میں دھوپ ہو جاتا۔ پل میں بادل ہو جاتا۔

"تو اب موقع لے سکتی ہو؟ جو تیر چلانا ہے چلا لو۔ میرے دل کو موڑ سکتی ہو تو موڑ لو۔" لمحہ بھر بعد وہ بڑے استہزائیہ لہجے میں کہہ رہا تھا یوں کہ ماہ رو کا دل کٹنے لگا۔

اس شخص سے ماہ رو نے محبت کی تھی۔ بغیر سوچے سمجھے نہ اچھائیوں سے نہ برائیوں بس اس کے وجود سے کیا اس پتھر سے سر پھوڑا تھا' جس کے نزدیک ماہ رو کی زندگی کچھ بھی نہیں تھی۔ اور وہ ایک مذاق سمجھ کر اس کے جذبوں کو خاک دھول کر دیتا تھا۔ ماہ رو کو پہلی مرتبہ احساس ہوا تھا کہ واقعی ہی۔

"ہم کسی سے اپنی مرضی اور چاہ سے محبت تو کر سکتے ہیں لیکن کسی کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم بھی مجھ سے محبت کرو۔ اور نہ ہی اسے خود سے محبت کرنے پہ مجبور کر سکتے ہیں۔"

ماہ رو کے چہرے پہ پھیلی اذیت کو محسوس کرتے' اس کا چہرہ پڑھتے' تاثرات سمجھتے ہوئے عون نے ایک

مرتبہ پھر پینترا بدل کے کہا تھا۔
"تم چند چیزیں کلیئر کر دو۔۔۔ ہمارا حساب برابر ہو جائے گا؟" عون نے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے خود بھی ویسی ہی اذیت محسوس کی تھی جس سے ماہ رو گزر رہی تھی۔
ماہ رو خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ جیسے کہنا چاہتی ہو "کیا؟"



وہ لانڈرنگ کر رہی تھی جب اس کی امی پورے گھر میں اسے تلاش کرتی پچھلے صحن میں آ گئی تھیں۔ پھر اسے عون کے کپڑے دھوتے دیکھ کر ماتھے پہ بل ڈالتے ہوئے سخت کھردرے، بے زار لہجے میں بولیں۔
"تم سا احمق کوئی نہیں ہو گا فریحہ! عون کی نوکرانی بن کے کیا تم اس ماہ رو کو اس گھر سے نکال سکو گی؟ اور وہ مہارانی ماڈل گرل بنی ساڑھی پہنے ملکاؤں کی طرح دندناتی پھر رہی ہے۔ تم یہاں ماسی بن کر کون سی کہانی رقم کر رہی ہو؟ کون سا تمغہ تمہیں ملے گا؟" امی غصے سے پھٹ پڑی تھیں۔ فریحہ سنی ان سنی کر کے سرف میں شرٹس رگڑتی رہی تھی۔ اس کا چہرہ سپاٹ ہی تھا۔
"تم بھائی جی کی اولاد، ان کی بیوی، بیٹی اور بہوؤں کی نوکر نہیں ہو۔ یہ کام عون کی بیوی کرے تو چار دن بھی نہ ٹکے۔ اس پہ کوئی ذمہ داری ہی نہیں۔۔۔ بھابھی جی نے اسے سر پہ بیٹھا رکھا ہے۔ عون باہر تو یوں ظاہر کرتا ہے جیسے اس لڑکی سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔۔۔ لیکن لکھوا لو مجھ سے۔ ساری ڈرامہ بازی ہے۔ عون نے خود ہی چکر چلایا ہو گا۔ تبھی تو وہ لڑکی عون پہ فدا ہے۔ اگر عون منہ نہ لگاتا تو کب کی لعنت بھیج کر جا چکی ہوتی۔ شوہر کے مان پہ یہاں ٹکی بیٹھی ہے۔" امی کا لہجہ سخت کھردرا اور بے زار تھا۔ "میری بات سنو فریحہ! چھوڑو یہ سب۔" انہوں نے زبردستی بالٹی اس کے تسلط سے آزاد کروائی تھی۔ اب وہ جھاگ والے ہاتھ لیے گم صم سی بیٹھی تھی۔ حالانکہ اس کا ذہن اب بھی مصروف عمل تھا۔

"تمہاری خالہ کا فون آیا تھا۔۔۔ بڑا اچھا رشتہ بتا رہی ہیں۔۔۔ تمہارے ابا سے بات کر لوں۔ پھر ہاں کروں گی۔ تم کہو ان لوگوں کو بلوا لوں۔" امی نے بڑی بے تابی سے فریحہ کو تفصیلات بتائی تھیں۔ فریحہ کی بے زاری کسی طرح بھی کم نہ ہو سکی۔ اور بے نیازی کا بھی وہی حال تھا۔
"فریحہ! کیوں اس کمینے کے لیے خود کو برباد کر رہی ہو۔ کیوں نہیں سمجھتی کوئی لڑکی ایسے کسی لڑکے کے پیچھے پاگل نہیں ہوتی جب تک لڑکا اسے سبز باغ نہ دکھائے۔ عون نے اسے اپنی طرف مائل کیا ہو گا تبھی وہ گھائل ہو کر یہاں تک پہنچ گئی۔۔۔ چلو مان لیتی ہوں۔ عون ایسا نہیں۔۔۔ لیکن وقتی طور پر تو انسان شیطان کے بہکاوے میں آ جاتا ہے نا۔۔۔ پھر سامنے ماہ رو جیسی قیامت ہو۔ عون کا دل پھسل گیا ہو گا۔ جانے اس سے کیسے تعلقات بنا لیے ہوں گے۔ ماہ رو نے بھی موقع فراہم کیا ہو گا۔ کیا پتا، عون نے ٹائم پاس کرنے کے لیے ماہ رو سے دوستانہ بنایا ہو۔ سوچتا ہو گا۔ شادی تو طے ہے۔ خاندانی لڑکی سے ہو جائے گی۔ باہر تھوڑی عیاشی کر لے۔ پھر چھوڑ دینے کا ارادہ ہو گا۔ لیکن یہ امیر زادی عون کے گلے پڑ گئی۔ اور اچھا ہوا گلے پڑ گئی۔ ہماری جان چھوٹ گئی۔ ہم بچ گئے۔ اللہ کا شکر ہے۔ بروقت بچ گئے۔ شادی کے بعد پول کھلتا تو ہم تم کیا کر لیتے۔۔۔ اسی لیے کہتی ہوں۔ مٹی ڈال اس کمینے پہ۔۔۔ اللہ نے تمہارے جوڑ کا بہت اچھا بندہ بنایا ہو گا۔ تم از کم اس عون سے ہزار درجہ بہتر ہو گا۔" امی نے لمبی حکایت بیان کر کے بے ساختہ فریحہ کا ماتھا چوما تھا۔
"تو خواہ مخواہ عون کو ہر ایک کے سامنے سچا بنانے پہ تلی ہے۔ ارے، مرد کا کیا بھروسا! باہر سات سو عورتوں سے آنکھ لڑا کر گھر میں معصوم بن جاتا ہے۔ میں تو اول روز سے ہی جانتی تھی۔ اس سارے شرمناک قصے میں عون کا ہی ہاتھ تھا۔ اتنا نیک چلن تھا، اتنا سچا تھا تو اسے چھوڑتا کیوں نہیں؟ وہ زبردستی اس کے پیچھے آئی تھی تو اب طلاق کیوں نہیں دیتا؟ اس کا فرض تھا کھڑے کھڑے اسے گھر سے نکال دیتا اور تم سے نکاح

کرتا.... لیکن بات تو واضح ہے۔

عون نے خود ماہ رو کو ورغلا کر چکر چلایا.... اس سے تعلقات استوار کیا۔ پھر اپنے باپ کے خوف سے ماہ رو کی محبت سے جان چھڑوانی چاہی اور خود ہی پھنس بھی گیا۔ کیونکہ ماہ رو کوئی عام لڑکی نہیں جو عون سے دب جاتی۔ وہ ڈنکے کی چوٹ پہ آگئی۔ عون کے مراد بر آئی۔ اس نے ہماری آنکھوں میں دھول جھونکی ہے فریحہ! ورنہ اپنی بیوی کے ساتھ راضی برضا ہے خوش ہے۔ اس کی خاطر نوکری بھی کرلی۔ اور زبردستی نوکری پہ بھی جانے لگا۔ اور یہ تیرے تایا کی بھی کوئی چال لگتی ہے۔ بیچ میں یہ سب ملے ہوئے تھے۔ انہوں نے مل کر ہمیں بیوقوف بنایا ہے۔ عون کی شادی جان بوجھ کر تم سے تڑوائی۔ ان کی نیتوں میں ماہ رو کی دولت دیکھ کر فتور آگیا تھا۔" امی ایک ہی سانس میں ایسا شروع ہوئیں کہ آخر میں ہانپنے لگیں۔ فریحہ نے ٹونٹی کھول کر امی کو پانی پلایا تھا۔ پھر خود بھی پانی پی کر اندر لگی آگ کو بجھانے لگی تھی۔ اس نے امی کی ہربات سن لی تھی۔ سمجھ لی تھی۔ غور بھی کرلیا تھا۔ جو بات امی اتنی عرصے بعد اب سمجھ پائی تھیں وہ فریحہ نے اول روز ہی سمجھ لی تھی۔

اسے ابا نے بتایا تھا۔ کئی مرتبہ بتایا تھا کہ تمہاری سہیلی رحمان پلازہ بہت آتی ہے۔ پہلے تو دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اب متواتر آتی ہے۔ فریحہ کے اپنے سورسز (ذرائع) بھی بہت تھے۔ اسے ہما نے بھی کئی مرتبہ بتایا تھا۔ ماہ رو تمہارے کزن میں انٹرسٹڈ لگتی ہے۔

ماہ رو وہاں جاتی تھی۔ یا بلوائی جاتی تھی؟

تب فریحہ اس وہم میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ اس کی چند دن بعد شادی تھی سو وہ وہم میں کیوں پڑتی.... اور تب فریحہ کو لگتا تھا۔ ہما جلن میں اسے ڈبل مائنڈڈ کرنا چاہتی ہے۔ وہ فریحہ سے جلتی ہے۔

لیکن یہ خدشات بے بنیاد نہیں تھے۔ ان کی وجوہات تھیں اور ٹھیک وجوہات تھیں۔

ماہ رو اور عون ایک دوسرے میں انٹرسٹڈ ہو سکتے تھے۔ اور واقعی ہی ہو سکتے تھے۔ کیونکہ ماہ رو میں جو سب سے بڑی خوبی تھی۔ وہ اس کا بے داغ حسین سراپا تھا۔ جو کسی بھی مرد کو اسیر کرلیتا۔

اور عون عباس ماہ رو کا اسیر ہو گیا تھا۔ مانتا یا نہ مانتا۔ تسلیم کرتا یا نہ کرتا۔ اگر ابھی تک بھی مکر رہا تھا تو فریحہ کی بلا سے۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی، عون کب تک اور کہاں تک مکرتا ہے؟

مہندی والی رات پنڈال میں جانے سے پہلے اسے ایک فون کال موصول ہوئی تھی۔ ایک ایسی کال جس کی فریحہ کو نہ توقع تھی اور نہ امید تھی۔ نہ گمان میں تھا اور نہ خیال میں تھا۔

کال کرنے والی عورت شازمہ تھی۔ ماہ رو کی ماں.... جب اس عورت نے تعارف کروایا تب فریحہ ہکابکا رہ گئی تھی۔

وہ شازمہ تھی جو عون کے بارے میں فریحہ سے کرید کرید کر پوچھ رہی تھی۔ عون کیسا ہے؟ کس مزاج کا ہے؟ تعلیم کیا ہے؟ کرتا کیا ہے؟ فریحہ نا سمجھی کے عالم میں بتاتی رہی۔ گو کہ وہ اتنی نا سمجھ نہیں تھی۔ پھر بھی اچانک کچھ کنفیوز ضرور ہو گئی تھی۔ اسی گھبراہٹ میں وہ تمام سوالوں کے جواب دیتی رہی۔ پھر فریحہ کے سر پہ شازمہ نے جیسے دھماکا کیا تھا۔

"ایکچوئیلی! عون، ہماری ماہ رو میں انٹرسٹڈ (دلچسپی رکھتا) ہے۔ یو نو ماہ رو کے لیے پرپوزلز کی کمی نہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک لڑکا ہمارے سرکل میں ہے۔ لیکن ماہ رو کے ڈیڈی کسی مڈل فیملی میں رشتہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے خیال میں مڈل لوگ بہت لونگ ہوتے ہیں اور قدر دان بھی۔ عون ماہ رو سے محبت کرتا ہے اور ہماری ماہ رو بھی.... ابھی تک اس نے پرپوزل نہیں بھیجا.... اینی وے، یہ اس کا ہیڈک ہے.... اوکے بائے.... پھر بات کروں گی۔ عون کے بارے میں انفارمیشن چاہیے تھیں، سو مل گئیں۔" عجیب پاگل عورت تھی۔ خواہ مخواہ اول فول بکے چلی جا رہی تھی۔ اور اس پاگل سے زیادہ فریحہ نادان نکلی جو اس عورت کی بکواس کا جواب دیتی رہی۔

تب فریحہ نے اس عورت کی بکواس کو بکواس سمجھ

کر بھول جانا بہتر سمجھا۔ حالانکہ کوئی بھی بات معمولی ہر گز نہیں تھی۔ پہلے اس نے سوچا 'امی کو بتائے۔ پھر امی کی پریشانی کے خیال سے خاموش ہو گئی تھی۔ بعد میں اسے شازمہ کو سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

اس کی کزنز کا جھرمٹ پہنچ گیا تھا اور اسے پنڈال میں لے جایا گیا۔ لیکن اس کے بعد ہوا کیا؟ شازمہ کی بکواس سچ ثابت ہو گئی؟

اور عون کا سارا پول کھل گیا۔ اسی رات ہی عون فریحہ کے دل سے اتر گیا تھا۔ اسی رات ہی فریحہ نے عون کو اپنی زندگی سے نکال دیا تھا۔

گو کہ بھولنے میں 'ذہنی طور پر اس صدمے سے نکلنے میں فریحہ کو بہت وقت لگا تھا۔ لیکن اس نے خود کو مضبوط کر لیا تھا۔ ایک مرتبہ پھر وہ پورے قد سے زمین پہ کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ عون کو بھول گئی تھی۔

لیکن کیا وہ اپنی ذلت کو بھول سکی تھی! اس توہین کو بھول سکی تھی جو عون اور ماہ رو نے اس کے جذبات روند کر کی۔ شادی توڑ کر پورے زمانے کے سامنے رسوا کر کے کی۔ عون نے اور ماہ رو نے جو بھی کیا بہت برا کیا۔ پوری پلاننگ سے کیا۔ وہ ماہ رو سے سو مرتبہ شادی کر لیتا۔ جب دل کرتا شادی کر لیتا۔ لیکن فریحہ کو تماشا نہ بناتا۔ کم از کم شادی کا ڈرامہ رچا کر نہ کرتا۔

صاف صاف فریحہ کو ماہ رو کے متعلق بتا دیتا۔ وہ خود بخود رستے سے ہٹ جاتی۔ اس شادی کو توڑ دیتی۔ کیونکہ فریحہ کبھی بھی ایک ایسے شخص کی بیوی نہ بنتی جس کی یادوں اور دل میں اس کی سہیلی کا تصور ہوتا یا محبت ہوتی لیکن جو عون اور ماہ رو نے اس کی زندگی کے ساتھ مذاق کیا تھا۔ وہ بھولنے والا نہیں تھا۔

فریحہ بھی ویسی ہی گیم کھیل کر عون کو برباد کرنا چاہتی تھی 'رسوا کرنا چاہتی تھی 'اس نے ماہ رو کی خاطر اسے برباد کیا تھا خود ماہ رو کے ساتھ کیسے آباد ہو سکتا تھا؟ فریحہ اسے کس طرح سے آباد ہونے دیتی؟ اور امی کہتی تھیں۔ ان کی بیٹی بھولی ہے۔ نادان ہے سادہ ہے۔۔۔ اور لوگ اس کی معصومیت سے فائدہ اٹھا کر اسے نوکر بنائے ہوئے ہیں۔۔۔ وہ عون کی نوکرانی بنی ہوئی ہے۔

اس کی بھولی امی فریحہ کی ذہانت اور فہم سے واقف نہیں تھیں۔ وہ ماہ رو سے زیادہ ذہین 'شاطر دماغ 'عقل مند اور چالاک تھی۔ بظاہر کم گو 'سنجیدہ 'دبو لیکن دماغ کے معاملے میں بہت تیز۔ وہ ماہ رو کو اپنی ذہانت سے پچھاڑنے کا ارادہ کر چکی تھی۔

اس کی امی کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا۔ عون سے تعلقات استوار کرنے کے پیچھے کیا وجوہات تھیں؟ پہلی بات اس کا اعتبار اور اعتماد لوٹانا۔۔۔ دوسری بات اس کو اعتماد میں لینا۔۔۔ اسے معاف کر کے اعلا ظرفی کی عظیم مثال قائم کرنا۔ اس کی نگاہ میں بلند اور بلند ہو جانا۔۔۔ عون کا بھروسا حاصل کرنا۔۔۔ اسے پھر سے قابو میں کرنا۔ ماہ رو اور عون کو الگ کروانا۔۔۔ بڑی ہوشیاری سے ماہ رو کا پتا کاٹ دینا۔

اتنی صفائی کے ساتھ وہ پشت میں خنجر گھونپ دینا چاہتی تھی جس قدر صفائی کے ساتھ ماہ رو اور عون نے اس کی پشت میں خنجر اتار دیا تھا اور پورے زمانے کے سامنے معصوم اور مظلوم بھی بن چکے تھے۔ ان سے بڑھ کر ہوشیار بھلا کون تھا؟ اور اب فریحہ باقاعدہ طور پر اپنی گیم کا آغاز کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ حالات سازگار بھی تھے اور کنٹرول میں بھی تھے۔

عون ایک مرتبہ پھر اس کی مٹھی میں تھا۔ کیونکہ فریحہ سے شادی توڑنے کے گلٹ (گناہ) اور شرمساری کے فیز سے نہیں نکلا تھا نہ فریحہ اسے نکلنے دینا چاہتی تھی۔

وہ عون سے اس وقت ہر بات منوا لینے کی پوزیشن میں آچکی تھی۔ عون اسے مظلوم بھی سمجھتا تھا اور اپنا ہمدرد بھی۔۔۔ یوں فریحہ کو اپنی پلاننگ فل طریقے سے ہینڈل کرنے کے لیے سازگار حالات مل گئے تھے۔

اگر اس گیم میں ماہ رو کو مات ہوئی 'فریحہ کی خواہش کے عین مطابق عون اسے طلاق دے دیتا تو یہ فریحہ کی پہلی کامیابی تھی۔

طلاق کے بعد اگر عون فریحہ کی طرف بڑھ آتا۔۔۔ اس سے شادی کی خواہش کا اظہار کرتا تو یہ فریحہ کی دوسری کامیابی تھی۔

اور اگر عون 'ماہ رو کو طلاق دے کر فریحہ تک نہ بھی آتا۔ فریحہ سے شادی نہ بھی کرتا تب بھی فریحہ شکست خوردہ کبھی نہ ہوتی۔ فاتح ہی رہتی۔ اس لیے کہ دنیا بڑی وسیع تھی اور ایک عون عباس پہ ختم نہیں ہو جاتی تھی۔ لیکن فریحہ یہ نہیں جانتی تھی ماہ رو سرفراز کے لیے دنیا بڑی چھوٹی تھی اور صرف اور صرف عون عباس پہ ختم ہو جاتی تھی۔



اور کبھی کبھی زندگی میں در آنے والا ایک لمحہ پوری زندگی کو بدل دیتا ہے۔

ماہ رو کی زندگی میں وہ خوش نصیب لمحہ جگمگاتا ہوا آ گیا تھا۔ وہ پوری عمر بھی اس گھر میں عون کی بے اعتنائی سہتے سہتے گزار دیتی تب بھی اس ایک لمحے کی سرشاری کا خاتمہ کبھی نہ ہوتا۔ وہ ایک لمحہ جو پوری زندگی پہ بھاری تھا۔ وہ ایک لمحہ جو پوری زندگی پہ محیط تھا۔ وہ اس ایک لمحے کی عنایت پہ ایسی معطر ہو چکی تھی کہ اس کی جیٹھانیاں ماہ رو سے پوچھ پوچھ کے تھک جاتیں۔

"ماہ رو! بتا دو گلابوں میں ڈھل کر کہاں سے آ گئی ہو؟" ثنا مسکرا مسکرا کر کہہ دیتی۔ پھر اسے چھیڑتی۔

"یاروں سے بھی پردہ داری۔۔۔؟" کبھی مریم حیرانی سے پوچھنے لگتی۔

"بنارسی صبح نے تم پہ سایہ کر رکھا ہے۔۔۔ یا دیور جی کا کمال لگتا ہے۔" اس کی حیرانگی اور تعجب کسی طور پہ کم نہیں ہوتا تھا۔ اور ماہ رو ہنس ہنس کر بے حال ہو جاتی۔ گل و گلزار ہو جاتی۔ سراپا گلاب ہو جاتی۔ ان دونوں ماہ رو پہ دلکشی کا ہن برس رہا تھا۔

کئی مرتبہ تو عون بھی چونک جاتا۔ ٹھٹک جاتا۔ پھر جھنجلا جاتا۔

"تم یہ پارلروں کے چکر لگانے بند کر دو۔" عون کے غصے پہ ماہ رو حیران رہ جاتی۔

"میں تو عرصہ ہوا پارلر نہیں گئی۔" ماہ رو سر تھام کے بیٹھ جاتی تھی۔ "یہ عون بھی نا۔۔۔"

"تو پھر؟ یہ۔۔۔" وہ اس کے حسن پہ کمنٹ دیتا دیتا رک جاتا تھا۔ تعریف کرنا تو گوارا ہی نہیں تھا۔ بس تنقید کر سکتا تھا اور تنقید بڑی دل جمعی سے کرتا تھا۔

"یہ تمہارا حسن نظر ہے۔۔۔ اور کچھ نہیں۔" ماہ رو بھی شرارتاً اسے چھیڑنے لگتی۔

"میں تمہیں اتنی حسین لگتی ہوں۔ حالانکہ یہ ڈریس رات سے پہن رکھا ہے۔۔۔ اور بال بنانے کا بھی ٹائم نہیں ملا۔" وہ بھی ماہ رو سرفراز تھی۔ بات کی جان ہی نہ چھوڑتی۔ گھما پھرا کر جتاتی۔

"اور آج تو منہ بھی نہیں دھویا۔" اس کی آنکھیں جگر جگر کرتیں اور مسکراہٹ ہونٹوں سے کبھی جدا نہ ہوتی اور تب عون جھنجلا کر باہر نکل جاتا تھا جیسے لاجواب ہو جاتا تھا۔

وہ ایسا ہی ایک بھیگا بھیگا سا دن تھا۔

موسم کے بدلتے ہی گرمی کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ پھر یہ برسات کے دن تھے۔ کبھی کبھی تو متواتر بارش ہوتی۔ رات دن لگاتار مینہ برستا تھا۔ بہت سہانا سماں ہو گیا۔ بڑے خوش گوار دن اور بڑی پر سکون ٹھنڈی راتیں ہو چکی تھیں۔

ڈیڈی کو کچھ ہارٹ ٹربلنگ ہوئی تو شازمہ انہیں ابراڈ لے جا رہی تھی۔ ان کا منتھلی (ماہانہ) چیک اپ کروانے۔ جانے سے پہلے وہ لوگ ماہ رو کے گھر ملنے کے لیے آئے تھے۔ اور ڈیڈی ہنستی مسکراتی ہیروں کی طرح دمکتی ماہ رو کو دیکھ کر ہمیشہ کے لیے مطمئن ہو گئے تھے۔ اور جب ڈیڈی لوگ جانے لگے تب ڈیڈی سے عون کی امی نے بڑی سادگی بھرے لہجے میں کہا۔

"آپ جب آئیں گے بھائی صاحب! تو عون کا ولیمہ کروں گی بہت دھوم دھام سے۔" امی کے سادگی بھرے لہجے میں کہے گئے الفاظ پہ ڈیڈی تو مسکرا کر سر ہلا گئے تھے لیکن شازمہ نے اپنا مخصوص کھٹا میٹھا انداز اپنا کر بات پکڑنا ضروری سمجھا تھا۔

وہ نزاکت سے مسکراتی ہوئی بڑے انداز میں بولی۔

"بہن! کچھ زیادہ جلدی نہیں کر رہے آپ۔ ایک سال بعد کر لیتے۔۔۔ ابھی تو صرف دو ماہ ہی گزرے ہیں۔" شازمہ کے مخصوص کھنکتے لہجے اور الفاظ پہ مریم

"ثنا" کائنات اور ماہ رو ہنس ہنس کر بے حال ہو چکی تھیں۔ تب مریم نے ثنا کے کان میں گھس کر کہا۔

"ایک سال بعد ٹھیک رہے گا۔ تب تک بچہ بھی اپنے ابا کا ولیمہ اٹینڈ کرنے آجائے گا۔"

رات تک عون اور ماہ رو کا ولیمہ ہی ڈسکس ہوتا رہا۔ امی شازمہ کے طعنے پہ سیریس ہو چکی تھیں اور اب جلد از جلد عون کا ولیمہ کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن ظاہر ہے ڈیڈی کے واپس آجانے کے بعد ہی تقریب ہو سکتی تھی۔ بڑے ہال میں ہمیشہ کی طرح محفل جمی تھی۔ سب لوگ ہی موجود تھے۔ سوائے فریحہ کی فیملی کے۔

امی اور ابو ذرا الگ تھلگ کوئی گتھی سلجھانے میں مصروف تھے۔ باقی سب لوگ ذرا فاصلے پہ پھل جھڑیاں چھوڑتے عون کے ولیمے پہ تبصرے کر رہے تھے۔

کائنات کو اپنے ڈریس کی فکر پڑ گئی تھی۔ ثنا اور مریم بھی کپڑوں پہ ڈسکشن (گفتگو) کرنے لگیں۔ ماہ رو عاشر سے گپ لگا رہی تھی۔ جب عون بھی دفتر سے آگیا۔ خاصا تھکا تھکا لگ رہا تھا۔ نوکری اور اپنے کام میں بہت فرق تھا۔ وہاں حکم چلانا ہوتا تھا۔ نوکری میں حکم ماننا ہوتا تھا۔ سو اچھے بھلے جاب کا شوق پورا کرتے ہوئے صاحب کے کس بل نکل رہے تھے۔

عون کے آتے ہی محفل کا رنگ بدل گیا تھا۔ ثنا اور مریم جیسے فارم میں آگئیں۔

"دیور جی! آپ کے لیے خوش خبری ہے۔" ثنا نے مسکراتے ہوئے عون کو بھی گفتگو میں شامل کیا۔

"ہیں جی؟ کون سی؟ کیا ماہ رو بھی اپنے ڈیڈی کے ساتھ ابراڈ جا رہی ہے؟" عون نے اس انداز میں کہا۔ جیسے اس خبر کے لیے کان ترس رہے تھے۔ ماہ رو کا اچھا بھلا موڈ خراب ہوا تھا۔

"تم مجھ سے اتنے تنگ ہو تو چلی جاتی ہوں۔" وہ تنک کر بولی تھی۔ منہ میں آئی منہ پہ مار دیتی تھی آخر ماہ رو سرفراز تھی۔

"دھمکی کیوں دیتی ہو، عمل کر کے دکھاؤ۔" عون نے اسے اور بھی تپ چڑھائی تھی۔ ان کی ایسی گرما گرم لڑائیاں عام روٹین کا حصہ تھیں۔ ایک سیر تھا دوسرا سوا سیر۔ برداشت دونوں میں بالکل نہیں تھی۔

ثنا کو بیچ میں مداخلت کر کے سیز فائر کروانا پڑا تھا۔ پھر وہ ڈپٹ کر رعب سے بولی۔

"دیور جی! آپ ہمیشہ رنگ میں بھنگ ڈالتے ہیں۔"

"اسے اٹھا کر باہر پھینک آؤ۔" عاشر نے بڑا مخلصانہ مشورہ دیا تھا۔

"عون کو باہر پھینک دیا تو ولیمہ کس کا کریں گے۔" مریم نے عاشر کو دھپ لگائی تھی۔ تب اٹھتا ہوا عون لحہ بھر کے لیے چونک گیا تھا۔

"ولیمہ؟" اس نے حیرت سے حاضرین محفل کو دیکھا تھا۔ "کس کا ولیمہ ہوگا؟"

"تمہارا۔" ثنا نے مسکرا کر بتایا۔

"لیکن کیوں؟" عون نے تعجب سے پوچھا۔

"گھامڑ! ولیمہ کیوں کیا جاتا ہے؟ اعلان شادی کے لیے... امی چاہتی ہیں سارے رشتے داروں کو اکٹھا کیا جائے۔" عاشر نے بھنا کر کہا تھا۔ عون چڑ سا گیا۔

"تاکہ پھر تماشا لگے؟" وہ تپ کر اٹھنے لگا تھا۔ پھر عاشر نے ٹانگ مار کر اسے واپس بٹھالیا۔

"جو بھی کہو... ولیمہ تو ہو کر رہے گا۔" اس نے اطلاعاً "عرض کیا تھا۔ تاکہ عون سمجھ لے۔ امی ابو نے فائنل فیصلہ کر دیا ہے۔ سو اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی تھی۔ کچھ سوچ کر عون بھی چپ کر گیا۔ پھر دلچسپی سے ان کی باتیں سنتی ماہ رو کو دیکھنے لگا۔ وہ اپنے مخصوص اسٹائلش پیرہن میں بال بکھرائے مسکرا رہی تھی۔ جیسے ان کی گفتگو انجوائے کر رہی تھی۔ اس کے لمبے کھلے ریشمی بال دائیں کندھے پہ آگے کی طرف گرے ہوئے تھے۔

عون کو خواہ مخواہ الجھن ہونے لگی۔ ایک تو اس کی لاپروائیاں...؟

ارد گرد تین چار دیور بیٹھے تھے۔ ساس سسر بھی موجود تھے اور محترمہ بیچ میں بال کھولے بڑی بے حیائی سے اپنا ولیمہ ڈسکس کر رہی تھیں۔ ثنا اور مریم سے

لباس فاخرہ کے متعلق گفت و شنید ہو رہی تھی۔

عون نے لمحہ بھر کے لیے سوچا تھا پھر اٹھ کر جانے سے پہلے بولا۔

"اتنی جلدی بھی کیا ہے ولیمہ کی۔ میرے دونوں ولیمہ اکٹھے ہی کرلینا۔" وہ طنزیہ انداز میں مسکراتا ہوا ماہ رو کو دیکھ کر اور بھی مسکراہٹ کو پھیلا رہا تھا۔ اور ماہ رو کی مسکراہٹ ایک لمحے میں ہی سمٹ گئی تھی۔

حاضرین کو جب عون کی بات سمجھ میں آئی تو سب نے اسے ملامت کرنا شروع کردیا۔ عون نے کان دبا کر نکل جانا ہی مناسب سمجھا... لیکن جانے سے پہلے فریحہ کا ضرور پوچھا تھا۔

"فریحہ کہاں ہے؟ کھانا کون دے گا؟ اتنی بھوک لگی ہے۔ کسی کو کھانا پوچھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ فریحہ نہ ہو تو ہم لوگ بھوکے ہی مرجائیں۔" وہ دل کی جلن باہر نکالتا مڑنے لگا جب ثنا اور مریم بیک وقت بول پڑی تھیں۔ ان دونوں کو اچھا بھلا غصہ آگیا تھا۔ عون کو کان دبانے ہی پڑے تھے۔

"کھانا تمہاری بیوی دے گی اور پکایا تمہاری بھابھیوں نے ہے۔ ہمارے ہاتھ سلامت ہیں۔ ہم فریحہ کے محتاج نہیں۔" ثنا اور مریم نے اچھی بھلی کلاس لی تو عون جان چھڑاتا بھاگ نکلا تھا۔ تب ماہ رو بھی جلدی سے کشن کو دے کر اکر بھاگتی ہوئی کچن میں آگئی تھی۔



اس نے کھانا اوون میں گرم کر کے کچن ٹیبل پہ ہی لگا دیا تھا۔ عام روٹین میں کھانا دستر خوان پہ ہی لگا کرتا تھا لیکن جب یوں الگ الگ کھانا پڑتا تو جیسے دل چاہتا ویسے کھا لیا جاتا۔ چاہے اپنے کمرے میں یا پھر کچن میں۔ آج چکن منچورین تھا۔ ساتھ تندوری روٹی، سلاد اور رائتہ۔ ماہ رو کھانا لگا کر اس کا انتظار کرنے لگی تھی۔ وہ کچھ دیر بعد فریش سا کچن میں آہی گیا تھا۔ جیسے ہی وہ اسٹول کھینچ کر بیٹھا، ماہ رو بھی برابر ہی بیٹھ گئی۔ پھر اس نے اسٹول کھینچ کر تھوڑا پیچھے کیا تھا کیونکہ ساتھ اسٹول رکھنے پہ عون نے گھورنے کی کوشش فرمائی تھی۔

ماہ رو نے اس دفعہ اسٹول مقابل رکھ لیا تھا۔ اب وہ عون کے لیے سالن نکال رہی تھی۔ پھر سلاد سامنے کیا۔ اور گلاس میں پانی ڈالا۔ جیسے ہی عون نے پہلا روٹی کا نوالہ توڑا... ماہ رو نے بھی اپنی روٹی کا نوالہ توڑ لیا۔ عون نے تھوڑا ترچھی نظر سے ماہ رو کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا؟ رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔" ماہ رو نے بے ساختہ نفی میں سر ہلا کر زبان بھی برابر ہلائی تھی۔

"نہیں۔"

"کیوں؟" عون نے پوچھا۔

"تمہارا انتظار کر رہی تھی..." ماہ رو نے بنا جھجک کے بتا دیا تھا۔ حاضر جواب تو وہ بلا کی تھی اور اعتماد بھی لاجواب تھا۔

"وجہ؟" اس نے ایک بھوں اچکا کر کہا۔

"تاکہ ایک ساتھ کھانا کھائیں..." ماہ رو نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔ دونوں کا پہلا پہلا نوالہ ابھی ہاتھ میں ہی تھا۔ وہ نوالہ ہاتھ میں پکڑے کچھ متعجب ہوا۔

"آج سے پہلے یہ تردد کیوں نہیں کیا؟"

"تاکہ تمہیں برا نہ لگے۔" جواب برجستہ تھا۔

"اور اگر اب برا لگے تو؟" عون نے گہرے لہجے میں کہا۔ "کیا تم کھانا چھوڑ دوگی؟"

"نہیں۔" اس کی سنجیدگی قابل دید تھی۔

"تم زبردستی کروگی؟" اس نے پھر سے سوال کیا۔

"ہاں۔" ماہ رو نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کیونکہ تم زبردستی کرنے کی عادی ہو۔" اس کا لہجہ کچھ طنزیہ ہو گیا۔ ماہ رو نے شدومد سے ایک مرتبہ پھر سر ہلایا۔

"واقعی۔"

"اور تم جوتوں سمیت آنکھوں میں بھی گھس جاتی ہو رائٹ؟" عون نے پھر سے طنزیہ لہجہ اپنایا۔

"اور جوتوں سمیت دل میں بھی گھس جاتی ہوں رائٹ؟" اس نے عون کے انداز میں جواب دیتے ہوئے سوال کیا تھا۔ عون اب تو لمحہ بھر کے لیے چپ ہوا۔ اور جب وہ جواب دینا نہیں چاہتا تو بات بدل دیتا تھا اور یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ اور وہ اس پہ پورا پورا قائم تھا۔ اس نے اب بھی بات بدل دی تھی اور بات کو وہیں پہ لے گیا تھا جہاں سے شروعات ہوئی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر سابقہ انداز میں کہا۔

"اور اگر میں رات بھر نہ آتا تو؟" وہ پوچھنا چاہ رہا تھا اگر وہ رات کو آتا ہی نا۔ کسی کام سے رک جاتا۔ آؤٹ آف سٹیشن چلا جاتا تو پھر ماہ رو کیا کرتی۔ کیا رات بھر بھوکا رہتی؟ یقیناً "نہیں۔"

"پھر میں انتظار کرتی۔۔۔ لیکن کھانا نہ کھاتی۔" ماہ رو نے اسے تعجب میں ڈال دیا تھا۔ وہ لمحہ بھر کی لیے بھونچکارہ گیا تھا۔ پھر اس نے کندھے اچکا دیے۔

"یہ تو احمقانہ سی بات ہے۔" اس کا انداز مذاق اڑانے والا تھا۔

"تم نے محبت کو کب سمجھ دار دیکھا ہے؟" ماہ رو کا لہجہ کٹیلا تھا۔ وہ جیسے اندر ہی اندر متاثر ہوا تھا۔ یعنی محترمہ کو بولنا آتا تھا اور اچھا ہی بولنا آتا تھا۔

"محبت بیچ میں کہاں سے آگئی؟" عون نے برا مانتے ہوئے کہا تھا۔ جیسے محبت کا لفظ سن کر بہت برا لگا تھا۔ دل چاہا محبت کو کہیں دور ہی پھینک آئے۔ اسے ویں خوار کرتی تھی۔

"محبت بیچ میں نہ ہوتی تو میں بھی یہاں نہ ہوتی۔" ماہ رو کا دل بجھ گیا۔ افسردہ ہو گیا۔ وہ لمحہ بھر میں رنجیدہ ہو گئی تھی۔ عون اس کے بدلتے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کا چہرہ پڑھ رہا تھا۔ وہ اس کی شکستگی کو بھی سمجھ گیا تھا۔ وہ یہاں کیوں تھی؟ عون کھوج گیا۔ لیکن پھر بھی ایک پھانس تو تھی ہی۔

"کیا تم مجھ سے واقعی ہی محبت کرتی ہو؟" اس کا انداز بڑا ہی عجیب تھا۔ بالکل نہ سمجھ میں آنے والا۔

"کیسے یقین دلاؤں؟ شاید کوئی پیمانہ ہوتا اور ناپ لیا جاتا۔" وہ دل ہی دل میں بڑبڑائی تھی۔

"اگر محبت ہے تو اسے ثابت کر کے دکھاؤ؟" اس کا انداز ایک مرتبہ پھر عجیب تھا۔ چیلنجنگ سا۔ تحریک دلاتا۔ اکساتا۔ ماہ رو سوچ میں پڑ گئی تھی۔ اگر محبت کی جائے یا محبت ہو جائے تو کیا ثبوت مانگتی ہے۔ کیا ہر محبوب ثبوت چاہتا ہے؟ ثبوت کیسے لایا جاتا ہے؟ ثبوت کس طرح سے لایا جاتا ہے؟ وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔

"تم ایک مرتبہ پہلے بھی یہی سوال کر چکے ہو۔" ماہ رو اسے پلازہ میں ہونے والی ملاقات یاد دلا رہی تھی۔ جو یقیناً "خوش گوار نہیں تھی۔

"تب تم نے مجھے مطمئن کیا تھا؟" اس کا انداز طنز سے اچانک پاک ہو گیا تھا۔ یوں کہ بالکل سادہ لہجے میں بات کرنا وہ ماہ رو کو بہت ہی عجیب لگا تھا۔

"نہیں۔" اس کی آواز مدہم ہو گئی تھی۔

"اور اب؟" عون کی آنکھوں میں لکیر سی ابھری تھی جو لمحہ بھر میں ہی معدوم ہو گئی تھی۔ اس کا انداز سوچتا ہوا تھا۔ کچھ جانچتا ہوا تھا۔

"کیسا ثبوت چاہتے ہو؟" ماہ رو نے بہت دیر کی خاموشی کے بعد بڑے گہرے عمیق لہجے میں پوچھا تھا۔ ایک اذیت ناک تکلیف سے گزرتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس سے بڑھ کر تکلیف وہ مقام کون سا تھا جسے آپ چاہتے ہوں۔ جس کے لیے ہر کشٹ اٹھا کر آئے ہوں۔ جس کے لیے آگ کے دریا پار کر کے آئے ہوں۔ وہ آپ کی محبت پہ یقین ہی نہ کرتا ہو جو ثبوت مانگ کر محبت کی ماری سچائی کو آلودہ کر دے۔ جو محبت کو بری طرح سے شرمندہ کر دے۔

"جو مجھے سیٹسفائڈ (مطمئن) کر سکے۔ میں یقین کر سکوں کہ واقعی تمہیں مجھ سے محبت تھی کوئی سازش نہیں۔" عون کی سوئی وہیں پہ اٹکی۔ وہاں سے نہ ہٹتی تھی نہ آگے بڑھتی تھی۔ ماہ رو نے گہرا سانس خارج کیا۔

"میری اس گھر میں موجودگی تمہیں کیا لگتی ہے؟ کوئی سازش ہوتی تو اب تک کھل جاتی۔ میں تمہارے لیے یہاں ہوں۔ تمہارے لیے خود کو بدل

رہی ہوں۔ میں وہ نہیں تھی جو اب ہو چکی ہوں۔ اور میں نے ہر تبدیلی کو بخوشی قبول کیا ہے۔ میں نے زبردستی خود کو اس ماحول میں نہیں ڈھالا۔ کیا پھر بھی ثبوت ہی چاہیے؟" اس کا انداز لمحہ بھر میں جارحانہ ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پہ دبی دبی سرخی اتر رہی تھی۔ دبا دبا غصہ چھا رہا تھا۔

عون اس کی طرف آنکھیں سکیڑ کر دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ پھر گہرا سانس کھینچ کر بولا۔

"تمہارا میری زندگی میں آنا ان ایکسپیکٹڈ (غیر متوقع) تھا۔ کوئی اس طرح بھی آتا ہے؟" اس نے جھرجھری سی لے کر تھوڑا عرصہ پہلے والی کیفیت سے خود کو نکالا تھا۔ جیسے ابھی بھی اس وقت کا خیال بڑا تکلیف دہ اور کسی حد تک متعجب کرنے والا تھا۔

"عون عباس....!" وہ دھیمے انداز میں مسکرائی تھی۔ خاصی زچ کر دینے والی مسکراہٹ تھی۔ جیسے جلتی پہ تیل ڈال دیا ہو۔ "جو میرے جیسے کردار ہوتے ہیں۔ وہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔" اس نے اپنی بات پہ زور دے کر کہا۔

"یعنی سر پھرے؟" عون نے تائید چاہی تھی۔ ماہ رو کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ چمک گئی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ پھر اس کے ہاتھ میں پکڑے روٹی کے ٹکڑے کو دیکھ کر بولی۔

"کھاؤ نا۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" وہ خود بڑی بے تکلفی کے ساتھ عون کی پلیٹ سے سالن لیتی مزے سے آدھی روٹی باتوں باتوں میں کھا چکی تھی۔ عون کا نوالہ وہیں کا وہیں تھا۔ اور وہ بڑی حیرت سے ماہ رو کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ڈونگے کی طرف دیکھا تھا۔ وہاں سالن پیندے سے چپکا بس برائے نام تھا۔ عون نے بھوک سے تنگ آ کر کھانا شروع کر دیا۔ ورنہ وہ تو باقی سالن منٹوں میں چٹ کر دیتی۔

جس طرح اس نے نہایت دیدہ دلیری سے روٹی شیئر کر لی تھی۔ سالن بھی شیئر کر لیا تھا۔ پھر پانی کو کیسے بخشتی؟ اس کا اس کی طرف بڑھتا ہاتھ دیکھ کر عون عجلت میں بول پڑا۔

"ہمارے گھر میں ایک ہی گلاس ہے کیا؟" اس کا پیاس سے حلق سوکھ رہا تھا۔ لیکن اس نے گلاس نہیں اٹھایا۔

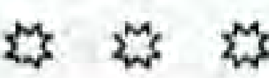
"نہیں تو، اور بھی اسٹینڈ پہ لگے ہیں۔" اس نے آدھا گلاس خالی کر کے بچے ہوئے پانی میں اور پانی ڈال دیا تھا۔ وہ اس کی ساری کارروائیاں دیکھتا رہا تھا۔ پھر خاصی ناگواری سے کہہ اٹھا۔

"میں نے کبھی کسی کا جھوٹا پانی نہیں پیا۔" وہ شدید جھنجلاہٹ کا شکار تھا۔ ماہ رو کو اندر ہی اندر سے زچ کر کے مزا آیا تھا۔ وہ بڑی معصومیت سے چہک کر بولی تھی۔

"لیکن میرا تو پینا پڑے گا۔ کیونکہ یہ ابلے ہوئے پانی کی آخری بوتل تھی۔ پہلے سے آدھی، جس میں سے ڈیڑھ گلاس میں نے پانی پی لیا ہے۔ اب یہ آخری گلاس پانی بچا ہے۔ چاہو تو پی لو۔ یا پھر صبح تک انتظار کرو۔" ماہ رو آنکھوں میں ڈھیر ساری شرارتی چمک لے کر عون کی طرف دیکھتی بڑی معصوم بن رہی تھی۔ اتنی معصوم کے عون کو اس کی معصومیت پہ تاؤ آ گیا۔ وہ آفس سے آ کر بھی ایک گھونٹ پانی نہیں پی سکا تھا۔ اور اب حلق میں پیاس کی شدت سے کانٹے اگ رہے تھے۔ عون نے ایک سلگتی نظر مسکراتی ہوئی ماہ رو پہ ڈالی تھی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر گلاس اٹھا لیا۔ جب وہ پانی پی چکا، گلاس خالی ہو چکا تب ماہ رو نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے ثنا بھابھی نے بتایا تھا۔ ایک پلیٹ میں کھانا کھانے سے اور ایک دوسرے کا جھوٹا پانی پینے سے محبت بڑھتی ہے۔ اس لیے سوچا۔ یہ ٹرک آزمالوں۔" اب وہ بڑی معصومیت سے فریج کھول کر پانی کی دوسری بوتل نکال کر ٹیبل پہ رکھ رہی تھی یوں کہ عون کا دماغ جیسے تپ اٹھا تھا۔ وہ جھلا کر اسٹول کھینچتا اٹھ کھڑا۔

"تم بہت چالاک ہو۔" ماہ رو کی کھلکھلاتی ہنسی کی آواز اسے پیر پٹخنے پہ مجبور کر چکی تھی۔ وہ کچن سے واک آؤٹ کر گیا۔



"تم چائے نہیں لو گے؟" ایک گنگناتی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ اس نے جلدی سے تکیہ اٹھا کر کانوں پر رکھ لیا۔ تازہ تازہ ڈانٹ کھا کے آیا تھا۔ ابھی غصہ برقرار تھا۔ کیا خبر چائے بھی جھوٹی پلا دے۔ محبت بڑھانے کے چکر میں۔ کوئی اس سے پوچھتا تو سہی۔ محبت ہوتی تو بڑھتی نا۔ اگر ہو گی نہیں تو بڑھے گی کیسے۔ اور جھوٹا کھانا پینے سے کیسے بڑھ جاتی ہے؟ حد ہو گئی؟ یہ ثنا بھابھی کے فرمودات لے ڈوبیں گے اسے۔ آج کل لگتا تھا ثنا بھابھی اس کی کلاس لے رہی تھی۔ اور اس کے مشوروں پہ عمل کر رہی تھی۔ جیسے صنم خود ڈوبے تھے اب اسے بھی ڈبونا چاہتے تھے۔ یہ تو اس کا بے چارا بھائی تھا جس نے ثنا بھابھی سے گزارا کر لیا۔ ورنہ ایسی باتونی عورت۔ اتنی لمبی زبان۔۔۔ بس چلتا تو کاٹ ہی ڈالتا۔۔۔ اور اب اس ماہ رو کو پٹیاں پڑھائی جا رہی تھیں۔ تبھی اس کی زبان کو بھی کاٹ مل گئی۔ خیر زبان تو اس کی آل ریڈی (پہلے ہی سے) بہت تیز دھار جیسی تھی۔ ثنا بے چاری کا تو نام ایسے ہی بدنام ہو گیا۔

اور کچھ دیر پہلے ثنا کی ٹپ اس پہ آزما کر وہ کس قدر خوش تھی۔ آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔ چہرہ ٹیوب لائٹ سے زیادہ روشن تھا۔ ہونٹوں سے مسکراہٹ جدا نہیں ہو رہی تھی۔ جیسے عون کو اپنا جھوٹا پانی پلا کر دنیا فتح کر لی ہو۔ ماؤنٹ ایورسٹ سر کر لیا ہو۔ بحر ہند میں ڈبکی لگا کر زندہ سلامت واپس آ گئی ہو۔ اور اب عون کے سر پہ کھڑی مسلسل بزر بجا رہی تھی۔

"بولو نا۔۔۔ کیا چائے لاؤں؟" اس نے تکیہ اٹھا کر عون کے کان پاس چلانا چاہا تھا۔ وہ دوسرا تکیہ ہاتھ مارتا تلاش کر تارہ گیا تھا۔

"پھر جھوٹی چائے؟" وہ بڑبڑایا۔

"پرامس (وعدہ) جھوٹی نہیں لاؤں گی اب۔" ماہ رو نے یقین دلانا چاہا تھا۔

"میں کیسے یقین کر لوں؟" عون نے تکیے میں منہ گھسیٹرتے ہوئے کہا تھا۔ ماہ رو سوچ میں پڑ گئی۔

"تم میرے ساتھ کچن میں آ جاؤ۔" کافی دیر سوچنے کے بعد اس نے مشورہ دیا تھا۔ عون جھٹ سے بول پڑا

"مجھے معاف کرو، میں نے جوشاندہ نہیں پینا۔۔۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے تھے۔

"لیکن میں اچھی چائے بنانا سیکھ چکی ہوں۔ اور سویٹ ڈش بھی۔ کسی دن تمہیں بھی ٹرائی کرواؤں گی۔" ماہ رو نے اپنا ارادہ ظاہر کیا تھا تب عون جھنجھنا گیا۔

"تم اپنا بزر بند کرو۔ مجھے چائے نہیں پینا۔" جانے کون سی جھلاہٹ تھی جسے خواہ مخواہ نکال رہا تھا۔

"ویل۔۔۔ نہیں تو نہ سہی باہر ایسی رومانٹک بارش ہو رہی ہے۔ اتنا قیامت موسم ہے۔ نہ پیو چائے۔ ایسے موسم میں تو چائے دیوانہ کرتی ہے۔" ماہ رو نے بارش کی گھنٹیوں پہ کان لگا کر اسے جتلا جتلا کر کہا تھا۔ عون نے تکیے کے نیچے سے منہ نکال کر اسے اک نظر دیکھا تھا۔ وہ سبز درپچوں کے پار ہونے والے شور کو سن کر خوش ہو رہی تھی۔

"میں حواسوں میں ہی رہنا چاہتا ہوں۔ دیوانہ نہیں ہونا چاہتا۔" عون نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ بارش کی آواز سے کان ہٹا چکی تھی۔

"بہت ہی بورنگ آدمی ہے۔" وہ اس کی ہمیشہ والی بے زاری، جھلاہٹ، ناگواری پہ کمنٹ دیتی خود دوبارہ کچن میں چلی گئی تھی۔ پھر چائے بناتے ہوئے اسے کریم یاد آ گیا۔ رات کے اڑھائی بجے بھی اسے چائے کی طلب ہوتی تو محض ایک بٹن دبانے کی دیر ہوتی تھی۔ کریم چائے بنا کر منٹوں میں لے آتا تھا۔

اور اس وقت ماہ رو رات کے پونے ایک بجے خود اپنے لیے چائے بنا رہی تھی۔ جوشاندہ سے کچھ بہتر، بہر حال چائے تو تھی ہی۔۔۔ اور عون کہتا تھا اپنی محبت کا ثبوت دو۔ کیا یہ کم ثبوت تھا؟ ماہ رو ایک چھوٹے سے گھر کے چھوٹے سے کچن میں کھڑی اپنے ہاتھوں سے چائے بنا رہی تھی۔ اور عون کو یقین نہیں آتا تھا۔ اور پتا نہیں کیوں یقین نہیں آتا تھا؟

اس کے دل میں آزردگی کی کن من ہونے لگی، باہر موسم بھیگ رہا تھا اور اندر ماہ رو کا من بھیگ رہا تھا۔

بارشیں اچھی ہوتی ہیں لیکن افسردہ کرتی ہیں۔ یادوں کے بھیگتے نخلستان میں لے جاتی ہیں۔

اور ابھی اس نے کڑوی کسیلی چائے کا ایک سپ لیا ہی تھا جب اچانک موسم بپھر گیا۔ ہلکی کن من طوفانی بارش میں بدل گئی تھی۔ ایک دم درختوں کی شائیں شائیں حواسوں پہ چھانے لگی۔ آندھی کے تیز جھکڑوں کے ساتھ دھڑ دھڑ اولے بھی گرنے لگے تو ماہ رو کی چیخ نکل گئی تھی۔ رومانٹک بارش تو طوفانی بارش میں اچانک بدل چکی تھی۔ اوپر سے گاہے بگاہے بجلی کڑکتی اور بند روشن دانوں 'کھڑکیوں کی درزوں سے لپکتی ہوئی اندر آتی۔ خوفزدہ کرتی۔ چیخنے پہ مجبور کردیتی تھی۔

ماہ رو نے چائے کا کپ وہیں ٹیبل پہ پٹخا اور اندر بھاگ آئی۔ رومانٹک موسم میں چائے پینے کا شوق دھرے کا دھرا رہ گیا تھا۔ خوف کے مارے اس کی گھگھی بندھ گئی تھی۔ اس نے ٹھک سے دروازہ بند کیا اور جلدی سے بیڈ پہ آگئی۔ عون نے ٹھک کی آواز پہ ذرا گردن اونچی کرکے دیکھا تھا پھر تکیے میں منہ گھسا لیا۔ کمفوٹر میں گھسنے کے بعد اس نے آنکھیں موندلی تھیں لیکن باہر ہوتی گرج چمک سے خوفزدہ ہوکر پھر سے کھول لیں۔ اچھی بھلی کن من چل رہی تھی۔ سج سج اترتی بوندیں 'بارش کا ہلکا شور اسے بڑا فیسی نیٹ (گرویدہ) کرتا تھا۔ اوپر سے ٹھنڈی ٹھنڈی پون بڑی رومانٹک لگتی۔

بارشیں خاصی رومانٹک ہوتی ہیں لیکن طوفان؟

''اللہ کی پناہ۔'' بجلی کے کڑکتے ہی اس نے دل ہی دل میں کہا۔ خوف کے مارے اچھی بھلی خنکی میں پسینہ آرہا تھا۔ وہاں ڈیڈی کے گھر تو کبھی آندھی 'طوفان' بارش کی خبر نہیں ہوتی تھی۔ چاہے جتنے مرضی طوفان آتے۔ گرج چمک ہوتی۔ پھر بھی کسی کو خبر نہ ہوتی۔ ساؤنڈ پروف گھر کی وجہ سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ صبح اٹھ کر ہی خبر ہوتی کہ رات بڑا طوفان آیا تھا۔ یا نیوز چینلز بتاتے تھے کہ طوفان نے کس کس جگہ تباہی مچائی تھی۔

اور یہاں... ؟ تو ایسے لگتا تھا جیسے طوفان کھڑکیوں اور روشن دانوں کے شیشے توڑ کر اندر گھس آئے گا۔ اس نے مارے خوف کے کھڑکیوں اور روشن دانوں کی چٹخنیوں کو لرزتے کانپتے چرچراتے دیکھا تھا۔ معاً عون کی آواز تکیے کے پیچھے سے آئی۔

''لائٹ تمہارے باپ کے نوکر آکے بند کریں گے۔'' جانے اسے کس بات کی جھنجلاہٹ تھی۔ خوامخواہ چڑتا 'لڑتا اور جھلاتا تھا۔

ماہ رو نے گردن گھما کر عون کی طرف دیکھا۔ جیسے تشکر بھرا سانس خارج کیا ہو۔

''تھینک گاڈ! یہ جاگ رہا ہے۔'' وہ اندر ہی اندر کچھ مطمئن ہوئی تھی۔ ورنہ بپھرتے طوفان 'کڑکتی بارش میں تنہا جاگ کر بارش اور طوفان کی دہلانے والی شائیں شائیں کو سننا بڑا بھیانک تھا۔

''نہیں تم کروگے۔'' اس نے آنکھیں میچے میچے جواب دیا تھا۔ آواز خاصی کانپتی سی تھی۔

''کیوں؟ تمہارے پیروں میں مہندی لگی ہے؟'' عون نے چڑتے ہوئے بھنا کر کہا۔

''نہیں میں لیٹ چکی ہوں۔'' اس نے عذر تراشا۔

''لیٹ چکی ہو۔ مر تو نہیں چکی۔'' وہ غصے میں کمفوٹر پھینک کر اٹھا۔ ماہ رو بھی جلدی سے حواس باختہ بولتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

''لائٹ بند کی تو شاید مرہی جاؤں۔'' اس کا لہجہ سخت روہانسا تھا۔ وہ مارے خوف کے سپید پڑتی جارہی تھی۔ عون ذرا کی ذرا ٹھٹکا۔ اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔ شاید سمجھ گیا تھا کہ وہ ڈر رہی ہے۔

''اچھا... '' اس کا انداز طنزیہ ہوگیا۔ ''اب کرونا... رومانٹک بارش کو انجوائے۔ بڑا رومانس چڑھ رہا تھا۔ تم پر اب آنکھیں میچ کر کمفوٹر میں گھسی ہو۔ نکلو باہر' مل کر انجوائے کرتے ہیں طوفانی بارش کو۔ آندھی کے جھکڑوں کو کڑکتی بجلی کو۔'' وہ منٹوں میں شروع ہوچکا تھا۔

''تمہیں تو موقع چاہیے مجھ پہ طنز کرنے کا۔'' ماہ رو روہانسی ہوگئی تھی۔ عون جان بوجھ کر لائٹ آف کر

کے دوبارہ اپنی جگہ پر جم کے لیٹ گیا تھا۔ جیسے ہی بتی بجھی تھی کمرے میں اندھیرا پھیل گیا۔ اب کڑکتی بجلی کے زیادہ اثرات دکھائی دیتے تھے جیسے ہی باہر بجلی کڑکتی روشن دان اور کھڑکی سے کوند کر کمرے میں گھس آتی تب ماہ رو کی گھٹی گھٹی چیخ منہ میں ہی دب کر رہ جاتی تھی اور عون سر کے نیچے دونوں ہاتھ رکھ کر اس کے خوف کو انجوائے کرتا ہوا بول رہا تھا۔

''مجھے تو روشنی میں نیند نہیں آتی۔''

''اور مجھے اندھیرے میں نہیں آتی ـــ'' ماہ رو نے بھنچی بھنچی آواز میں بتایا ''اوپر سے باہر کا بھیانک شور ہے۔''

''لیکن میں تو بہت انجوائے کر رہا ہوں۔ تم بھی کرو نا۔'' شاید اس کا باتیں کرنے کو دل کر رہا تھا یا پھر کوئی خواہش سی جاگی تھی یا ماحول کا فسوں' تنہائی یا اپنے اور ماہ رو کے درمیان رشتے کا خوب صورت احساس۔ آخر ایک انسان ہی تھا۔ بشری تقاضوں سے مبرا تو نہیں ہو سکتا تھا۔ اور بندہ ہر ایک سے تو جھگڑ سکتا تھا۔ ہر ایک سے جنگ کر سکتا تھا۔ لیکن فطرت سے لڑنا آسان نہیں تھا۔ عموماً'' انسان فطرت سے ہار جاتا تھا۔ اور فطرت کا جیتا جاگتا ایک احساس اس کے بائیں پہلو میں تھا اور دھڑک دھڑک کر اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ وہ کس طرح شوریدہ جذبات پہ بندھ باندھ لیتا۔ مچلتے احساسات کو روک پاتا۔ پاگل ہوتی دھڑکنوں کو قابو کر سکتا۔ دل کی بدلتی حالت کو معمول پہ لا پاتا۔ یہ کیسے ممکن تھا؟

اس نے کروٹ بدل کر ماہ رو کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے بہت قریب تھی۔ صرف چند سانسوں کے فاصلے پہ ـــ پھر بھی اس کے سینے کا زیروبم' سانسوں کا شور وہ محسوس کر سکتا تھا۔ وہ چت لیٹی تھی اور چھت کو گھور رہی تھی۔ یقیناً'' وہ خوف زدہ تھی۔ عون کا لہجہ اور انداز بدل گیا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے بھول گیا تھا۔ ان دونوں کے درمیان کتنے فاصلے تھے۔ کتنی بڑی خلیج تھی۔ اور عون کو یہ بھی بھول گیا تھا۔ اسے ماہ رو سے انتقام لینا ہے۔ فریحہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا بدلہ لینا ہے۔ اور اس پہ سوکن بھی لانی ہے۔ اور بھی جانے کیا کیا اس کے وہ سارے خوفناک ارادے دھڑ دھڑ کر کے خود بخود گر رہے تھے۔

اس نے کسی الہامی کیفیت میں گم ہو کر ماہ رو کے اوپر ہاتھ رکھا۔ تاکہ اسے متوجہ کر سکے۔ وہ جو چھت کو گھور گھور کے دیکھ رہی تھی عون کے لمس کو پا کر لمحہ بھر کے لیے دنگ رہ گئی۔ اس کا اوپر والا سانس اوپر اور نیچے والا سانس نیچے ہی دبا رہ گیا تھا۔

دل کی دھڑکنوں میں ایسا طلاطم بپا ہوا کہ اندر کا شور باہر کے شور پہ سبقت لے گیا تھا۔ پھر اسے عون کی دھیمی بوجھل آواز سنائی دی تھی۔ اس کا رواں رواں کان بن گیا تھا۔

''ڈر رہی ہو؟'' اس کا انداز بدل گیا۔ لہجہ بدل گیا۔ وہ بہت ملائمت سے پوچھ رہا تھا۔ ماہ رو نے اس کی گرم سانسیں اپنے چہرے پہ محسوس کی تھیں۔ یا پھر اس کے گال ہی گرم دھواں نکال رہے تھے۔ وہ سن سی ہو گئی۔

''ہاں۔'' ماہ رو کے ہونٹ بے آواز پھڑپھڑائے تھے۔

''کس سے؟'' وہ دھیمی آواز میں پوچھ رہا تھا۔ ماہ رو کا خوف بڑھ گیا۔ لیکن یہ خوف نہیں تھا۔ یہ کچھ اور ہی تھا۔ کوئی اور نوکیلا سا احساس چبھن دیتا۔ چونکاتا ہوا۔ تو کیا اپنے لیے؟ محض اپنے من کی خواہش پر؟ اپنی طلب کے لیے؟ جب چاہا پہلو میں بٹھایا جب چاہا دھتکار دیا؟

ماہ رو کی آنکھوں میں شب زفاف رڑکنے لگی تھی۔ وہ ذلت' وہ تکلیف' وہ خوابوں کا ٹوٹ جانا۔ عون کا دھتکار دینا۔ وہ تھپڑ جو ماہ رو کے گالوں پہ ابھی تک ایک یاد کی طرح نقش تھے۔

بھولنے کو تو ماہ رو ہمیشہ کے لیے بھول جاتی۔ کبھی اس وقت کو' اس اذیت اور درد کو یاد ہی نہ کرتی۔ اگر عون عباس کی طرف سے ایک لفظ معذرت کا سننے کو مل جاتا۔ صرف ایک حرف ملال کا اور بس ـــ وہ تو ماہ رو سرفراز کو بن مول کے بہت پہلے ہی خرید چکا تھا۔ وہ اپنے ڈھولن یار کی داسی تھی۔ لیکن وہ اپنے محبوب کی

صرف محبت' چاہ' الفت اور نظر التفات کی ہی پیاسی نہیں تھی۔

اسے اپنی کھوئی ہوئی عزت بھی چاہیے تھی۔ وقار بھی چاہیے تھا اور اپنی انا کی بھی ضرورت تھی۔ عزت نفس کی بھی ضرورت تھی اور عون جو اس وقت شجر سایہ دار کی طرح اس پہ اپنی چھاؤں کر رہا تھا۔ ماہ رو یہی تو چاہتی تھی۔ اس کا یہی تو اولین خواب تھا۔ تمنا تھی۔ خواہش تھی۔ لیکن اس طرح نہیں۔

"بولو! بولو نا ڈر لگ رہا ہے۔ کس سے؟" عون کی مخمور آواز اسے یادوں کے تلخ سمندر سے کھینچ کر باہر لے آئی تھی۔ ماہ رو نے ایک گھٹا گھٹا سانس سینے کی قید سے باہر نکالا۔ پھر اس کے منہ سے بے ارادہ ہی نکل گیا۔

"تم سے...." ماہ رو کے لفظوں میں جانے کون سا اثر تھا جو عون جھٹکا کھا کر حواسوں میں آگیا۔

"کیا؟" عون کا انداز بدل گیا تھا۔ وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتا سیدھا ہوا۔ پھر اس نے تکیے پہ اپنا سر گرا لیا تھا۔ اس کے دماغ میں سے دھواں نکلنے لگا۔

"او مائی گاڈ! آج پھر عون کو رہ رہ کر خود پہ غصہ آنے لگا۔ ماہ رو کیا سمجھتی ہوگی۔ دعوے آسمانوں جتنے کرتا ہوں اور.... اور چند کمزور لمحوں میں سارے اختیار خود سے کھو دیتا ہوں۔ میں اس قدر کمزور ہوں؟ لمحوں کے فسوں کا شکار ہو جاتا ہوں یا پھر اس ماہ رو سرفراز میں ہی کوئی ایسی کشش ہے جو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

ایک مرتبہ پھر شرمندگی کا حصار کھینچ رہا تھا۔ ایک مرتبہ پھر خود کو ملامت کر رہا تھا۔ معاً" اسی لمحے باہر بہت زور کی بجلی کڑکی تھی یوں لگا۔ روشن دانوں کو پھاڑتی ہوئی اندر آن گھسے گی۔ ماہ رو کی بے ساختہ چیخ نکل گئی تھی۔ اس۔ نے خوف کی انتہا پر بلا ارادہ ہی عون کا کندھا دبوچ لیا تھا۔ تب عون کی سنجیدہ سی سرد آواز اچانک سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

"مجھے نیند آرہی ہے۔ سونے دو' آدھی چیخیں کل تک اٹھا رکھو۔" وہ برفیلے لہجے میں بولتا کروٹ بدل گیا تھا یوں کہ ماہ رو آنسو بھری آنکھوں سے اس کی پشت دیکھتی رہ گئی تھی۔



اور عون کے ازلی دھوپ چھاؤں جیسے رویے کے ساتھ بڑی سبک خرامی سے وقت گزر رہا تھا۔ ماہ رو اب عون کے رویوں پہ جلتی' کڑھتی اور سسکتی نہیں تھی۔ عون کی روٹین بھی وہی تھی۔ اب بھی فریحہ ان کی زندگیوں میں بلاوجہ ہی مداخلت کرتی تھی اور عون سے اپنی اجارہ داری ختم کرنا نہیں چاہتی تھی۔

ادھر عون بھی بھاگ بھاگ کر فریحہ فریحہ' کرتا ہر کام میں اس سے مشورہ لیتا تھا۔ فریحہ بھی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔

اس دن خاندان میں کوئی فوتگی ہو گئی تھی' امی ابو' ثنا تینوں چلے گئے تھے۔ مریم میکے گئی ہوئی تھی۔ کائنات' یاسر' عامر کالج تھے۔ باقی آدھے پلازہ اور عون اپنے دفتر.... جس سے گوڈے گوڈے تنگ آچکا تھا۔ اور صبح صبح ہزار باتیں کرتا' باس کو گالیاں دیتا روانہ ہوتا تھا۔

آج صبح بھی اسے اپنے باس پہ غصہ چڑھ رہا تھا۔

"الو کی دم ہے.... بڑا کمینہ ہے۔ تین تین فائلیں اکٹھی دیتا ہے۔ اتنا کام جیسے الو کے پٹھے نے دام دے کر خرید لیا ہو۔" وہ اپنے باس کو کوستا تیار ہوتا زہر نکال رہا تھا۔

"ورکرز سے کام لے لے کر انہیں سوکھا تنکا بنا دیا۔ تنخواہ دیتے جان نکلتی ہے۔ خود الو' موٹا' سانڈ.... کھا کھا کر پھٹنے کے قریب ہے۔" وہ ناشتا کرتے ہوئے بھی بھڑاس نکالتا جا رہا تھا۔

میری کیس فائل سانڈ کے پاس پھنسی ہوئی ہے.... جیسے ہی چکما دے کر پروموشن فائل نکلوا لوں گا' پھر اس سانڈ کو منہ بھی نہیں لگاتا۔ پروموشن ہوتے ہی میرا ڈپارٹمنٹ بدل جائے گا۔" عون زیر لب بڑبڑاتا اپنے باس کی غائبانہ درگت بنا رہا تھا۔ تب ہی اورنج جوس پیتی ماہ رو نے لمبی لمبی جمائیاں روکتے ہوئے کہا۔ "ایک بات کہوں' اگر تمہارا دماغ مزید نہ تپے تو؟" معاً" اسے

ڈیڈی کی خواہش اور آفر کا خیال آگیا تھا۔ موقع مناسب بھی تھا۔ اور تمہید کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ سو ماہ رو نے بات کرنے کی ٹھانی۔

"ڈیڈی کی خواہش تھی۔ تم ان کے بزنس میں آجاؤ۔ اگر شیئرز رکھنا چاہتے ہو تب بھی... ورنہ پراپرٹی میں، جو میرا حصہ ہے۔ اسے ڈیڈی الگ کردیں گے۔ نئی فرم بھی لانچ کردیں گے۔ اور ہمیشہ ہیلپ فل رہیں گے اور تمہارے لیے آبجیکشن ایبل (اعتراض کے قابل) بھی کچھ نہیں... اگر تم چاہو تو۔" اس نے جوس پی کر ٹشو سے ہونٹ صاف کیے تھے۔ عون سے بحث کے لیے انرجی کی بھی ضرورت ہوتی تھی۔

"اگر میں نہ چاہوں تو...." عون نے تحمل سے ساری بات تو سن لی تھی۔ لیکن تیوری کے بل جوں کے توں تھے۔ جیسے اس کی بات پسند نہ آئی ہو۔

"تو پھر اپنے سڑے ہوئے سانڈ باس کی گھرکیاں سنتے رہو۔" ماہ رو نے طنز کیا۔ عون نے اسے سخت قسم کی گھوری سے نوازا تھا۔

"یعنی میری ہی بلی، مجھے ہی میاؤں۔" وہ تپ کر رہ گیا تھا اور سوچ رہا تھا آئندہ باس کی بکواس کے معاملے میں محتاط رہے گا۔ اس کے سامنے پھلجھڑیاں نہیں چھوڑے گا۔

اور ابھی ماہ رو شاید اسے قائل کرنے کے لیے کچھ دلائل بھی دیتی لیکن تب ہی فریحہ عون کی من پسند چائے بنا کر لے آئی تھی۔ کچھ بھی ہو جاتا۔ عون صبح سویرے فریحہ کی چائے کے بغیر نہیں جاتا تھا بلکہ قاسم، عاصم، عاشر وغیرہ تک بقول ان سب کے فریحہ کی چائے کا دم انہیں دن بھر تازہ دم رکھتا ہے۔

اور فریحہ اسی بات پہ گردن تان کر چلتی تھی.... کیونکہ جو خوبیاں اس میں تھیں۔ وہ کسی اور میں نہیں تھیں۔ اور جیسے ہی فریحہ نے عون کو کپ تھمایا.... عون نے من و عن ڈیڈی کا پیغام اور خواہش فریحہ تک پہنچادی۔ پہلے تو اس نے کمال اداکاری سے کہا۔

"میں اس معاملے میں نہیں بولتی۔ تم لوگوں کا آپس میں طے کرنے والا معاملہ ہے۔" لیکن جب عون کا اصرار بڑھا تو فریحہ نے ماہ رو کو اک خاص تیز نظر سے دیکھتے ہوئے اپنی رائے سے نوازا تھا۔

"ہمارے تو پرکھوں میں کبھی ایسے کام نہیں ہوئے۔ جو آج کل ہو رہے ہیں۔ ہوتے جارہے ہیں۔ تم اپنا بزنس لات مار چکے ہو۔ کسی اور کے بزنس میں کیوں جاؤ گے؟ پھر سسر کے بزنس میں سارا زمانہ باتیں کرے گا۔ عون کا بزنس میں شروع سے انٹرسٹ نہیں۔" فریحہ نے جیسے اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔ ماہ رو کو بے طرح سے غصہ آگیا۔

"عون عباس کے اور ہمارے بزنس میں کافی ڈیفرنس ہے۔" اسے خود کو کول رکھنے کے لیے ایک اور گلاس جوس پینا پڑا تھا۔

"اچھا... تم کیا جتانا چاہتی ہو؟ ہمارا اور تمہارا اسٹیٹس میچ نہیں کرتا۔" فریحہ دھیمے پر اثر لہجے میں رنجیدگی ظاہر کرتی بولی تھی۔ عون کے سامنے وہ جان بوجھ کر بات کو غلط ٹچ دے رہی تھی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" ماہ رو جھنجلائی۔ اور یہ پہلی مرتبہ جھنجلانا نہیں تھا۔ فریحہ سے جب بھی تکرار ہوتی تھی وہ اسی طرح باتوں کے میٹھے تیر چلا کر اگلے بندے کو جلانے کے بعد لطف اندوز ہوتی تھی۔

"جو بھی مطلب تھا۔ بات تو یہی نکلتی ہے۔ تمہارے باپ کی فیکٹریاں ہیں اور ہماری دکانیں۔ تمہارا باپ بھی بزنس کرتا ہے۔ ہم بھی بزنس کرتے ہیں... فرق تو ہوا نا... دکانوں اور فیکٹریوں میں۔" فریحہ نے ایک تیز لپک کو آنکھوں میں بھر کے ماہ رو کو لاجواب کردیا تھا۔ اس سے واقعی جواب نہیں بن پڑا۔

"اور تم اپنی فیکٹریوں کا رعب اپنے پاس ہی رکھو۔ عون جاب میں انٹرسٹڈ تھا۔ جاب ہی کرے گا۔ نہ اسے دکان چلانے کا شوق ہے نہ فیکٹری۔" فریحہ نے دوٹوک لہجے میں بات مکمل کردی تھی۔ یعنی ماہ رو کا منہ بند کردیا تھا۔ اور عون بالکل خاموش تھا۔ کیا اسے ماہ رو کی حمایت میں بولنا نہیں چاہیے تھا۔" اور وہ بولا۔ بھی تو کیا؟ اس سے بہتر تھا نہ ہی بولتا۔ یعنی اس نے فریحہ کو

روکا نہیں۔ بلکہ اس کی بات سے اگری کرلیا۔

"فریحہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ تم اپنے ڈیڈی سے معذرت کرلینا۔ بزنس وغیرہ میرے بس کا روگ نہیں۔" ماحول پہ چھائی کثافت کو کم کرتے ہوئے نسبتاً اسے اپنا رویہ بدلنا پڑا تھا۔ وہ ماہ رو کا اترا چہرہ دیکھ رہا تھا جو اسے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن وہ کیا کرتا؟ ماہ رو کی آفر ایکسیپٹ کرنے کا اسے تصور بھی محال تھا۔ وہ بزنس سے خار کھاتا تھا۔ نری سردردی اور ٹینشن۔۔۔ اسے آٹھ سے آٹھ تک کی جاب پسند تھی۔ اگر وہ خود انکار کرتا تو ماہ رو کو اتنا برا نہ لگتا۔ لیکن بیچ میں فریحہ نے آکر مداخلت کی تھی۔ اس وجہ سے ماہ رو نے اپنی بہت بے عزتی محسوس کی تھی۔ کیونکہ جوبات عون کو کرنی چاہیے تھی وہ فریحہ کررہی تھی۔

وہ جوس کا گلاس ٹیبل پہ بیچ کر اندر جارہی تھی۔ اور فریحہ فاتحانہ نظروں سے ماہ رو کو میدان چھوڑ کر جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ ان دونوں سے ہٹ کر عون کے تاثرات عجیب تھے۔ جیسے اسے ماہ رو کا منظر سے ہٹنا اچھا نہ لگا ہو۔



باہر خاصی پیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

برسات کے دن جاتے ہی موسم پھر سے گرم اور خشک ہو چکا تھا۔ درختوں کے پتے تک تیز دھوپ میں کملا جاتے تھے' پتیاں سوکھ رہی تھیں۔ ماہ رو اس وقت برآمدے میں بیٹھی تھی اور اس کے قریب گیندے کی مسلی پتیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اگر اس وقت فریحہ کی امی آجاتیں تو اس کی درگت بنادیتیں۔ کیونکہ یہ پھول انہوں نے لگا رکھے تھے۔ ماہ رو بے خیالی میں صبح والا سارا غصہ ان معصوم پھولوں پہ نکال رہی تھی۔ پھر تنگ آکر اٹھی اور لاؤنج میں آگئی۔ سارے لاؤنج میں دھوپ گھوم رہی تھی۔ عون کی امی ہوتیں تو فوراً چقیں اور پردے گرادیتیں۔ وہ سب چونکہ فوتگی میں گئے ہوئے تھے اس لیے ماہ رو نے خود ہی پردے وغیرہ برابر کردیے۔ معاً فون کی گھنٹی نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔

وہ بے زاری سے فون تک گئی تھی اور ہیلو بھی بمشکل ہی کہا۔ دوسری طرف عون ہوگا۔ یہ ماہ رو کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس کی ساری سستی ہوا ہو چکی تھی۔

عون نے صبح والے موڈ سے ہٹ کر قدرے خوش گوار لہجے میں پوچھا۔

"تم سوتو نہیں رہی تھی؟"

"نہیں۔۔۔" وہ اتنے خوش گوار موڈ پہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تھی۔

"اور لنچ کا کیا بنا؟" ایک اور ملائمت میں ڈوبا سوال آیا۔ ماہ رو نے حیرانی پہ قابو پاکر بتایا تھا۔

"امی اور بھابھی چکن ٹنڈے بنا گئی ہیں۔" اس نے اچک کر کچن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ چولہے پہ گگر رکھا تھا۔ یعنی ہانڈی تیار تھی۔ تاکہ پیچھے سے ماہ رو کو کھانا بنانے کی تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ روٹیاں یاسر نے تندور سے واپسی پہ لے کر آنی تھیں۔ سو لنچ کی طرف سے بے فکری تھی۔ سلاد وہ خود بنا سکتی تھی۔ اب اتنا بھی نہ کرتی۔ "وہ ایکچوئیلی! میں نے موٹے ساانڈ کو لنچ پہ انوائٹ کرلیا ہے۔ اسی بہانے فائل پہ بات کرلوں گا۔ موٹا اپنی بیوی کے ساتھ آئے گا۔ کھانے کا کیا کروگی؟ وہ ہوٹل کا کھانا بالکل نہیں کھاتا۔ اینی وے ہم فریحہ سے کہنا۔ وہ مینیج کرلے گی۔ کوکنگ اس کے دائیں ہاتھ کا کام ہے۔" وہ روانی میں بولتا ہوا پھر فریحہ نامہ کھول کر بیٹھ گیا تھا۔ ماہ رو جو صبح سے تپی ہوئی تھی چڑ کر بولی۔

"میں نے خود کافی کوکنگ سیکھ لی ہے۔ بنا سکتی ہوں ۔ فریحہ کی خدمات لینے کی ضرورت نہیں۔"

"ساانڈ نے ابھی مرنا نہیں۔ کم از کم میری فائل پہ سائن کرنے سے پہلے تو نہیں۔" عون نے جیسے دہائی دی تھی۔

"تمہارا ساانڈ میرے ہاتھ کا کھانا کھا کر ہمیشہ یاد رکھے گا۔" ماہ رو بھی اپنی تعریفوں پہ تلی ہوئی تھی۔ عون نے سر تھام لیا۔

"تم مروادو گی مجھے۔"
"دیکھنا تو سہی... تم بھی یاد رکھو گے۔" ماہ رو نے اگلی بات سنے بغیر کھٹاک سے فون بند کر دیا تھا۔ لیکن پھر سے فون کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔ اس نے تلملا کر فون اٹھایا۔
"تم مجھے اب کچھ کرنے دو گے یا نہیں؟ ٹائم بھی کم ہے۔" وہ بھنا کر بولی تھی۔ عون کو ہول اٹھنے لگے تھے۔ اسے ماہ رو کی کوکنگ پہ بھروسا نہیں تھا۔ اور وہ کافی خدشات کا شکار تھا۔ لیکن ماہ رو نے اس کی ایک نہیں سنی تھی۔ فون بند کر دیا تھا پھر جلدی سے کچن میں آ گئی۔ عون کو متاثر کرنے کا یہ پہلا بہترین موقع تھا۔ وہ کیوں ہاتھ سے جانے دیتی۔ فریحہ کو کیوں بلاتی؟ تاکہ وہ اور عون کو اپنے کنٹرول میں کر لیتی۔ اور عون بھی بلاوجہ اس کا احسان مند رہتا۔ فریحہ کو اور اپنی کوکنگ اور سگھڑاپے کی دھاک بٹھانے کا موقع مل جاتا۔
ماہ رو بڑی پر جوش تھی۔ اور خوب ولولے کے ساتھ کچن میں آئی تھی۔ فریج کھولا اور سب سے پہلے سامان دیکھا۔ گھر میں ہر چیز موجود ہوتی تھی۔ اور ابھی بھی موجود تھی۔
وہ سب سے پہلے ذہن میں مینیو ترتیب دینے لگی۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ سوچ میں پڑ گئی تھی کہ کس سے مزید مشورہ لے۔ فریحہ کا آپشن تو ریجیکٹ (نامنظور) شدہ تھا۔ وہ مر کر بھی اس سے مدد نہ لیتی۔ مریم کے میکے کال کرنا غیر مناسب تھا۔ کائنات ہوتی تو وہ ضرور مشورہ دیتی لیکن اب....
وہ کیا کرے؟ پلاؤ بنانا مشکل نہیں تھا۔ اس نے بہت دفعہ اس گھر میں بنتے دیکھا تھا۔ ماہ رو کو بھی پسند تھا اور طریقہ بھی آتا تھا۔ لیکن پھر بھی ایک مرتبہ ری فریش کرنا ضروری تھا۔
معاً" فریحہ کچن میں آ گئی۔ وہ جو سوچوں میں گم بریانی اور پلاؤ میں سے ایک ڈش کو فائنل کرنا چاہتی تھی لمحہ بھر کے لیے چونک گئی۔ ایں' یہ فریحہ کیوں آئی؟" ماہ رو کو بے طرح سے غصہ آیا تھا۔ ادھر فریحہ پورے کچن میں پھیلائی چیزوں کو دیکھ کر معنی خیزی سے مسکراتی رہی۔
"کیوں آئی ہو؟" اس کی استہزائیہ نظروں کو دیکھ کر ماہ رو نے پھاڑ کھانے والے انداز میں پوچھا تھا۔ فریحہ کی طنزیہ مسکراہٹ یکدم غائب ہو گئی تھی۔
"عون نے فون کیا تھا۔ تاکہ دعوت وغیرہ کا انتظام کر سکوں۔ آخر پہلے بھی تو کرتی تھی۔ اور اسے میرے پکائے کھانوں پہ بھروسا ہے۔" فریحہ کا آگ لگاتا لہجہ ماہ رو کو غصے کی انتہاؤں پہ لے گیا تھا۔ اس نے زہر بھرے لہجے میں فریحہ کو جتلایا۔
"وہ پہلے کی بات اور تھی۔ تمہارا شکریہ جو تم نے ماضی میں کیا۔ اب میں خود بنالوں گی۔ تم جاؤ۔" ماہ رو نے بمشکل دفع ہو جاؤ کہنے سے خود کو روکا تھا۔ اسے فریحہ پہ غصہ ہی بہت تھا۔ یہ اور بات تھی کہ مروتاً" چپ کر جاتی تھی۔ فریحہ اس کھلی بے عزتی پہ توہین سے تپ اٹھی تھی۔ اس کا لہجہ ابلتے پانی کی طرح کھول رہا تھا۔
"میں چلی جاتی ہوں.... اور دیکھتی ہوں تم کون سا عون سے میڈل وصول کرتی ہو۔ آج یہ چیلنج تمہیں دیا۔" فریحہ کا زہر خند انداز' تپتا سرخ چہرہ اور آنکھوں کا عجیب سا تاثر نظر انداز کیے جانے والا نہیں تھا۔ لیکن ماہ رو نے فریحہ پہ لعنت ڈال کر اپنا وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ اور کھانے کی تیاری میں لگ گئی تھی۔ چونکہ وقت کم تھا اور مقابلہ سخت تھا۔ اب تو فریحہ کو بھی منہ توڑ جواب دینا تھا۔ بڑی آئی تھی سگھڑ اور سلیقہ مند۔
ماہ رو کبھی بھی فریحہ سے اتنے تلخ لہجے میں بات نہ کرتی۔ لیکن یہ فریحہ خود ایسی باتیں کرتی تھی کہ نہ چاہ کر بھی اسے منہ توڑ جواب دینا پڑ جاتا تھا۔
ماہ رو نے سوچا وہ پلاؤ' قورمہ' کباب' اور میٹھے میں ٹرائفل بنالے گی۔ سیلڈ الگ سے ہوں گے۔ اتنے کم وقت میں یہ سب کچھ بھی بن جاتا تو بہت تھا۔ ویسے بھی یہی ڈشز اس نے ثنا اور مریم سے سیکھی تھیں۔ اس گھر میں یہی ڈشز زیادہ تر پکائی اور کھائی جاتی تھیں۔ مہمانوں کے لیے بھی یہی اہتمام ہوتا تھا۔ اور یہ ایک لحاظ سے کافی اہتمام تھا۔ لیکن چونکہ یہ دعوت کی تیاری تھی سو وہ بار بار کنفیوز ہو جاتی۔ اسی

کنفیوژن میں اچانک اسے اپنے کک کریم کا خیال آ گیا تھا۔

"او۔۔۔ میں نے پہلے کیوں نہیں سوچا۔ مجھے کریم سے ہیلپ لینا چاہیے۔" دوسرے ہی لمحے وہ اپنا سیل فون اٹھا کر کچن میں آگئی تھی۔ چکن' چاول چنتے دھوتے ہوئے ساتھ ساتھ وہ کریم سے بات کر رہی تھی۔ اور کریم سن کر ہول ہول جا رہا تھا۔

"ماہ بی بی! رحم کریں۔ ہم پہ رحم کریں۔ آپ کچھ مت پکانے کی کوشش کریں۔ میں سب کچھ ریڈی کرتا ہوں اور ڈرائیور کے ساتھ آکر دے جاتا ہوں۔ آپ ہاتھ بھی مت لگایئے گا اسٹو کو۔" کریم کی جیسے جان پہ بن آئی تھی۔

"تم مجھے جسٹ گائیڈ کرتے رہو۔ کوانٹٹی میں کچھ مسنگ ہو جاتا ہے۔ میں سب کرلوں گی۔" ماہ رو نے رعب سے کہا۔

"ماہ بی بی! آپ سے نہیں ہو گا۔ میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا آپ کچن میں ہیں۔ آپ کچھ نہیں بنائیں۔ سب کچھ اے ون فٹافٹ ریڈی کرتا ہوں۔" کریم نے آخری دم تک زور لگایا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔

"دس از کوائیٹ نیو ٹو می۔۔۔ آئی ایم ویری ایکسائٹڈ۔ تم بس گائیڈ کرو۔" (یہ میرے لیے سراسر نیا ہے۔ میں بہت پرجوش ہوں۔ تم مجھے بتاتے جاؤ) ماہ رو نے جوش سے کاپی پنسل پکڑ کے ضروری پوائنٹ لکھ لیے تھے۔ دوسری طرف کریم بھی فون بند کر کے سارے ہیلپرز کو اکٹھا کرتا کچن کی طرف بھاگ رہا تھا۔ سرفراز ولا میں ایک دم بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔

ماہ رو نے موبائل رکھ دیا اور پوری تندہی سے کام میں لگ گئی تھی۔

اور پھر حیرت انگیز طور پر ماہ رو نے کافی چیزیں اتنی بہترین بنالیں کہ خود بھی دنگ رہ گئی۔

اس نے پلاؤ بھی بنالیا۔ دانہ دانہ الگ نہ سہی لیکن بہت اچھا بنا تھا۔ قورمہ بھی تیاری کے آخری مراحل میں تھا۔ کباب جسٹ فرائی کرنے تھے۔ ٹرائفل کو ٹھنڈا کرنے کے لیے رکھا تھا۔ سہلاد وہ نہا کر بنانا چاہتی تھی۔ کیونکہ تین چار گھنٹوں میں ہی وہ حال سے بے حال ہو چکی تھی۔

منہ پہ' ہاتھوں پہ' کپڑوں پہ جگہ جگہ داغ لگے تھے۔ پسینہ بہہ رہا تھا۔ بال گھونسلے میں بندھے لگتے تھے۔ وہ ایک ایک چیز کو چکھتی مطمئن ہو کر اپنے روم کی طرف چلی گئی تھی۔

جب تک وہ نہا کر باہر آئی۔۔۔ تب تک قورمہ بھی پک گیا۔ ماہ رو نے پہلے خود کو سنوارا۔ بہت اسٹائلش شرٹ جس کے نیچے وہی اس کی پسندیدہ ٹائٹس پہنے' گلے میں رسی نما اسٹول۔۔۔ بالوں کی اونچی پونی ٹیل بنا کر اس نے نیچرل میک اپ کیا اور باہر آگئی۔۔۔ اب اسے فٹافٹ سہلاد بنانا تھا۔ جو آدھے گھنٹے میں بن گیا۔ اور اسی وقت عون بھی اپنے اسٹاف کے جلو میں آگیا۔

ساجد اور اس کی بیوی کے علاوہ دو لڑکیاں' ایک انکل اور ایک آنٹی بھی ساتھ آئے تھے۔ ماہ رو کی آنکھیں ابل پڑیں۔

"کیا کھانا پورا ہو جائے گا؟"

اس کا دل ہل گیا۔ دو لوگوں کے تناسب سے کھانا کچھ ہی زیادہ تھا۔ مارے گھبراہٹ کے وہ خاصی بوکھلا گئی تھی۔ لیکن اس نے اپنی بوکھلاہٹ مہمانوں پہ ظاہر نہیں کی تھی۔

مہمانوں سے مل کر جوس سرو کر کے اور اپنی ڈھیر ساری تعریفیں وصول کر کے وہ کچن میں آگئی تھی۔ اور اس کے پیچھے عون بھی بھاگا بھاگا آگیا تھا۔ پھر اس نے ڈھکن اٹھا اٹھا کر ایک ایک ڈش کو دیکھا۔

"خوشبو تو اچھی ہے اور مقدار بھی کم نہیں۔ کھانا پورا ہو جائے گا۔ ایکچوئیلی! باقی لوگوں کا اچانک پروگرام بن گیا تھا۔ پھر میں نے سوچا بتانے کی ضرورت نہیں۔ فریحہ کون سا کم کھانا بناتی ہے۔" اس نے ڈشز کی خوشبو سے مطمئن ہو کر فریحہ نامہ کھولا ہی تھا جب ماہ رو اچانک تپ گئی تھی۔

"کھانا میں نے بنایا ہے۔" وہ چبا چبا کر بولی۔

"ایں۔۔۔ واقعی؟" اسے یقین نہیں آیا تھا۔ بالکل

یقین نہیں آیا تھا۔ اور اسی لیے عون نے دوبارہ ساری ڈشز کا معائنہ کیا۔ وہ کھانے کی خوشبو سے رنگت سے تو مطمئن ہوچکا تھا لیکن ذائقہ؟

وہ چکھے بغیر ماہ رو کو ڈش آؤٹ کرنے نہیں دے رہا تھا۔ ماہ رو بڑے جوش و خروش سے اسے ایک ایک آئٹم چکھا رہی تھی۔ اور وہ جیسے جیسے چکھ رہا تھا۔ اس کے تاثرات؟ ماہ رو کی نگاہ جیسے ہی عون کے چہرے پہ پڑی تھی۔ اس کی جیسے جان نکل گئی۔ اس کے پیروں تلے سے زمین ہل گئی تھی۔ عون کا کوئی ایک تاثر بھی نارمل نہیں تھا۔ وہ کسی بھی آئٹم کو چکھ کے خوش نہیں ہوا تھا۔ کیوں؟ آخر کیوں؟

ماہ رو تو آخری تسلی کر کے ایک ایک ڈش کو کئی مرتبہ چکھنے کے بعد مطمئن ہوئی تھی۔ پھر اب کیا ہوا تھا؟ آخر کیا؟ وہ گھبرا گئی تھی۔ پریشان ہو گئی تھی۔ اس کا دل اتنا بے قابو ہو رہا تھا کہ حد نہیں۔

پھر عون نے ایک ایک چیز کو زبردستی ماہ رو کے منہ میں ٹھونسا۔

''چکھو... خود چکھو اور بتاؤ۔ یہ تم نے کھانا بنایا ہے؟ یہ مہمانوں کے کھانے، ان کے سامنے رکھنے کے قابل ہے؟ یہ تم نے کیا کیا؟ اوف خدایا! یہ تم نے کیا کر دیا؟ اب میں کیا کروں؟ تم نے مجھے بے عزت کر دیا۔'' عون مارے پریشانی، غصے اور غضب کے خود بھی کچن میں چکراتا پاگل ہو رہا تھا۔

''کدھر ہے فریحہ! میں نے اسے کہا تھا کھانا بنائے... پھر تم نے کیوں بنایا؟ مجھے شرمندہ کرنے کے لیے! مجھے ذلیل کرنے کے لیے؟ بتاؤ۔ تم نے یہ کیوں کیا؟ جان بوجھ کر؟'' وہ آگ بگولہ ہو رہا تھا۔ لیکن بہت اونچی آواز میں چلا بھی نہیں سکتا تھا۔ تاکہ مہمانوں تک آواز نہ پہنچ جائے۔

اور ماہ رو کی حالت کاٹو تو بدن میں لہو جیسی بھی نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ رہی تھیں اور زبان عجیب و غریب ذائقوں پہ اکڑ رہی تھی۔

یہ خوش رنگ پلاؤ تھا جس میں سے ٹاٹری کی کھٹاس محسوس ہوتی تھی۔ یہ قورمہ تھا جس میں چینی کے علاوہ کوئی اور ذائقہ نہیں تھا۔ اور ٹرائفل میں نمک۔ کیا یہ سب ماہ رو نے بنایا تھا؟ اور تب یہ ایسا کیوں نہیں تھا؟ آخر اس کی محنت کو کس نے نظر لگائی تھی؟ اس کا بنایا کھانا کس نے خراب کیا تھا؟ اور اب کھانا خراب ہو چکا تھا تو پھر مہمانوں کے سامنے کیا رکھنا تھا؟

ماہ رو کو اتنا زور کا چکر آیا کہ وہ سلیب نہ پکڑتی تو زمین بوس ہو جاتی۔



اور جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا ماہ رو کے دل کو پتنگے لگ رہے تھے۔ اور عون کے طعنے جیسے جان نکال رہے تھے۔ عون، سن ہوتے دماغ کو قابو میں رکھتا فریحہ کو بلا لایا تھا۔

''تم کچھ کر سکتی ہو تو کرو۔ میں کسی ہوٹل سے ایک آدھ ڈش اٹھا لاتا ہوں۔'' وہ اتنا پریشان تھا کہ حد نہیں تھی۔ اور اسے پریشان دیکھ کر ماہ رو کا دل کٹ کٹ کے گر رہا تھا۔ وہ ایک کونے میں کھڑی ٹپ ٹپ آنسو بہا رہی تھی۔ اس کی ساری محنت اکارت گئی تھی۔

ہاتھ جلایا بھی تھا اور ہاتھ کچھ آیا بھی نہیں تھا۔

الٹا عون کا غصہ اور ناراضی سہنا پڑ رہی تھی۔ وہ اتنے شدید غصے میں تھا کہ اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کر رہا تھا۔ اوپر سے اس کی شعلہ بیانی۔

''تمہیں پتا تو تھا اس پھوہڑ کو کچھ نہیں آتا۔ پھر تم کیوں اس پہ چھوڑ گئیں سب کچھ...'' وہ زہر بھری اچٹتی نگاہ ماہ رو پہ ڈالتا فریحہ سے مخاطب تھا۔ اور تب فریحہ کو اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کا موقع مل گیا۔

''اس نے مجھے خود نکالا تھا کچن سے باتیں سنا کر۔'' وہ بڑے طنز سے بغیر جھجکے اس کے منہ پر کہہ رہی تھی۔ اسے کون سا ماہ رو سے ڈر تھا۔ جو وہ منہ پہ بات نہ کرتی اور نہ ماہ رو سے بہناپا تھا جو اس کا پردہ رکھتی۔ وہ اسے ذلیل کروانا چاہتی تھی سو کروا رہی تھی۔

اور عون نے ماہ رو کی سات منٹ کی اندر وہ دھلائی کی تھی کہ شاید ہی کسی کی ہو۔ بس مارنے کی کسر رہ گئی تھی۔ بلکہ بھگو بھگو کر مار بھی رہا تھا۔ غصہ بھی کر رہا تھا۔

طنز بھی۔ بے عزتی بھی۔ فریحہ کے سامنے۔ پھر فریحہ نے اپنی تیز ترین سروسز مہیا کرتے ہوئے کہا۔

"تم کھانا لے آؤ۔ میں تب تک کباب فرائی کرتی ہوں۔ یہ تو کباب بھی ٹھیک نہیں۔ جلے سے لگتے ہیں۔" اس نے فریج سے کوک نکالتے ہوئے عون کو باہر بھیجا تھا اور ماہ رو کے بنائے کباب ڈسٹ بن میں الٹ دیے۔ اپنی طرف سے اسے اور اس کی بنائی چیز کو ریجیکٹ کیا تھا۔

ماہ رو اس کھلی بے عزتی پہ احتجاج بھی نہیں کر سکی۔

اور عون جو ایک مرتبہ پھر ماہ رو کو زہر بھری نگاہوں سے گھورتا موبائل پہ کھانے کا آرڈر دے رہا تھا اس وقت خاموش ہو گیا جب اندر آتی سکینہ دکھائی دی تھی اور اس کے پیچھے فل شیف یونیفارم میں کریم تھا۔ اس کے پچھلے ہیلپر سلیم۔ ان سب نے بڑے بڑے ٹفن اٹھا رکھے تھے۔ اور وہ لوگ مودب سے کچن میں آنے کی اجازت مانگ رہے تھے۔ عون' فریحہ اور خود ماہ رو تک حیران رہ گئی تھی۔

تب کریم مہذب لہجے میں نرمی سے بولا۔

"ماہ بی بی! آپ کو منع بھی کیا تھا۔ کچھ نہ پکائیں۔ میں دعوت کا سارا اہتمام کر لیتا ہوں۔ پھر بھی آپ نے...." کریم نے کچن میں پھیلے پھیلاوے کو دیکھتے ہوئے سلیم کو اشارہ کیا۔ سارے ٹفن ٹیبل پہ سجا کر سلیم نے منٹوں میں کچن سمیٹ دیا تھا اور سکینہ ماہ رو سے پوچھ کر شوکیس سے نفیس ساڈنر سیٹ نکال رہی تھی۔ ساتھ کریم سے مخاطب تھی۔

"منع تم نے خاک کیا تھا۔ ماہ بی بی نے اپنا ہاتھ تک جلا لیا۔ صدقے جاؤں' اوپر کچھ لگایا بھی نہیں...." سکینہ جو مارے صدمے کے اس کا ہاتھ دیکھ کر پھٹ پڑی تھی ماہ رو کے روکنے پہ بمشکل رکی۔

"سکینہ تم مجھے چھوڑو' اور فٹافٹ کھانا سرو کرو.... میں ڈرائنگ روم میں ہوں۔" ماہ رو کا لمحوں میں ازلی اعتماد لوٹ آیا تھا۔ اور وہ کچھ دیر پہلے کی ساری ٹینشن بھلا کر ایک نظر فریحہ کے دھواں دھواں چہرے کو دیکھتی ہوئی کچن سے باہر جانے لگی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی اب کھانا سرو کرنے' ٹیبل سجانے تک کسی بھی قسم کی ٹینشن نہیں تھی۔ اس کے گھر کا ٹرینڈ کک آچکا تھا۔ سب کچھ بہترین ہونے والا تھا۔

اسے اپنے وفادار' ذہن شناس نوکروں پہ ٹوٹ کر پیار آگیا تھا۔ کریم جانتا تھا۔ وہ کبھی بھی کسی دعوت کا اہتمام نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ اس نے یہ کام کبھی کیا ہی نہیں تھا۔ سو وہ اپنی ذہانت سے سب کچھ بنا لایا تھا۔ ماہ رو جیسے بہت بڑی ذلت سے بچ گئی تھی۔

کچن سے نکلتے ہوئے اس نے عون کو بھی مخاطب کیا۔

"ہم ڈرائنگ روم میں چلتے ہیں۔ مہمان بھی کیا سوچتے ہوں گے۔ میزبان کہاں غائب ہیں۔" اور پھر فریحہ پہ ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر وہ دونوں ڈرائنگ روم میں چلے گئے تھے۔ اور فریحہ ایک کونے میں کھڑی ہکا بکا دیکھتی جا رہی تھی۔ اس کا وجود اتنا ہی مس فٹ تھا۔

اور اس کے ساتھ ہوا کیا تھا؟ وہ حیران نہیں تھی ششدر تھی۔

اس کے ذہین دماغ کی پوری چال اسی پہ الٹ گئی تھی۔

شیف کریم ٹیبل پر برتن لگا رہا تھا۔ سر پہ ٹوپا جسم پہ یونیفارم' ہاتھوں پہ گلوز... ایک خوب صورت ٹیبل سج رہی تھی۔ رنگ رنگ کے لذیذ' گھر کے بنے' ذائقہ دار' خوش رنگ کھانے ڈش آؤٹ ہو رہے تھے۔ چکن ویجی ٹیبل رائس' فش اسٹرپس' مٹن تکہ' کباب سیزلر' چکن الاکیو' بیکڈ میکرونی' میٹھے میں دہلوی کھیر.... ٹھنڈی چاندی کے ورق سے سجی.... خوشبو دار' لذیذ....

ہر طرف خوشبو ہی خوشبو تھی۔ کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو.... جو فریحہ کے نتھنوں میں گھس کر اسے پھر سے ذلت کا احساس دلا رہی تھی۔ اسے پچھاڑ رہی تھی۔

اور فریحہ ایک مرتبہ پھر شکست خوردہ کھڑی تھی۔ اکیلی' تنہا اور بے بس۔ وہ ماہ رو کو عون کے ہاتھوں رسوا

کروانا چاہتی تھی۔ لیکن الٹی چال پہ جو اس باختہ ہو گئی۔ ماہ رو پھر جیت گئی تھی۔ کیونکہ عون کا باس' اس کے کولیگز' ماہ رو سے بے انتہا متاثر ہو کر تعریفوں کے پل باندھتے روانہ ہوئے تھے... وہ سب عون کی بیوی کے حسن' سلیقے' قرینے سے بے انتہا' امپریس تھے۔ خاص طور پر باس کی بیوی۔ جو یہ سن کر شدید حیران ہوئی تھی کہ ماہ رو سیٹھ سرفراز کی بیٹی ہے۔ جن کی کمپنی میں اس کا باپ بطور ایم ڈی کام کرتا تھا۔

اور یوں ماہ رو ایک مرتبہ پھر فاتح کہلائی گئی تھی اور فریحہ شکست خوردہ بھی' زخم خوردہ بھی۔



اور پھر یہ سلسلہ یہاں تک رکا نہیں تھا۔ فریحہ نے اگر ماہ رو کو پچھاڑنے کا عہد کر رکھا تھا تو وہ اس عہد کو آخر تک تکمیل کے مرحلوں میں پہنچانا چاہتی تھی۔ وہ ماہ رو کو عون کی زندگی سے نکالنا چاہتی تھی اور اس کے لیے فریحہ نے ہر حد کو للکارا تھا۔ اسے ہر صورت ماہ رو کو اس گھر سے نکالنا تھا۔ اس کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اس دن ماہ رو بڑی ذلالت سے بچ گئی تھی حالانکہ فریحہ نے اس کے منظر سے ہٹتے ہی بڑے طریقے کے ساتھ ہر پکی ہوئی ڈش میں چینی کا پانی' ٹاٹری' نمک ملا کر اپنی کمینگی کا ثبوت دیا تھا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ لیکن عون کے ہاتھوں ماہ رو کو بے عزت کروا کر اس نے بڑا مزا لوٹا تھا۔

اس دن گو کہ ماہ رو کی کچھ بچت بھی ہو گئی تھی۔ اس کے نوکر ٹفن اٹھا کر لے آئے اور ماہ رو مزید ذلیل ہونے سے بچ گئی۔ یہاں فریحہ کی ذہانت کو تھوڑی مات ہوئی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ ماہ رو اپنے گھر سے نوکروں اور پکے پکائے کھانے کو منگوا لے گی۔ کم از کم اس دن کی حد تک معاملہ سمٹ گیا۔

رات کو تایا تائی واپس آئے تو انہیں بھی ساری کہانی سنائی گئی۔ تائی یہ تو بھول گئی تھیں کہ کھانے میں چینی نمک کس نے ملایا تھا لیکن وہ ماہ رو کے جلے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر عون کی دھنائی کرنا نہ بھولی تھیں۔ پھر عون کو اپنے سامنے بلا کر ماہ رو کے زخم پہ مرہم لگوائی تھی۔ ساتھ ساتھ کھنچائی بھی کی۔

"جب فریحہ موجود تھی تو تم نے میری بیٹی کو کچن میں کیوں جانے دیا۔ ابھی تو ہاتھ جلا ہے اگر وہ زیادہ جل جاتی تو۔" یوں عون کی درگت بناتی تائی کو ماہ رو سے پیار کرتے دیکھ کر فریحہ کے سینے پہ سانپ لوٹ گئے تھے۔

اور پھر عون کی وہ معذرت جو اس نے ماہ رو کے ہاتھ کو پکڑ کر مرہم لگاتے ہوئے سب کے سامنے کی تھی فریحہ عمر بھر نہ بھلا پائی۔

اور فریحہ کیا عون کی نوکرانی تھی؟

"میرے باپ کی بھی توبہ جو تمہیں کبھی کچن میں بھیجوں۔" اس کے آبلوں کو تکتا وہ شرمسار تھا اور پھر فریحہ ناک تک سنگسار جو عون کے حکم بجا لاتی۔ اس کی کنیز بنی رہتی۔ اس کی گرد پروانوں کی طرح گھومتی۔ اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا۔

ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ کبھی بھی نہیں۔

فریحہ کو ان چھوٹی موٹی پلاننگز میں اب ترمیم کرنا پڑی تھی۔ اسے کوئی بڑا داؤ چلنا تھا۔ کیونکہ ماہ رو کے جمے ہوئے قدم ان چھوٹی موٹی چالوں سے اکھاڑے نہیں جا سکتے تھے۔ اس کے لیے کسی بڑی وجہ' بڑے منصوبے' ضرورت تھی۔

چھوٹی موٹی ہر چال ناکام ہوتی چلی گئی تھی۔

اس نے کئی مرتبہ ماہ رو کی بے خبری میں عون کے ان کپڑوں کو جلا کر دیکھ لیا تھا جو ماہ رو اپنے تئیں استری کر کے الماری میں لٹکا دیتی تھی۔ پھر جب عون پہننے لگتا تو ایک لمبی لڑائی کا آغاز ہو جاتا۔ وہ ماہ رو کی بے عزتی کرتا' غصہ ہوتا۔ اسے پھوہڑ' بدسلیقہ' نکمی ہونے کے طعنے دیتا... پھر چیختا چلاتا باہر نکل جاتا یا تائی کے ہتھے چڑھ کر اپنا غصہ اپنے ہی ہاتھوں گنوا دیتا۔ تائی ماہ رو پہ آنچ آنے ہی نہیں دیتی تھیں۔

"اس کے باپ کے گھر پر ہر کام کے لیے نوکر ہیں... آواز دے تو دس حاضر ہوتے ہیں۔ اگر وہ تمہاری محبت میں کام کرتی ہے اور کچھ غلط ہو جاتا ہے تو تم درگزر سے

کام لیا کرو۔ آہستہ آہستہ سیکھ جائے گی۔" تائی ہمیشہ ماہ رو کے لیے ڈھال بن جاتی تھیں اور تایا ماہ رو کے لیے سایہ دار درخت۔ پھر عون کی کہاں جرات پڑتی وہ ماہ رو کو انگلی بھی لگا دیتا۔ ایسے ہی ہر فریحہ کی چال اپنے داؤ میں خود پھنس جاتی تھی۔

اور اس دفعہ فریحہ کو یقین تھا کہ وہ کبھی ہارے گی نہیں۔ کبھی مات نہیں کھائے گی۔ کبھی شکست نہیں پائے گی۔ کیونکہ قدرت نے بھی اسے بڑا اعلا پائے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ لیکن اس سے بھی پہلے فریحہ نے ایک رات عون کے سامنے روتے ہوئے اس کا دل اور بھی رام کرنے کے چکر میں کہا۔

"تم کیا سمجھتے ہو۔ میں بہت صابر ہوں۔ بہت اعلا ظرف ہوں۔ یا پتھر کی بنی ہوں۔ مجھے کوئی دکھ نہیں ہوتا۔ اور میں سب کچھ بھلا چکی ہوں۔ نہیں عون! میں اپنی ایک ایک اذیت اور ذلت کو نہیں بھولی۔ جو مجھے اٹھانا پڑی۔ مجھے پورے خاندان' محلے' رشتے داروں اور اجنبیوں کے سامنے ذلیل ہونا پڑا۔ میری شادی ٹوٹی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ میں ہر ایک کے سامنے سوالیہ نشان بنی۔ ابھی تک میرا جو بھی رشتہ آتا ہے لوگ مڑ کر دوبارہ نہیں آتے۔ اس لیے کہ انہیں میری شادی ٹوٹنے کی وجوہات پتا چل جاتی ہیں۔ تم نے ایک دن ذلت اٹھائی..... میں ہر روز اسی ذلت کے مرحلے سے گزرتی ہوں۔ لوگوں کی سوالیہ نگاہوں کا نشانہ بنتی ہوں۔ اور خواری اٹھاتی ہوں۔

میرا دل دیکھو تو فگار ہے۔ میں اپنے ٹوٹے وجود کا بوجھ اٹھائے بمشکل چلتی پھرتی ہوں۔ دل کرتا ہے خود کشی کرلوں۔ مر جاؤں۔ خود کو ختم کرلوں۔ امی' ابا کا خیال نہ ہو تو مر ہی جاؤں....." وہ تڑپ تڑپ کر روتی رہی۔ عون کو رام کرنے تک روتی رہی۔ اور رام تو عون اس کے آنسو دیکھ کر ہی ہو جاتا تھا۔ اور ابھی بھی اس کا دل پسیج گیا تھا۔ اس کا گلٹ بھی تازہ ہو گیا۔ نئے سرے سے ماہ رو پہ غصہ آنے لگا۔ جی چاہ رہا تھا۔ اس کی تکہ بوٹی کر دے۔

آخر ماہ رو کی غلط چالوں نے فریحہ کو ان حالوں تک پہنچایا تھا۔

وہ لوہے کو نرم ہوتے دیکھ کر مزید چوٹ کرتے ہوئے بولی۔

"میں نے پھر بھی اتنا کچھ سہہ کر بھی ماہ رو کا برا نہیں چاہا۔ اس کے لیے ہمیشہ اچھا ہی سوچا۔ تمہارے حوالے سے اس کی عزت کی۔ اسے کبھی طعنہ نہیں دیا۔ آخر برباد تو میں اسی کی وجہ سے ہوئی تھی۔" فریحہ روتے ہوئے ایک ایک سوئی کو ٹھیک جگہ پر چبھو رہی تھی۔ عون کا سر جھک گیا۔ فریحہ اور بھی جانے کیا کیا کہتی رہی۔ تڑپتی رہی..... ساری پچھلی باتوں کو دہراتی رہی۔

عون شرمسار سا سنتا رہا۔ جب فریحہ رو رو کر اور بول بول کر ہانپ گئی تب عون دھیمی افسردہ' بوجھل آواز میں بولا۔

"میں تمہاری تکلیف کیسے کم کروں فریحہ! میں شرمسار ہوں۔ گو کہ مجھے بھی تم سے کوئی دھواں دھار محبت نہیں تھی۔ لیکن بچپن سے ایک انسیت ضرور تھی۔ مجھے شادی ٹوٹنے کا اتنا ہی دکھ ہوا تھا جتنا تمہیں۔ میں بھی ویسی تکلیف سے گزرا تھا جس سے تم گزری۔ لیکن یقین مانو ابو اور چاچا میری ایک نہیں سن رہے تھے۔ ماہ رو کو سچا اور مجھے جھوٹا کہتے تھے۔"

فریحہ نے اس کی ساری بات کو نظر انداز کر کے صرف پہلے جملے پہ فوکس رکھا۔

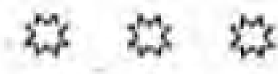
"تم میری تکلیف کم کر سکتے ہو۔" وہ اپنی بات دہرا رہی تھی۔

"کیسے؟" عون دھیمی افسردہ آواز میں آہستگی سے کہہ سکا۔ شرمندگی ایسی تھی کہ سر اٹھانا بھی محال تھا۔ یہ ماہ رو بھی نا..... عمر بھر کے لیے سوالیہ نشان بنا چکی تھی۔

"ماہ رو سے کہو۔ بھری محفل کے سامنے مجھ سے معافی مانگ لے۔ اپنا گناہ تسلیم کرلے۔ اس نے مجھے برباد کیا۔ تمہیں مجھ سے چھینا۔ شادی تڑوائی..... ہر ہر بات کا اقرار کرلے۔ بولو' کر سکتے ہو؟ ماہ رو کو مجبور کر سکتے ہو؟ میری اذیت ختم نہیں ہو گی لیکن کم ضرور ہو

جائے گی۔" فریحہ نے گیند اس کی کوٹ میں ڈال کر اپنا پہلا وار کیا تھا۔ جو کہاں تک کامیاب ہو سکتا تھا.... وہ اسی رات ہی پتا چل گیا۔

کامیابی اور ناکامی کا اسی رات فیصلہ ہو گیا تھا۔ اور فریحہ کے فیصلے تو آر یا پار ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ ہوا کچھ اس طرح سے...



اور پھر وقت ماہ رو سرفراز کو دوراہے پہ لے آیا تھا۔

اور وقت ماہ رو سرفراز کو ایک بند گلی میں لے آیا تھا۔ ایسی بند گلی جس کے سامنے کوئی رستہ نہیں تھا۔ پھر بھی ماہ رو سرفراز نے اس بند گلی میں اپنے لیے راہ نکال لی تھی۔

صرف اپنے لیے نہیں، عون کی خوشی کے لیے۔ عون کی مرضی کے لیے۔ عون کی خواہش کے لیے۔ عون کی محبت کے لیے اور عون عباس کا حکم مان کر۔

وہ اس کے سامنے کھڑا تھا اور وہ اس کے سامنے یوں ہی نہیں کھڑا تھا۔ وہ اس کے سامنے کسی مقصد کے لیے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غصہ نہیں تھا۔ لیکن سختی ضرور تھی۔ اور یہ سختی اپنی بات کو منوا لینے کے یقین کی حدوں کو چھوتی آنکھوں میں چھا رہی تھی۔

ماہ رو نے اس کی ایک ایک بات دل کے کانوں سے سنی تھی۔ اس نے دماغ کے ہر فیصلے، ہر رکاوٹ ہر بندش کو جھٹک دیا تھا۔ اس اپنی ہر دلیل کو جھٹک دیا تھا۔ اس نے اپنے اندر سے اٹھتی ہر آواز کو جھٹک دیا تھا۔ وہ صرف عون عباس کو سننا چاہتی تھی۔ وہ صرف عون عباس کی آواز کو سننا چاہتی تھی۔ باقی کیا تھا؟ سب کچھ ہیچ... باقی کیا تھا؟ سب کچھ ہیچ؟

صرف وہ تھا جو اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا ایسا عشق جو جنون نہیں بنا۔ بس عشق رہا... اور عشق لا محدود رہا۔ جسے دیکھ کر وہ ماہ رو سرفراز سے داسی بن گئی تھی۔ جوگن بن گئی تھی۔ اور وہ جو اس کا یقین تھا۔ ایقان تھا۔ سائبان تھا۔ کبھی بے مہر اور کبھی مہربان تھا۔

وہ جو چڑھتا آفتاب تھا۔ وہ جو ڈوبتا مہتاب تھا۔ نہ عروج تھا نہ زوال تھا۔ بس عشق باکمال تھا۔ وہی عون عباس، ماہ رو سرفراز کے سامنے کھڑا تھا۔ کچھ بولتا ہوا۔ کچھ کہتا ہوا۔ کچھ منواتا ہوا۔

اور ماہ رو کیوں نا، اس کی بات سنتی، مانتی.... عمل کرتی۔

اس نے دل کے کانوں کو اس کے حرف حرف پہ لگا دیا۔ عون عباس کہہ رہا تھا۔ تمہیں فریحہ سے معافی مانگنا ہو گی۔ ہر جرم کا اقرار کرنا ہو گا۔ کردہ یا نہ کردہ.... اور ہر صورت کرنا ہو گا۔ وہ گناہ گار ہوتی یا نہ ہوتی۔ مجرم ہوتی یا نہ ہوتی۔ اسے اقرار کرنا تھا۔ سب کے سامنے تسلیم کرنا تھا۔

ایک معذرت نامہ پیش کرنا تھا۔

اور اگر اتنی سی بات کے بدلے۔ اتنے سے عمل کے بدلے عون عباس اپنی داسی سے راضی ہو جاتا تو یہ سودا کیا گھاٹے کا سودا تھا؟

عون عباس کی خوشی اور خواہش کے لیے تو ماہ رو آگ کا دریا پار کر سکتی تھی۔ پل صراط پہ چل سکتی تھی۔ جان کی بازی لگا سکتی تھی۔ خود کو ہار سکتی تھی۔

پھر یہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔

صرف فریحہ سے معافی! گو کہ بہت ساری چیزوں میں ماہ رو انجان تھی۔ بے خبر تھی۔ اور جو کچھ ہوا تھا بے خبری میں ہوا تھا پھر بھی نادانستگی ہی سہی فریحہ کا دل ٹوٹا تھا۔ ماہ رو اس حد تک مجرم نہیں تھی پھر بھی معافی کے لیے تیار ہو گئی۔ گو کہ انجانے میں ہی سہی ... فریحہ کا دل تو فگار ہوا تھا۔ ماہ رو کی معافی بنتی تھی یا نہیں بنتی تھی۔ پھر بھی اس نے عون کی آواز پہ لبیک کہا تھا۔ وہ جان و دل سے حاضر ہو گئی تھی۔ ہر قسم کے نتائج کی پروا کیے بغیر۔

"بس عون عباس! اتنی سی بات؟ اگر پہلے کہہ دیتے اس انداز میں کہہ دیتے تو ماہ رو کبھی انکار نہ کرتی۔ انکار کرنے کی جرات ہی نہ کرتی۔ میں اپنی جان وار دیتی۔ خود کو ہار دیتی۔ لیکن تمہاری بات کبھی نہ رد کرتی۔" ماہ رو کے لہجے میں ٹھاٹھیں مارتے محبت کے سمندر کو محسوس کر کے عون عباس کا دل ہل گیا تھا۔ وہ سر تا پا ہل

گیا تھا۔ پھر وہ کچھ کہہ ہی نہ سکا۔ بول ہی نہ سکا۔ کیونکہ ماہ رو نے ہر ہر لفظ اور ہر ہر حرف کی تکمیل کردی تھی اور صرف لفظوں کی حد تک نہیں کی تھی بلکہ بڑے ہال میں جب سارا خاندان گھر کا بچہ بچہ موجود تھا تب بھی وہی الفاظ دوہرائے تھے جو فریحہ سننا چاہتی تھی اور جس کا گھر کے کسی بھی فرد کو گمان تک نہیں تھا۔ ماہ رو نے بڑے ٹھہرے ہوئے، ٹھوس، مستحکم اور پائیدار لہجے میں کہا تھا۔

"میں فریحہ سے معافی مانگتی ہوں۔ ان سب ناکردہ غلطیوں اور گناہوں کی اور کردہ گناہوں کی.... جو مجھ سے انجانے میں ہوئے یا جان بوجھ کر ہوئے۔ جس کی وجہ سے فریحہ کا دل ٹوٹا۔ اور میں اس دل کے سامنے شرمندہ ہوں۔ شرمسار ہوں۔ کیونکہ دل اللہ کا گھر ہوتا ہے۔ اس کو توڑ دینا گناہ ہے۔ مجھ سے یہ گناہ انجانے میں ہوا فریحہ یقین کرے یا نہ کرے۔" وہ لمحہ بھر کے لیے رکی تھی۔ "لیکن سچ یہی ہے۔" اس نے اپنی بات مکمل کردی تھی۔ اس صورت میں کہ ہر آنکھ حیران تھی۔ ہر چہرہ فق تھا۔ ہر کوئی جیسے دنگ تھا۔

فریحہ چاہتی تھی۔ ماہ رو جھک کر اس کے سامنے آئے۔ ذلیل ہو کر آئے۔ اپنے گناہوں تلے دب کر آئے۔ اور ماہ رو ایسے ہی جھک کر آئی بھی تھی۔ لیکن اس کے جھکنے کو اعلا ظرفی، وسیع القلبی کی واضح مثال کہا گیا تھا اور اس کی ساس نے روتی ہوئی ماہ رو کو سینے سے لگا کر محبت بھرا احساس بخشا تھا اور ماہ رو تب بھی تڑپ تڑپ کر ایک ہی بات دہرا رہی تھی۔ رو رو کر ایک ہی بات دہرا رہی تھی۔ اس کے لبوں پر ایک ہی پکار تھی۔ ایک ہی ورد تھا۔ ایک ہی گردان تھی۔

"عون عباس کے لیے....
عون عباس کے لیے....
ماہ رو سرفراز ہر حد سے گزر سکتی ہے۔ عون عباس کے لیے جھک بھی سکتی ہے۔ ناکردہ گناہ کا کشٹ بھی اٹھا سکتی ہے۔ عون عباس کے لیے ماہ رو سرفراز مر بھی سکتی ہے۔"



اور یہ فریحہ کے لیے دوسرا برتاؤ بچہ کا تھا۔

ہر چال کا رخ پلٹ جاتا تھا۔ ہر چال کا منہ الٹ جاتا تھا۔

فریحہ زخمی شیرنی کی طرح بپھر رہی تھی۔ ہر چال اس کے منہ پر پڑ رہی تھی۔

اس نے کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا تھا؟ وہ تو ماہ رو کا سر جھکانا چاہتی تھی۔ عون اور ماہ رو میں اختلاف کی ایک اور بڑی خلیج لانا چاہتی تھی۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ ماہ رو، عون کی بات کیسے مان گئی؟ کیوں مان گئی؟ وہ انکار کرتی تو منصوبہ کامیاب ہوتا۔ ان کا جھگڑا بڑھتا اور فریحہ عون کو طعنے دینے کے لیے پنجے تیز کرتی۔ اس کی بیوی اس کا کہا ایک لفظ تک نہیں مانتی۔

لیکن یہاں سب کچھ الٹ گیا تھا۔ بکھر گیا تھا۔

ماہ رو ایک مرتبہ پھر اپنی تمام تر بے وقوفی کے ساتھ جیت گئی تھی۔ فریحہ اپنی تمام تر ذہانت کے ساتھ ہار گئی تھی۔ وہ اعلا ظرف بھی بن گئی۔ وسیع القلب بھی بن گئی۔ وہ عاجز بھی بن گئی۔ وہ جھک بھی گئی۔ اور ایک مرتبہ پھر ماہ رو ہر جگہ ہر منظر میں واضح ہوتی چھا گئی تھی۔ ایک مرتبہ پھر فریحہ پس منظر میں چلی گئی تھی۔

ایسا کیوں ہوتا تھا؟ ہمیشہ ایسا کیوں ہوتا تھا؟ فریحہ کے ساتھ ہی کیوں ہوتا تھا؟ وہ ہر دفعہ خود سے یہ سوال پوچھتی تھی۔ لیکن ہر دفعہ کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔

لیکن اس دفعہ یہ نہیں ہونے والا تھا۔ بالکل نہیں ہونے والا تھا۔ کیونکہ اس دفعہ جو داؤ فریحہ نے چلا تھا وہ کامیاب ہو گیا تھا۔ قدرت نے اسے موقع فراہم کیا تھا۔ ایسا موقع جسے فریحہ نے اپنی ذہانت کے ساتھ مکمل اپنے بس میں کر لیا تھا۔ یہاں ماہ رو اور ماہ رو کا حسن ہار گیا تھا۔ فریحہ کی ذہانت جیت گئی تھی۔ ہوا کچھ اس طرح سے تھا۔

وہ ماہ رو کا جنم دن تھا۔ اس دن سے پہلے ماہ رو کے ڈیڈی اور ممی ابراڈ چلے گئے تھے۔ جانے سے پہلے وہ ملنے آئے تھے اور اس کے ہفتہ بعد ماہ رو کا برتھ ڈے آگیا۔ اس گھر میں پہلی مرتبہ بچوں کے علاوہ کسی کی

سالگرہ منائی جا رہی تھی۔ بہت دھوم دھام کے ساتھ۔ ہر ایک سرشار تھا۔ ہر ایک خوش تھا۔ ہر کوئی پرجوش تھا۔ حتی کہ عون بھی۔

عون چاہے جتنا مرضی خوش ہونے کا سوانگ بھرتا یا ماہ رو جتنی مرضی خود کو کامیاب، خوش اور سرشار کرنے کی اداکاری کر لیتی۔ پھر بھی فریحہ جانتی تھی وہ دونوں اول روز سے ہی ایک دوسرے سے دور ہیں۔۔۔ اور دور ہی رہیں گے۔ یہ فاصلے کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ کیونکہ بیچ میں فریحہ کھڑی تھی۔

اور اس دن فریحہ نے ماہ رو کو بہت خوش دیکھا تھا۔ اتنا خوش کہ اس کا اپنا بھی یقین ڈول گیا تھا۔ وہ خوش نہیں تھی۔ انتہاؤں کی خوش تھی۔ جیسے ہفت اقلیم کی دولت پالی ہو۔ جیسے پورا زمانہ پالیا ہو۔ اس نے آج بھی بلیو رنگ پہن رکھا تھا۔ بلیو کلر کی ستاروں سے بھری میکسی میں اس کی دودھیا رنگت چھلک رہی تھی، اس کے حسن کی تابناکی سے آنکھیں خیرہ ہو رہی تھی۔۔۔ اور دھڑکنوں کی حالت کا انت نہیں تھا۔

یہ تو عام لوگوں کا حال تھا۔ اور عون پہ اس نے کیا حشر سامانی کی ہوگی۔ وہ اپنے کمرے میں تیار ہو رہی تھی۔ بلکہ تیاری کو آخری ٹچ دے رہی تھی۔ جب اچانک عون کمرے میں بولتا ہوا داخل ہوا تھا۔

''ایک تو بچوں کو مات کرتی تم۔ موم بتیوں کو پھونک مار کے بجھاؤ گی۔ اور کیک کاٹو گی۔ اوپر سے تیاری ختم ہونے کو نہیں آ رہی۔ بچے الگ سیون اسٹوری کیک کو دیکھ دیکھ کر ماؤں کی جان کھا رہے ہیں۔ اب نکل بھی آؤ باہر یا اکیس توپوں کی سلامی پیش کروں۔۔۔ تم نے تو۔۔۔'' اور عون کے اگلے الفاظ منہ میں ہی گم رہ گئے تھے۔ وہ جیسے زنجیر پا ہو گیا تھا۔ یا مسحور ہو گیا تھا یا مبہوت ہو گیا تھا۔

اس کی آنکھوں میں رنگ محل کے سارے رنگ اتر آئے تھے۔ وہ ایک خواب کی کیفیت میں چلتا ہوا اس کے مقابل آ گیا۔ اس کے سامنے آ گیا۔

پھر اس نے عالم بے خودی میں ماہ رو کا رخ اپنی طرف موڑ لیا تھا۔

''یہ کس پہ بجلیاں گرانی ہیں؟'' اس کی آواز میں بھی بے خودی کی سوندھ گندھ گئی تھی۔ اس کے چہار جانب مہکار تھی۔ خوشبو تھی، رنگ تھے، جگنو تھے۔

عون کو لگا۔ وہ کھڑے سے گر پڑے گا۔ اس کے بازو ماہ رو کی کمر میں حمائل تھے اور جب وہ گرے گا تو ماہ رو اس کے اوپر۔۔۔ نہیں، اس وقت ایسی سچویشن افورڈ ایبل نہیں تھی۔ باہر لوگ تھے اور مہمان تھے۔ اور ماہ رو کی پکار بھی بہت واضح تھی۔ سب لوگ باہر اسے بلا رہے تھے۔ تاکہ وہ آئے اور کیک کاٹے۔ اور عون کے دل میں جو بھاپ کی طرح اٹھتا رومانس مچل رہا تھا اس کا کیا بنتا؟

اس نے عالم بے بسی سے ماہ رو کو خود میں سمو لیا۔۔۔ اور ماہ رو جیسے سراپا زعفران بن گئی تھی۔ ماہ رو کی ساری طراری اور اعتماد جاتا رہا تھا۔ پھر بھی اس نے پاگل ہوتی دھڑکنوں کو قابو کرتے ہوئے کہا تھا اور بمشکل ہی کہا تھا۔

''تم پہ بجلیاں گرانی ہیں۔۔۔'' وہ بار حیا سے ٹوٹ پڑتی تھی اور پلکوں کی جھالر اٹھتی نہیں تھی۔ اور دل تھا کہ عون عباس کے حضور سجدہ ریز ہو رہا تھا۔

''ہم تو کب سے مر مٹے۔'' عون کی آواز اور بھی بوجھل ہوئی۔

''لگتا تو نہیں۔۔۔ ثبوت دو تو بات بنے۔'' اس نے عون کی بات اسی پہ لوٹا دی تھی۔ وہ گلا کھنکار کر رہ گیا۔ پھر اس نے ماہ رو کی صبیح پیشانی کو ہاتھ کی پوروں سے چھوا اور نرم سی مہر محبت ثبت کی تھی۔

''کیا ابھی دوں؟'' وہ آنکھوں میں شرارت بھر کے پوچھ رہا تھا۔ اس کا اشارہ واضح تھا۔ دنیا جہاں کی بولڈ ماہ رو نے فریحہ کو بھری محفل میں معافی نامے کا اعزاز بخشا تھا تب سے عون کا رویہ، اس کے جذبات، اس کے احساسات میں واضح تبدیلی آ گئی تھی۔

عون بدل گیا تھا۔ اور واقعی عون عباس بدل گیا تھا۔ کم از کم ماہ رو کے لیے بدل گیا تھا۔

''نہیں، ابھی نہ وقت ہے نہ موقع۔۔۔'' ماہ رو نے اس کی بات کا جواب دیا تھا اور عون نے برجستہ آگے

ٹکرا لگا یا تھا۔

"اور نہ دستور۔۔۔۔ کیونکہ ثبوت حقیقی پیش کرنے کے لیے ایک وسیع پلیٹ فارم ہونا چاہیے۔ موقع ہونا چاہیے۔ دستور ہونا چاہیے۔ ہر چیز کا ایک قرینہ ہوتا ہے۔ ایک طریقہ ہوتا ہے۔ کیوں ماہ رو! ٹھیک کہا نا۔۔۔؟" عون نے پھر سے شرارت کی تھی۔ ماہ رو مسکرا دی۔ کھل کر' تازگی کے ساتھ۔ کیا وہ وقت قریب آرہا تھا۔ کیا شام ہجر جا رہی تھی؟ کیا عون کی بدگمانیاں ختم ہو رہی تھیں۔ کیا اس کا دل ماہ رو کی طرف پلٹ رہا تھا۔

"امی اور بھابھیوں نے اتنا خرچا کروا دیا۔ سالگرہ کے نام پر' ساتھ میں ولیمہ نپٹا دیتے تو کچھ فائدہ بھی ہوتا۔" پھر عون جان بوجھ کر اسے ستانے لگا تھا۔ چڑانے لگا تھا۔ ماہ رو نے بڑے برجستہ انداز میں کہا۔

"منہ دھو رکھو وہ خرچا الگ سے ہوگا۔ تم سستے میں چھوٹنے والے نہیں۔"

اس نے کھنکتی آواز میں مسکراہٹوں کے پھول بکھرائے تھے۔ جنہیں عون عباس نے شگفتہ لبوں سے سمیٹ لیا تھا۔ معاً" باہر سے عاشر کی آواز آئی۔

"بھائی صاحب! رومانس بعد میں فرمائیے گا۔۔۔ بچہ پارٹی بس کیک پہ دھاوا بولنے ہی والی ہے۔ دیکھنا' تمہارے باہر آتے تک کیک ہضم بھی نہ ہو جائے۔"

عاشر کی آواز پہ عون اور ماہ رو سنبھل کر سیدھے ہوئے تھے پھر مسکراتے ہوئے باہر نکل آئے۔ یوں کہ بڑے ہال میں جانے تک از خود عون نے ماہ رو کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور ماہ رو کو یوں لگا تھا وہ وصال یار پا گئی ہے اور ماہ رو سرفراز وہ اپنے کھوئے ہوئے عشق کو پا گئی ہے۔ وہ اپنے روٹھے ہوئے عشق کو پا گئی ہے۔

ہر آنکھ نے انہیں رشک بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ لیکن ایک آنکھ نے انہیں نفرت اور حسد بھری نظروں سے دیکھا تھا۔



اور اس ستاروں سے بھری چمکیلی رات میں ابھی وہ عون کو پالینے کی خوشی ٹھیک طرح سے محسوس کر بھی نہیں سکی تھی جب وہ ہو گیا تھا جس کا تصور بھی محال تھا۔ اور ماہ رو سرفراز نے زندگی میں پہلی مرتبہ سرخ آندھی کو اٹھتے دیکھا تھا۔ سرخ آندھی اور اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ بادلوں کو زمین پہ گرجتے دیکھا تھا۔ بدخواہوں کو آگ لگاتے دیکھا تھا۔ بدبختوں کو ہنستے مسکراتے چہروں سے مسکراہٹیں نوچتے دیکھا تھا۔

آفتیں کیسے ٹوٹتی ہیں؟ عذاب کیسے نازل ہوتے ہیں؛ ماؤس کیسی زندگیوں میں گھستے ہیں۔ اور ریاکار کیسے فتح یاب ہوتے ہیں؟ ماہ رو کو آج پتا چلا تھا۔ اور لوگ بظاہر معاف کر کے بھی معاف نہیں کرتے۔ بدلے لیتے ہیں۔ انتقام پورے کرتے ہیں۔ ماہ رو کو آج علم ہوا تھا۔

یہ وہی ستاروں بھری جگمگاتی شام تھی جس کے اختتام پر' سب مہمانوں کے چلے جانے کے بعد وہ سب لوگ بڑے ہال میں بیٹھے تھے۔ اور ماہ رو کو دیے جانے والے گفٹ کھول کھول کر دیکھ رہے تھے۔ یاسر' عامر اور عاشر ہر گفٹ پہ تبصرے کرتے' اس کی جانچ کرتے' مالیت کا اندازہ لگاتے اور برا سا منہ بنا لیتے تھے۔

"پر ہیڈ کے حساب سے زیادہ کھا گئے سستا تحفہ دے گئے۔"

ان کے ہر کمنٹ پہ ماہ رو ہنس ہنس کر بے حال ہو رہی تھی۔ پھر ڈپٹ کر کہتی۔

"تحفہ دیکھتے ہیں۔ اس کی قیمت نہیں دیکھتے۔۔۔ خلوص دیکھتے ہیں۔ باتیں نہیں بناتے۔" عاشر نے فوراً" نفی میں سر ہلایا تھا۔

"میں تم سے ایگری نہیں کرتا۔"

"اور میں بھی۔۔۔" یاسر نے بھی میدان میں آنا چاہا۔

"اب پوچھو بھلا کیوں؟" عاشر نے بڑی سمجھ داری سے کہا تھا۔ ماہ رو نے پوچھا کیوں۔

"اس لیے کہ اگر ہم برتھ ڈے پہ بلا کر مہمانوں کے سامنے گھاس پھونس رکھ دیتے۔ کدو پکا کر رکھ دیتے۔ کیک کی بجائے حلوے کا پہاڑ بنا کر اوپر موم بتی لگا دیتے۔۔۔ اور سب مہمانوں کے سامنے مارے خلوص

کے بچھ بچھ جاتا۔ ان کے قدم تک پکڑ لیتے۔ پھر بھی کوئی ہمارے خلوص کو دیکھنا گوارا نہ کرتا۔ لات مار کے چلا جاتا۔ سو سو باتیں الگ کرتا۔ پورے زمانے میں برتھ ڈے پارٹی کا مینیو بھی نشر کرتا۔" عاشر نے اتنے مزاحیہ انداز میں بات مکمل کی تھی کہ پوری محفل زعفران زار بن گئی تھی۔

سب لوگ ہنس ہنس کر بے حال ہو گئے تھے۔ انہی قہقہوں کے درمیان میں اچانک ' ہاں بالکل اچانک پورب کی طرف سے سرخ آندھی اٹھی تھی۔ غبار ' گندگی ' غلاظت ' خاک ہی خاک۔ مٹی ہی مٹی ' ریت ہی ریت۔ وقت زوال ماہ رو سرفراز پہ تن کے کھڑا تھا۔

وہ کون سی گھڑی تھی جب اس کی زندگی میں بھونچال آگیا۔ وہ بھی وقاص کے توسط سے۔ وہی وقاص جو شازمہ کا پی ایچ ڈی بھانجا تھا۔ نہائیت قابل ' معزز ' باوقار۔۔۔

اور ایک وقت میں یہی کوئی سات آٹھ ماہ پہلے اس کا ماہ رو کے لیے پرپوزل آیا تھا۔ جو آیا اور گیا۔۔۔ ماہ رو کو کبھی بھول کے بھی یاد نہیں آیا تھا۔

اور آج وہی وقاص رات کے بارہ بجے گفٹ پیک اٹھا کر ماہ رو کے گھر چلا آیا۔ ماہ رو کی محبت میں؟ دوستی میں آخر کس رشتے اور کس تعلق کی بنیاد پر؟

ماہ رو تو اسے جانتی تک نہیں تھی۔ اس کا وقاص سے ایسا کوئی تعلق نہیں تھا جس کے توسط سے وہ ماہ رو کو تحفے دیتا۔ بلکہ خود دینے آتا۔

آخر یہ سب کیا تھا؟ وقاص کیوں آیا تھا؟ وقاص کس لیے آیا تھا؟ اور گیٹ تک ہی کیوں آیا تھا؟ اور یہ فریحہ بتا رہی تھی۔ تحفے وقاص دے کر گیا تھا۔ ساتھ ایک خط بھی تھا۔ جو فریحہ نے ہی وصول کیا۔ گفٹ اور خط دونوں چیزیں۔۔۔ بلکہ خط نما کارڈ۔ خاصا بڑا اور اسٹائلش۔

اور فریحہ نے ماہ رو کو دینے کی بجائے عون کے ہاتھ میں پکڑائی تھیں۔ دونوں چیزیں۔۔۔ دونوں ناگ ' دونوں برزخ۔۔۔ دونوں رنگ کی آگ۔

اور عون نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے گفٹ کھولنے کی بجائے وہ خط کھول لیا تھا۔ اور پھر جیسے جیسے وہ پڑھتا گیا۔ محفل کا رنگ بدلتا گیا۔ ہر طرف سکوت چھا گیا۔ ہر طرف سناٹا پھیل گیا۔

اس نے خط یا کارڈ کا متن پڑھا۔ بہت نازک سے ٹشو کے صفحات کا تھا۔ بیچ میں سنہری تتلیاں تھیں۔ جو کارڈ کھولتے ہی پھدک پھدک کر اوپر کو اٹھتیں۔ یہ کارڈ یہاں سے نہیں مل سکتا تھا۔ کافی مہنگا تھا۔

عون نے اپنی سرخ آگ سی نگاہ کارڈ کے متن پہ جما دی تھی۔

"جان عزیز! جنم دن مبارک ہو۔۔۔ شادی کے بعد پہلی سالگرہ میں ہی ہمیں بھول گئیں۔۔۔ تم سا ہرجائی کون؟ تم سا بے وفا کون؟ کال اس لیے نہیں کی کہ تم اور تمہارا پرنس ڈسٹرب نہ ہو۔ کہیں لمبی کال مار دوں اور وہ ہم سے جیلس نہ ہو جائے۔ ایک دفعہ تم ہاتھ آجاؤ۔ تو لمبے عرصے کے لیے لے اڑیں گے تمہیں۔ بہت بورنگ اور ڈل ہو چکی تم۔۔۔ ورلڈ ٹور پہ جائیں گے تو پرانی ماہ رو کو واپس لے آئیں گے۔

باقی کہانی بعد میں سہی۔۔۔ مے دس ایونٹ برنگ ہیپی نیس ٹو یو۔۔۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔۔۔" کارڈ میں میوزک بجنے لگا تھا اور ساتھ فریحہ کی کمنٹری بھی۔

"وقاص نے کہا۔ وہ ماہ رو کی زندگی سے جا چکا ہے۔ گو کہ یہ بہت بے وفا نکلی۔ ہرجائی نکلی۔ پلٹ کر حال بھی نہیں پوچھا۔ پھر بھی میں اس کا برتھ ڈے وش نہ کروں یہ کہاں گوارا کر سکتا ہوں۔" اور فریحہ نے اس رات اپنی کمینگی کی ہر انتہا دکھا دی تھی۔ ہر حد سے گزر گئی تھی۔ ہر انتہا کو پہنچ گئی تھی۔

اور اس کے لفظ آگ تھے۔ شرارے تھے۔ شعلے تھے۔ زہریلے ناگ تھے۔ جنہوں نے ماہ رو کو ڈس لیا تھا۔ نیل نیل کر دیا۔ فریحہ نے اور بھی بکواس کی تھی۔ اس نے ایسی ایسی شرم ناک باتیں بتائی جنہیں سن کر اس کے ابا اور تایا تک دنگ رہ گئے تھے۔ فریحہ بولتی رہی۔ آگ برساتی رہی۔ آگ بھڑکاتی رہی۔

اور سب لوگ انگشت بدنداں اسے سن رہے تھے۔ جیسے سن ہو رہے تھے۔ جیسے ان کی زبانیں تالو

سے چپک گئی تھیں۔

پھر فریحہ کی زہر بجھی زبان کو بریک لگ گئے تھے کیونکہ عون عباس کسی شیر کی طرح دھاڑتا ہوا ماہ رو پہ پل پڑا تھا۔ پھر سرخ آسمانوں اور ڈولتے پتواروں نے دیکھا تھا۔ پھر سسک پڑتی خزاؤں نے دیکھا تھا۔ ماہ رو سرفراز کا چہرہ عون عباس کی وحشت سے دوسری مرتبہ داغ دار ہو گیا تھا۔ خونم خون ہو گیا تھا۔

وہ لہرا کر زمین پر گری تھی... اور وہ زمین پہ نہیں گری تھی۔ وہ پاتال میں جا گری تھی اور وہ کسی وحشی درندے کی طرح چیخ رہا تھا۔

"تمہاری ذات میں اتنے کانٹے ہیں کہ کوئی تمہارے قریب کیسے آئے؟ اور تم ناگن کی ایسی قسم میں سے ہو جس کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا۔ دوسرا سانس بھی نہیں لیتا۔

تم نالی کا کیچڑ تھیں... تم گند تھیں۔ تمہیں میرے ماں باپ نے سر آنکھوں پہ بٹھا لیا۔ تم جیسے فاحشہ کو عزت دی۔ تمہیں محبت دی۔ تم غلیظ عورت! نالی کا گند ہو۔ غلاظت ہو۔

تم جیسی ذلیل عورتوں کو تمہاری اعلا سوسائٹی کے ریپر نے چھپا رکھا ہے۔ تم جیسی عورت ہمارے جیسے گھرانوں میں خدانخواستہ ہوتی تو اب تک قبر میں اتار دی جاتی۔

وہ تمہارا باپ تھا جس نے تمہاری ہر "بدکرداری" پہ پردہ ڈال رکھا تھا۔ اور یہ میں ہوں عون عباس! اپنے اس پورے خاندان کے سامنے اپنی زندگی سے نکال رہا ہوں۔ دفع کر رہا ہوں... کیونکہ عون عباس سب کچھ برداشت کر سکتا ہے لیکن بدکردار عورت کو ایک پل اپنی زندگی میں نہیں رکھ سکتا... ابھی اور اسی وقت اپنے عاشق صادق کے پاس دفع ہو جاؤ... چلی جاؤ۔ نکل جاؤ... میں تمہیں دھتکار رہا ہوں۔ دھتکار رہا ہوں دھتکار رہا ہوں۔" عون نے بالوں سے پکڑ کر ماہ رو کو گھسیٹا اور ایک زوردار دھکا خارجی دروازے تک دیا۔

وہ لڑکھڑاتی ہوئی دہلیز کے بیچ گھٹنوں کے بل گری تھی۔ اس کا ماتھا پھٹ گیا۔ اور لمحوں میں خون آلود ہو گیا تھا۔

ماہ رو نے پھٹتے سر کی ساری اذیت کو بھلا کر اک نفرت بھری نگاہ اس پورے ماحول پہ ڈالی تھی اور پھر اتنی تذلیل، بے عزتی، نفرت، دھتکار کے بعد بھی اپنی جگہ پہ اٹھی اور تن کر کھڑی ہو گئی۔ ہر ایک کی نگاہ میں پھر سے تعجب اور خوف امڈ آیا تھا۔

"بس یا کچھ اور؟" ماہ رو نے اپنے بکھرے حواسوں کو یکجا کر کے بڑے ضبط اور بڑے تحمل سے کہا تھا۔ پھر عون کی شعلہ اگلتی نگاہوں میں دیکھتی پھٹ پڑی تھی۔

"وقاص کون تھا؟ کیا ہے؟ میں اسے نہیں جانتی اور صفائی بھی نہیں دوں گی۔ تم کیا ہو، تم کیا تھے میں بس تمہیں جانتی تھی۔ میں بس تمہیں جانتی ہوں۔" ماہ رو لڑکھڑا کر آگے بڑھی گفٹ اور زمین پہ پڑا کارڈ اٹھایا۔

"تم نے ایک کارڈ کی مبہم تحریر پڑھ کر مجھ پہ الزامات کی بوچھاڑ کر دی۔ تم نے فریحہ کی ایک ایک بکواس پہ یقین کر لیا۔ یہ تمہارے گھر کی پاک باز عورت ہے۔ معصوم، سادہ، بے گناہ...

میں بازار کی عورت ہوں۔ فاحشہ، عیاش، مکار، بدنام، بدکردار۔

تم نے اپنی کزن، اپنے گھر کی شریف عورت کی ہر بات کو سچ تسلیم کر لیا۔ اس لیے کہ فریحہ سچی ہے۔ تم سب کی نظر میں سچی ہے۔ میں بدکردار ہوں... فاحشہ ہوں، مکار ہوں، دھوکے باز ہوں تو میں جھوٹی ہوئی۔

تم نے اس کارڈ کی تحریر پڑھی۔ تم نے اس کے فٹ نوٹ پہ لکھا نام نہیں پڑھا۔ تم نے بہت اچھا کیا۔ نہیں پڑھا۔ اگر پڑھ لیتے تو مجھے اندازہ کیسے ہو پاتا کہ تمہاری نظر میں میری اوقات کیا ہے؟

تمہاری سوچ ایسی سطحی اور چھوٹی ہو گی۔ مجھے گمان تک نہیں تھا۔ خیال تک نہیں تھا۔

اور وقاص کون تھا؟ یہ فریحہ کو بتانے کی جھوٹی کہانی پاس سے بنا کر سنانے کی ضرورت نہیں۔" ماہ رو کے دھیمے سلگتے الفاظ پہ حاضرین محفل کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ حتی کہ عون عباس بھی دم بخود رہ گیا تھا۔ جبکہ فریحہ کی امی اپنی بیٹی کا نام سن کر چیخ پڑی تھیں۔

"اے لڑکی! اپنی گندی زبان سے میری بیٹی کا نام

مت لے۔" ان کی غراہٹ پہ ماہ رو سابقہ تحمل بھرے لہجے میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"آپ کی بیٹی بے شک مجھ پہ گند گراتی رہے۔ یہ کیسا انصاف ہے؟ اور شاید یہاں ایسا ہی انصاف ہے۔ لیکن مجھے فریحہ سے کوئی شکوہ نہیں... کوئی گلہ نہیں... اس نے تو ادلے کا بدلہ کرنا تھا۔ پورا پورا بدلہ لینا تھا۔ اپنی ذلت کا انتقام لینا تھا۔ سو اس کا بدلہ تو پورا ہوا۔

بقول فریحہ کے میں نے اس کو عون کی زندگی سے نکالا تھا۔ آج اس نے مجھے بھی نکلوا دیا۔ بہت اچھا کیا... اپنا انتقام پورا کر لیا۔

جہاں تک اس کارڈ کا تعلق ہے تو یہ کارڈ میری ممی شازمہ نے بھیجا ہے... اور یہ گفٹ جس کے ریپر پہ کوریئر کی مہر' ٹکٹ اور سگنیچر ہیں... یہ غیر ملکی ٹکٹ اور مہر بتاتی ہے کہ یہ گفٹ اور کارڈ کہاں سے آیا۔ میری ممی اور ڈیڈی میری شادی کے بعد پہلی برتھ ڈے میں شریک نہیں ہو سکے۔ لیکن انہوں نے مجھے ابراڈ جا کر بھی بھلایا نہیں... یقیناً" یہ گفٹ وقاص کے ایڈریس پہ بھیجا گیا تھا۔ اور وقاص اس امانت کو یہاں مجھ تک پہنچا گیا۔ اگر تسلی کرنی ہے تو فون اٹھائیں اور کال ملائیں۔

اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے وقاص کی شادی کو سات ماہ ہو چکے ہیں۔ وہ ایک شریف اور معزز انسان ہے... گو کہ وہ ایک غیر مناسب وقت میں یہاں آیا۔ لیکن اسے یقیناً" میری ممی نے مجبور کیا ہو گا کہ رات بارہ سے پہلے مجھے گفٹ دے کر جائے... میری ممی ان نزاکتوں کو سمجھتی نہیں۔

اور یہ گفٹ پہ لکھا ایڈریس' مہر ٹکٹ آپ کی تسلی کے لیے ہیں... اور کارڈ پہ فٹ نوٹ لکھا بھی دیکھ لیں۔ شازمہ سرفراز لکھا صاف نظر آ رہا ہے... اندھوں کو بھی نظر آ رہا ہے اور جو فریحہ نے کہا وہ سب جھوٹ' بکواس اور انتقام ہے۔ اور رہا مجھے اس گھر سے یا گھر کے افراد سے کوئی گلہ نہیں... بس اتنا ضرور تلخ ترین مرحلوں سے گزرنے کے بعد اندازہ ہو چکا ہے کہ کسی کی زندگی میں واقعی زبردستی نہیں گھستے۔

اور کبھی محبت کے حصول کی دعا بھی نہیں کرتے۔ اگر کچھ طلب کرنا ہو تو عزت اور اعتماد طلب کرنا چاہیے۔

ان دو چیزوں کے سامنے محبت' بہت ہیچ ہے اور محبت بہت ہیچ ہے۔

مجھے ماہ رو سرفراز کو آج اندازہ ہوا ہے کہ محبت کس قدر ذلیل کرتی خوار کرتی۔ رسوا کرتی اور بار بار دھتکارتی ہے۔" ماہ رو نے اپنے پھٹے ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر ابلتے خون کو روکنے کی ناکام سی سعی کی تھی اور پھر دوسرے ہی لمحے کارڈ' گفٹ ہوا میں اچھالتی مڑی اور الٹے قدموں اونچی آواز میں روتی ہوئی رحمان منزل سے دور بہت دور چلی گئی تھی۔ یوں کہ ماہ رو کو آوازیں' دیتے پیچھے بھاگتے' پکارتے وہ سب لوگ التجائیں کرتے خالی ہاتھ رہ گئے تھے۔ بالکل خالی ہاتھ۔

اور وہ ماہ رو سرفراز جو بالکل اچانک تین ماہ پہلے ان کی زندگیوں میں کسی ناگہانی آفت کی طرح آئی تھی۔ پھر کسی طوفان کی طرح نہیں سبک خرام ہوا کی طرح چپکے سے ہمیشہ کے لیے نکل گئی۔ اور شاید واقعی ہی ہمیشہ کے لیے۔



ماہ رو کی زندگی میں طوفان آیا اور بہت ساری تباہیاں مچاتا نکل گیا۔

وہ واپس سرفراز ولا آ چکی تھی۔ اور اس کے آتے ہی ممی' ڈیڈی بھی افتاں خیزاں پہلی فلائٹ سے پاکستان پہنچ چکے تھے۔ ماہم بھی حواس باختہ آ گئی۔ وہ دبئی فیشن شو کے لیے گئی تھی ماہ رو نے اسے بھی ارجنٹ بلا لیا وہ بڑی اداس ویران اور تنہا تھی اس کے دل پہ بہت بوجھ تھا اور وہ کسی اپنے کے کندھے پہ سر رکھ کر بہت سا رونا چاہتی تھی۔

پھر ماہم آ گئی تو ماہ رو کی جلتی روح کو بھی سکون آ گیا۔ پھر جو ماہ رو نے رو رو کر اپنے دل کی حکایت پہلے شازمہ اور ڈیڈی کو سنائی پھر ماہم سے دل کے سارے دکھ بیان کیے۔

ماہم چپ چاپ سنتی رہی تھی۔ اس نے ماہ رو کو ٹوکا نہیں۔ دل کھول کر رونے دیا۔۔۔ اس ساری کہانی بلکہ لحہ بھر کی غلط فہمی میں بار بار وہ ایک ہی بات دہراتی تھی۔

"ساری دنیا جو بھی کہہ لیتی۔۔۔ عون عباس مجھے کریکٹرلیس نہ کہتا۔ بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے اس نے کیسے مجھ پہ اتنے گھٹیا الزام لگائے تھے؟ اس کے ضمیر نے کیسے گوارا کیا؟" وہ تڑپ تڑپ کر روتی تھی۔ اور پچھلے ایک ہفتے سے رو رہی تھی۔ جب اس کا صدمہ کچھ کم ہوا' غصہ تھوڑا ہلکا ہوا۔۔۔ اندر کا سارا غبار نکل گیا تب ماہم نے شازمہ کے کہنے پہ آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے اسے سمجھانا شروع کیا تھا۔

"جس اذیت میں تم مبتلا ہو۔۔۔ سیم اسی تکلیف سے عون بھی گزر رہا ہے۔ اس کے گھر والے بھی گزر رہے ہیں۔ اور یہ تو تم خود بھی کہتی ہو۔ عون کے گھر والے تمہیں بہت چاہتے ہیں۔ عون کی امی دس مرتبہ کالز کرچکی ہیں اور تین مرتبہ تمہیں لینے آچکی ہوں۔ جو غلط فہمی ہوئی تھی۔ وہ اسی وقت ختم بھی ہوگئی۔ عون کو وقتی غصہ آیا تھا۔ کسی بھی انسان کو ایسی سچویشن میں غصہ آسکتا ہے۔ یہ فطری عمل تھا ماہ رو! اب وہ بے چارا پچھتا رہا ہے۔ ایک ہزار ایک مرتبہ۔۔۔" ماہم بڑے پیار' بڑی نرمی اور ملائمت سے اسے سمجھا رہی تھی جب ماہ رو نے سوں سوں کرتے ہوئے' بہت تنگ کر کہا۔

"عون کا نام مت لو۔ اس کی وکالت نہ کرو۔ مجھے اس کا نام بھی نہیں سننا۔" وہ غصے سے چیخ گئی تھی۔ برہم ہوگئی تھی۔ البتہ عون کی امی کا سن کر تھوڑا نرم بھی پڑی تھی۔ جو بھی تھا۔ عون کی امی اور اس کے گھر والے عون جیسے ہرگز نہیں تھے۔

"ٹھیک ہے نہیں لیتی۔۔۔ اگر وہ خود آجائے تو؟" ماہم نے ڈرتے ڈرتے پوچھنے کی جسارت کی تھی۔

"تو میں اسے اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دوں گی۔۔۔" ماہ رو نے آگ بگولا ہو کر کہا۔ "یا اسے قتل کردوں گی۔ ایسوں کی ایسی ہی سزا ہونی چاہیے۔"

"وہ پھر وہ تمہارے ہاتھوں قتل ہونے آگیا ہے ماہ رو! اگر قتل کا ارادہ بدل جائے تو مجھے بتا دینا۔ تمہاری توہین کا بدلہ لینے کے لیے جوس میں پوائزن ملادوں گی۔ تاکہ اسے سزا تو مل سکے۔" ماہم نے بڑی سنجیدگی اور راز داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ماہ رو کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں دیکھا تھا جہاں پہلے تعجب ابھرا اور پھر غصہ بھر گیا تھا۔

"اللہ نہ کرے! بہت کمینی ہو تم۔" ماہ رو دہل گئی تھی پھر ماہم کو قہقہہ لگا کر لوٹ پوٹ ہوتے دیکھا اور خود بھی مسکرا دی۔ یہ اور بات ہے کہ مسکراہٹ چھپانے کے لیے منہ کے آگے کشن رکھ لیا تھا۔

"غصہ تھوک دو ماہم کی جان! اور یہ غصہ ہے بھی اوپر اوپر سے۔ بہت بن لیا تم نے۔ اب بس کرو۔ اور ان ماں بیٹے کی فریاد سن لو۔ وہ نیچے سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ اور پچھلے ایک ہفتے سے بے چارے ہر روز تمہیں منانے کے لیے آتے ہیں۔۔۔" اور ابھی ماہم کے اگلے الفاظ منہ ہی میں تھے جب شازمہ کسی کا بازو پکڑ کر اندر لے آئی تھی۔۔۔ اور وہ کوئی ایسا تھا جسے دیکھ کر ماہ رو کی روح فنا ہوگئی تھی۔ وہ بیٹھے سے ایک دم کھڑی ہوگئی۔

"ہماری ماہ رو کو منا سکتے ہو تو منالو۔ بس یہ چیلنج اچیو کرو۔ باقی کا معاملہ ہم پہ چھوڑو۔" شازمہ نے ماہم کو اشارہ کیا تھا پھر وہ دونوں مسکراہٹ دبا کر روم سے باہر نکل گئی تھیں۔

وہ دونوں روم میں تنہا رہ گئے تھے۔ آج میوزک بھی بند تھا۔ روم خاموش تھا۔ البتہ کمرے کے در و دیوار جاگ رہے تھے۔ بول رہے تھے۔ گنگنا رہے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے والی اداسی اچانک ختم ہوگئی تھی۔ وہ خاموشی سے کمرے کی ایک ایک چیز کو دیکھتا رہا۔ پھول' پردے' بیڈ' میوزک سسٹم' اور دیوار پہ لگی اپنی ہی انلارج تصویر کو' جانے کب یہ فوٹو ماہ رو اڑا کر لے آئی وہ کچھ متحیر سا اپنی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ پر اس نے نگاہوں کا زاویہ بدل کر ماہ رو کو دیکھا اسے شدید دھچکا لگا تھا۔ وہ پہلی والی ماہ رو نہیں تھی۔ ایک ہفتے میں بہت

ویک ہو چکی تھی۔ چہرہ مرجھا گیا تھا۔ آنکھیں بھی بجھی بجھی تھیں۔

آخر وہ اتنے بڑے صدمے سے گزری تھی اور وہ بھی عون کی وجہ سے۔

اسے اپنی جذباتیت پہ شدید غصہ آگیا۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ خود کو ملامت کرتا اپنے آپ پہ غصہ ہی تو کر رہا تھا۔ دراصل وہ شدید قسم کا جذباتی اور فوراً" رد عمل ظاہر کرنے والا بندہ تھا۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی اور عادتیں چھوٹ ہی جاتی ہیں۔ اس نے سوچ لیا تھا۔ وہ اپنی اس عادت کو بدل لے گا۔

اور اب ماہ رو کی طرف یک ٹک دیکھتا عون سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ گفتگو کو کہاں سے شروع کرے۔ تمہید کس طرح سے باندھے؟ اور ماہ رو کی بدگمانی‘ غصے‘ دکھ اور اذیت کو ختم کیسے کرے؟

بہت دیر کی بچار کے بعد جب ماہ رو کو اس کی نگاہوں سے الجھن ہونے لگی تھی تب عون کو بالا خر بولنا ہی پڑا تھا۔ لیکن اس سے بھی پہلے وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا ماہ رو کے قریب آیا تھا۔ پھر وہ گھٹنوں کے بل ماہ رو سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر بیٹھ گیا تھا۔

ماہ رو جو غصے میں رخ بدل چکی تھی اور اٹھنے کے لیے پر تول رہی تھی۔ عون کو اتنا قریب بیٹھا دیکھ کر قدرے بے بس ہو گئی۔ تاہم اس کی سماعتیں عون کی آواز کا لاشعوری طور پہ انتظار کر رہی تھیں۔ جو بھی تھا۔ اس ستم گر سے عشق تو تھا ہی۔ ہر اچھائی اور برائی سے مبرا۔ اس نے عون سے محبت کی تھی۔ اس کی خوبیوں اور خامیوں سے نہیں۔

وہ اب بھی عون کو ہی چاہتی تھی۔ اس کی خامیوں اور خوبیوں کو نہیں۔

کافی دیر ماحول پہ خاموشی چھائی رہی تھی۔ جسے بالا خر عون کی آواز نے توڑ دیا تھا۔

"ماہ رو....!" وہ بولا تو جیسے انگ انگ بول اٹھا تھا۔ پورا ماحول بول اٹھا تھا۔ بیڈ روم کی ایک ایک چیز بول اٹھی تھی۔

"بہت لمبی تمہید میں نہیں پڑوں گا۔ حساب دان ہوں۔ حسابی بات کروں گا۔ مختصر مگر جامع۔ گو کہ سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ بات کہاں سے شروع کروں؟ تمہیں اپنے بارے میں بتاؤں یا تمہیں تمہارے بارے میں بتاؤں؟ چلو‘ تم آج مجھے بغیر ٹوکے سنتی رہو۔ میں بہت لمبی کہانی نہیں سناؤں گا۔

میں عون عباس‘ بہت جذباتی آدمی ہوں۔ جب بچہ تھا تب بھی جذباتی تھا۔ جب بڑا ہوا تب بھی جذباتی رہا۔ مجھے ہر بات پہ فوری رد عمل دینے کی عادت تھی۔ میں غور و فکر عموماً" بعد میں کرتا ہوں۔

میرے اپنے باپ سے اختلاف اپنی جگہ تھے۔ اور یہ بہت شروع کے اختلاف تھے۔ یقیناً" تمہیں امی نے بتا دیا ہو گا۔ ابو کس طرح سے میرے ہر شوق کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے تھے۔ مجھے فوج میں نہ جانے دیا ۔ وکالت نہ پڑھنے دی۔ مجھے جاب نہ کرنے دی۔ ابراڈ نہ جانے دیا.... اور ابو بے شک مجھے نافرمان کہتے تھے پھر بھی ہر اختلاف کے بعد میں ماننا ہر بات ابو کی تھا۔ یہ ساری باتیں‘ بہت پہلے کی تھیں۔ اصل جو جھگڑے کی شروعات ہوئی تھی وہ تمہیں امی نے نہیں بتائی۔ جب امی کو لگا‘ میں شادی کی عمر کو پہنچ چکا ہوں تو امی نے چپکے ہی چپکے فریحہ کے لیے چاچی کو میرا نام دے کر راضی کر لیا تھا۔ چاچی کی بھی خواہش تھی‘ میں ان کا داماد بنوں۔

کیونکہ ابو سے چند اختلافات کے علاوہ میں بڑا فرمانبردار قسم کا بندہ تھا۔ امی نے جب مجھ سے پوچھا تو میں نے ان کی پسند کو ایکسیپٹ کر لیا۔ تب میرے ذہن میں نہ خواب تھا نہ کوئی خیال تھا۔ لیکن جب ابو کو پتا چلا تو وہ بہت برہم ہوئے.... ان کے نزدیک میں ضدی‘ ہٹ دھرم‘ من مانی کرنے والا اور کاروبار سے بے زار رہنے والا بندہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ فریحہ کے لیے کم از کم مجھے نہ منتخب کیا جائے۔

"کیونکہ فریحہ خاصی سمجھ دار‘ سنجیدہ اور مدبر قسم کی لڑکی تھی۔" وہ لمحہ بھر کے لیے رکا تھا" اور عاشر‘ فریحہ کے متعلق سوچنے لگا تھا۔"

وہی عاشر جو شادی کے نام سے بدکتا تھا۔ لیکن فریحہ کے لیے اس نے حامی بھر لی تھی۔ اور فریحہ نے کیا کیا؟

اپنے ہاتھوں عاشر کو بھی کھو دیا۔ جو کچھ فریحہ نے کیا۔ جو کچھ اچانک ہوا تھا۔۔۔ یا جس تکلیف سے ماہ رو گزر کے یہ گھر چھوڑ گئی تھی یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

ہر کوئی فریحہ کی سازش اور بدنیتی کو جان گیا تھا۔ اور یہ فریحہ کے لیے مزید بڑا دھچکا تھا۔ کہا جاتا ہے نا۔۔۔ انسان زمین سے گرا ہو تو کھڑا ہو سکتا ہے لیکن کسی کی نظر سے گر کر دوبارہ کھڑا ہونا محال ہے۔

اور فریحہ ان دنوں ایسے ہی فیز سے گزر رہی تھی۔

نہ صرف عون کی ہمدردیوں کے رخ بدل گئے تھے بلکہ تایا تائی کی شفقتوں کا انداز بھی بدل گیا تھا۔ جہاں تک عاشر کا تعلق تھا۔ تو فریحہ کی سازش کھل جانے کے بعد عاشر بھی اکھڑا اکھڑا رہنے لگا تھا۔ وہی عاشر جو درپردہ فریحہ کو جانے کب سے پسند کرتا آرہا تھا۔

لیکن جب فریحہ عون سے منسوب ہو گئی تھی تب عاشر خود بخود پیچھے ہٹ گیا تھا۔ کیونکہ اسے اخلاقی قدروں کی تربیت دی گئی تھی۔ وہ پرائی امانتوں کی خواہش کیوں رکھتا۔

ماہ رو کی سالگرہ سے پہلے عاشر نے اپنی امی سے ڈھکے چھپے لفظوں میں فریحہ کے متعلق بات کی تو وہ دل سے راضی ہو گئی تھیں۔ انہیں فریحہ شروع سے پسند تھی۔

جب عون والا مسئلہ الجھ گیا تب بھی وہ فریحہ کو بہو بنانے کی خواہش رکھتی تھیں۔ کیونکہ عاشر فریحہ کو بہت عرصے سے پسند کرتا آرہا تھا۔ لیکن اب حالات مختلف تھے۔

عاشر نے خود فریحہ سے رشتہ نہ جوڑنے کی بات بڑوں تک پہنچا دی تھی۔

فریحہ نے سنا تو ایک اور دھچکے کے زیر اثر پچھتاووں میں گھر گئی۔

عاشر کبھی بھی ایسی لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا جو نیت کی بری تھی۔ جس کی نیت میں کھوٹ تھی اور جس کے شر سے اس کے بھائی کا گھر اجڑنے لگا تھا۔

رشتوں کی بنیاد خلوص پہ ہوتی ہے۔ نیت خالص نہ ہو تو رشتے بھی خاص نہیں رہتے' کیا خبر' کچھ وقت گزرتا تو عاشر اپنے دل کو دوبارہ فریحہ کی طرف موڑ لیتا۔ لیکن اس کے لیے بہت وقت درکار تھا۔۔۔ اور فریحہ کو واپس اپنے حقیقی خالص وقار کو بحال کرنے میں بڑا وقت لگنا تھا۔ بڑا لمبا سفر کرنا تھا۔

اور اس وقت ماہ رو کو ایک ایک حکایت بتاتا وہ چونک گیا تھا۔ پھر اس نے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ اب وہ ماہ رو کو فریحہ اور اپنی دوستی کے متعلق بتا رہا تھا۔

"گو کہ فریحہ سے میری دوستی بہت تھی پھر بھی میں نے اس کے ساتھ شادی کا کبھی سوچا نہیں تھا۔

اور ابو نے بھی خاصی مخالفت کی۔ لیکن پھر امی کے سامنے مان گئے۔ ورنہ وہ فریحہ کے لیے عاشر کو ہی چاہتے تھے۔ جب ابو کی مخالفت کا مجھے پتا چلا تب مجھے بہت دکھ ہوا کہ ابو کی نگاہ میں میری اتنی سی بھی وقعت نہیں۔ مجھے فوری ردعمل دینے کی عادت تھی۔ سو میں ابو کے سامنے فریحہ سے شادی کے لیے انکار کر آیا۔ میں نے ان سے کہا" آپ فریحہ کی عاشر کے ساتھ کر دیں۔۔۔ میرا انکار ابو کو سخت توہین لگا تھا۔

تب ابو کی میرے ساتھ خوب لڑائی ہو گئی تھی۔ انہوں نے مجھے کمینہ' باغی اور خود غرض تک کہا۔ اور بھی جانے کیا کیا۔ پھر ابو کو یہ بات کبھی بھولی بھی نہیں تھی۔ وہ اکثر مجھے جتاتے تھے اور طعنے دیتے تھے۔

خیر' رشتہ تو طے ہو گیا۔ لیکن پھر ہوا کیا؟

قصہ مختصر ایک دھوپ بھری دوپہر میں ایک حسین و جمیل سرپھری لڑکی نے ایک اچھے بھلے جذباتی لڑکے کو اپنا اسیر کر لیا تھا۔ بھلا کیسے؟

کوئی بھی بات پرانی نہیں۔ اور نہ مجھے بھولی ہے۔۔۔ نہ میں بھول سکتا ہوں۔

تم فریحہ کے ساتھ رحمان پلازہ آئی تھی اور پہلی مرتبہ آئی تھی۔ جب تم انٹرنس سے اندر آرہی تھی تب۔۔۔ ہاں' واقعی تب میرے دل نے ایک بیٹ مس کی تھی ماہ رو! تم مانو یا نہ مانو۔۔۔ اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ تم فریحہ کے ساتھ آئی ہو۔۔۔ میں تو اپنے تئیں

فریحہ کو جھڑکنے کے لیے پیچھے آیا اور پھر خود ہی حیران رہ گیا۔

میرے پیچھے تم کھڑی تھی۔ اور تم مجھے دیکھ رہی تھیں۔ اور میں تمہیں سامنے مرر میں دیکھ رہا تھا۔ اور تب تمہاری آنکھوں میں پگھلتا احساس بن کہے پہلی نگاہ میں مجھ تک پہنچ چکا تھا۔ اور میرے دل کی دھڑکنوں نے یقیناً" تم تک میرے اندر کی بدلتی لے اور سر پہنچا دیے تھے۔

تب ہی دھڑکنوں کا ایسا تال میل چلا کہ تمہیں مجھ سے لافانی پیار ہو گیا۔ اب آگے تمہیں کیا بتاؤں؟ اگلی کہانی سے تم واقف ہو۔ کیونکہ آگے جو بھی ہوا تمہاری کوششوں' سچی لگن یا سچی محبت کی وجہ سے ہوا تھا۔

لیکن تب بھی کچھ چیزیں بہت مسنگ تھیں۔ کیا کیا؟

سب سے پہلے تو ذہن اس اچانک پوری گیم کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ کیسے؟ کس طرح؟ اور کیونکر یہ ممکن ہوا؟ میرا تمہارے گھر جا کر تمہیں ہراساں کرنا بہانہ بن گیا تھا تم اس صورت حال کو سہہ نہ سکیں اور ہسپتال پہنچ گئیں۔ باقی کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ ہمارا نکاح کیونکر ممکن ہوا؟

اس حقیقت سے تم بھی ناواقف تھیں اور میں بھی۔

ابو بھی شاید ہمیں کبھی نہ بتاتے.... لیکن کل رات نہیں بلکہ تمہاری برتھ ڈے والی رات ہی اچانک شازمہ آنٹی کی کال آگئی تھی۔ وہ پوچھ رہی تھیں کہ وقاص گفٹ اور کارڈ دے گیا۔ اور تب امی نے آنٹی کو اس وقت کی ساری بھیانک سچویشن کا لفظ لفظ سنا دیا۔ پھر آنٹی پہ کیا گزری؟ لفظوں میں بتانا ممکن نہیں.... انہوں نے میری جو دھلائی کی وہ ایک طرف' پھر میرے ہی مجبور کرنے پہ وہ فوراً" پاکستان آگئیں۔

اور تب آنٹی نے ہمارے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر کچھ انکشاف کیے تھے جن کا متن کچھ یوں تھا۔

"میں ماہ رو کی اسٹیپ مدر ہوں۔ لوگ کہتے ہی ہوں گے زبان کی کچھ تیز ہوں۔ لیکن دل کی بری نہیں۔ میں نے ماہ رو کا کبھی برا نہیں سوچا۔ اسے اپنی بیٹی ہی سمجھا۔ اور جب اس نے اپنا حال دل مجھ سے شیئر کیا تو میں نے اس سے پرامس کر لیا۔ بعد میں مجھے پتا چلا... ماہ رو یک طرفہ محبت کا شکار ہے۔ لیکن پھر کیا ہوا؟ مجھے ماہ رو کے پیار تک پہنچنے کے لیے کچھ تو کرنا تھا۔ تب میں نے فریحہ سے بات بھی کی۔ عون کے بارے میں پوچھا لیکن اس نے مجھے نہیں بتایا عون کی اس سے شادی ہو رہی ہے۔ ہم قطعاً" انجان تھے۔ بعد میں عون کا ہمارے گھر آ کر ماہ رو کو ڈی گریڈ کرنا.... ماہ رو کا ہوسپٹلائزڈ ہونا۔ سب کچھ بہت تکلیف دہ تھا۔ مجھے تب بہت غصہ آیا۔ اور پھر میں رحمان پلازہ پہنچ گئی۔ وہاں میں نے بہت تماشا لگایا۔ غصہ کیا بے عزتی کی۔ ہنگامہ کیا۔ عون پہ غصے کی شدت میں الزامات لگائے۔ اور پھر یوں ہوا کہ بھائی صاحب میری دھمکیوں پہ سرینڈر کر کے میرے ساتھ ہی ماہ رو کو دیکھنے ہسپتال پہنچ گئے۔ تب ماہ رو کی حالت دیکھ کر اور میرے رونے دھونے واویلا کرنے کے بعد انہوں نے مجھ سے ایک گھنٹے کا وقت مانگا۔ تنہائی میں بہت دیر سوچتے رہے۔ پھر فون کر کے سب کو اکٹھا کر لیا۔ اور یوں نکاح ہو گیا۔

بھائی صاحب نے اپنی بے عزتی' رسوائی اور ذلت کے خوف سے یہ قدم اگر اٹھایا بھی تھا۔ پھر بھی نبھا دیا۔ ہماری ماہ رو کو کبھی بھی جتایا نہیں۔ اسے دکھ نہیں دیا۔ خاندانی شرافت اور نجابت اسی کو کہتے تھے اور شاید اسی لیے سرفراز اپنی بیٹی کو مڈل فیملی میں دینا چاہتے تھے۔ کیونکہ وہاں قدر بھی ہوتی ہے اور قدردان بھی.... بعد میں فریحہ والا معاملہ پتا چلا تو ضمیر نے خاصا اپ سیٹ رکھا تھا۔ لیکن یقین مانیے ہم انجان تھے۔ قطعی انجان .... ورنہ ایسا کبھی نہ ہوتا.... اور اب میں پچھلی ہر چیز کے لیے معذرت کرنے آئی ہوں۔ میں نے ماہ رو کے لیے اچھا کرنے کی کوشش میں اپنا ہلکا سا کردار ادا کیا تھا اور اپنی سمجھ کے مطابق کوشش کی۔ غلط یا صحیح.... اس کا مجھے پتا نہیں تھا.... اور اس طرح میرے ذہن کی بھی ہر گرہ کھلتی چلی گئی تھی۔ مجھے تمہاری محبت پہ یقین بھی

تھا اور میرا ایمان بھی۔۔۔ لیکن فریحہ والا گلٹ یا ابو کی طرف سے ملنے والے طعنے' ذلت ہمیشہ میرے ساتھ رہے۔ لوگوں کی تو مجھے کبھی پروا نہیں رہی تھی۔ جو مرضی بولتے رہیں۔

نہ میں کٹھور تھا نہ سنگ دل۔ نہ بشری تقاضوں سے مبرا۔ تمہاری محبت' التفات' میری خاطر خود کو بدلنا اور میرے گھر والوں سے گھلنا ملنا مجھے ہر چیز اپنی طرف کھینچتی تھی لیکن وہی فریحہ بیچ میں۔۔۔ ایک گلٹ کی طرح۔۔۔ قصہ مختصر جو کچھ بھی فریحہ نے کیا۔ تم کو ڈی گریڈ کرتی رہی۔ ٹارچر کرتی رہی۔۔۔ تم پر الزامات لگائے اور مجھے بھڑکایا اور بلاوجہ اپنا انتقام پورا کرتی رہی۔۔۔ کل رات اس نے سارے اعترافات کیے اور مجھ سے معافی بھی مانگی۔ لیکن میں نے اسے بہانگ دہل کہہ دیا ہے اگر ماہ رو معاف کرے گی تو میں معاف کروں گا۔ ورنہ ہرگز نہیں اور اب میں خود بھی تم سے اپنے ہر برے رویے کی معافی مانگتا ہوں۔ کیا تم مجھے معاف کرو گی؟" عون نے اس کے گھٹنوں پہ دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈال کر منت بھرے لہجے میں کہا تو ماہ رو جو ایک ٹرانس میں اسے سن رہی تھی ایک دم چونک سی گئی تھی۔ پھر جیسے اپنے حواسوں میں آگئی۔ گو کہ دل کی حالت بہت مختلف تھی لیکن اس ستم گر کو کچھ سزا تو دینا چاہیے تھی۔ سزا تو کچھ بنتی ہی تھی۔ جتنا اس نے رلایا تھا۔ تھوڑا خود بھی تڑپتا۔

"کیا کان پکڑ لوں ماہ رو!" عون نے پھر سے منت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ماہ رو کی خاموشی اسے ہولا رہی تھی۔

"پکڑ لو۔۔۔" بالآخر ماہ رو نے ہونٹوں کے قفل کھول ہی دیے تھے اور ساتھ دل کے بھی۔ وہ آگیا تھا۔ اتنا ہی کافی تھا۔ اس کی بدگمانیاں دور ہو گئی تھیں۔ بس یہی کافی اور ضروری تھا۔ باقی ہر بات' ہر دلیل ہر وضاحت بے معنی تھی۔ وہ نہ بھی وضاحتیں دیتا تب بھی ماہ رو کو شازمہ نے بھی ہر بات بتادی تھی۔ ہر وہ بات جس سے ماہ رو بے خبر تھی۔ جو ہوا تھا ایسے ہی ہونا تھا۔ یوں ہی ہونا تھا۔ ایسے ہی تقدیر میں لکھا تھا۔

ان دونوں نے ایک دوسرے سے ایسے ہی ملنا تھا۔ بیچ میں جو بھی موڑ' تلخیاں' رکاوٹیں آئی تھیں انہوں نے آنا ہی تھا۔ تو پھر وضاحتیں کیسی؟ بدگمانیاں کیسی؟ رنجشیں کیسی؟ ناراضیاں کیسی؟

اور اب وہ ماہ رو کے کان پکڑ کر معافی مانگ رہا تھا۔ اور ماہ رو جیسے چیخ پڑی تھی اور اس چیخ میں بے ساختگی تھی۔

"بدھو! میرے نہیں اپنے پکڑو۔" اس نے اپنا سر پیٹ کر کہا۔

"کیوں؟ میرے اور تمہارے کوئی دو ہیں۔۔۔ ہماری سب چیزیں اکٹھی ہیں' سانجھی ہیں۔۔۔ میرے کان تمہارے کان۔" وہ معصومیت سے بولتا جان بوجھ کر ماہ رو کو چھیڑ رہا تھا۔ ستا رہا تھا۔ کیونکہ وہ جان گیا تھا بدگمانی کے بادل چھٹ گئے تھے۔

"اب بتاؤ کرو گی معاف!" عون نے اس کے کان ذرا زور سے دبائے تھے۔ ماہ رو تکلیف سے کرلائی تھی۔

"کیا زبردستی معافی لو گے؟" اس نے تنک کر پوچھا۔ اور یہ تنتناہٹ صاف مصنوعی لگتی تھی۔

"زبردستی کرنے والوں کے ساتھ زبردستی کی جاتی ہے۔" وہ مسکرا کر بولا تھا۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا لیے.... ماہ رو کے عین سامنے.... ایک یقین کے ساتھ۔ ایک کامل ایقان کے ساتھ۔ گویا اس کا دل کہتا تھا۔ ماہ رو اس کے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو نہیں جھٹکے گی۔ جس طرح اس نے ماہ رو کو دھتکارا تھا وہ کبھی بھی اسے نہیں دھتکارے گی۔

"آؤ کہ پچھلے ہر غم 'کرب اور بے ترتیب چیزوں کو بھلا کر نئی زندگی کا آغاز کریں۔" اس نے روشن چمکتی آنکھوں سے ماہ رو کی طرف اسی یقین کامل سے دیکھا تھا جس کی طاقت عون عباس کو بتا رہی تھی کہ جیت ہمیشہ خالص جذبوں کی ہوتی ہے اور محبت ہر صورت میں اپنا آپ منوا لیتی ہے۔

وہ محبت جو رحمان پلازہ میں ایک نگاہ بے اختیارانہ سے شروع ہوئی تھی بالاخر ہزار ڈگمگاہٹوں کے بعد کاملیت کی سرحدوں کو چھونے لگی۔ یقین کی انتہاؤں سے ہوتی ہوئی اعتماد اور اعتبار کے اونچے میناروں پہ ہمیشہ کے لیے جلوہ گر ہو گئی تھی۔ ماہ رو نے اس کی چمکتی آنکھوں کے دیوؤں کو والہی نظروں سے دیکھا اور عون عباس کے دونوں بڑھے ہوئے ہاتھوں کو تھام کر اس کے ہمراہ سبح سبح چلتی نیچے جا رہی تھی۔ وہاں.... اس جگہ 'اس نگر 'اس محبتوں کی بستی میں جہاں کچھ لوگ بڑی شدت کے ساتھ ماہ رو کے منتظر تھے.... اور اس کی راہوں میں آنکھیں بچھائے بیٹھے تھے۔

ماہ رو نے ایک روشن دن کو خوش آمدید کیا.... اور عون کے ہمراہ ایک ایسی راہ گزر پہ چلنے لگی تھی جس میں یقیناً" آگے بھی کچھ گنجلک موڑ بھی تھے 'کچھ رکاوٹیں بھی 'کچھ رنجشیں بھی۔ کچھ ناراضیاں.... کبھی کبھی کی لڑائیاں بھی۔ لیکن ان سب میں محبت اور اعتبار روشن مینار کی طرح چمکتی راہوں کو منور کرتے رہیں گے۔ تاکہ غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کے غبار اسے آلودہ نہ کردیں۔



اور پھر ایک خوشگوار زندگی کی شروعات نے ماہ رو سرفراز کو نہ صرف سرفراز کیا تھا بلکہ سرخرو بھی کر دیا تھا۔ رحمان منزل میں اب بھی اس کے نام کا طوطی بولتا تھا۔ عون کے امی ابو سے لے کر بھابھیوں تک ہر کوئی ماہ رو کے نام کی مالا جپتا۔ کچھ وقت گزرا تو فریحہ کی امی 'ابا تک نے اپنا دل صاف کر لیا۔ جب بہت سی تلخ حقیقتیں ان پر آشکار ہوئی تو وہ اپنی ہی نگاہ میں شرمندہ ہو گئے تھے۔ ان کی عقل مند ذہین بیٹی نے انہیں پشیمانی کی ہر انتہا تک پہنچایا تھا۔

سب سے بڑی بات فریحہ نے ماہ رو کے واپس آجانے کے بعد اسی بڑے ہال میں سب کے درمیان اس سے معافی مانگ کر اعلا ظرفی کی نہیں 'وسیع القلبی اور صاف دلی کا ثبوت پیش کیا تھا۔

فریحہ کی معافی نے باقی سب کے دلوں کو بھی صاف کر دیا تھا کیونکہ ماہ رو نے اعلا ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے فریحہ کو معاف کر دیا تھا۔ اور فریحہ فرقان کو اس تلخ ترین "تجربے" سے کچھ سمجھ میں آتا یا نہ آتا۔ لیکن ایک بات بہت اچھی طرح سے سمجھ آگئی تھی۔ کہ حسن اور ذہانت کے مقابلے میں جیت نہ حسن کی ہوتی ہے نہ اعلا پائے کے ذہین 'شاطر اور پچھاڑ دینے والے دماغ کی.... جیت ہمیشہ خالص اور صاف نیت کی ہوتی ہے۔ بے کھوٹ نیت اور بے کھوٹ دل کی ہوتی ہے۔ ماہ رو سرفراز کو اس کے حسن نے نہیں خالص نیت نے بامراد کیا تھا۔ اور فریحہ کو اس کے ذہین دماغ نے نہیں۔ بدنیتی نے بے مراد رکھا تھا۔